جلد دوم

بَیاں اپنا

پروفیسر علیم اللہ حالیؔ

مرتبین

ڈاکٹر عبدالمنانؔ ڈاکٹر محمد عاشق خان

بَیاں اپنا

(جلد دوم)

آواز جرم ہے تو خموشی سے کام لوں
کچھ یوں بھی اہل شہر سے میں انتقام لوں

جدا کیا تو بہت ہی ہنسی خوشی اس نے
بدل دیا ہے اب انداز بے رخی اس نے

پروفیسر علیم اللہ حالیؔ

بیاں اپنا

(جلد دوم)

مصنف

پروفیسر علیم اللہ حالیؔ

مرتبین

ڈاکٹر عبدالمنانؔ ڈاکٹر محمد عاشق خان

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

BAYAN APNA

by: Alimullah Hali

Compiled by

Dr.Abdul Mannan & Dr.Md Ashique Khan

Year of Edition 2017
ISBN 978-93-86486-77-6

Price Rs. 500/-

نام کتاب : بَیاں اپنا (جلد دوم)
مصنف : پروفیسر علیم اللہ حالیؔ
مرتبین : ڈاکٹر عبدالمنان و ڈاکٹر محمد عاشق خان
9931133356, 9504276736
زیرِ نگرانی : ڈاکٹر زین رامش
سن اشاعت : ۲۰۱۷ء
قیمت : ۵۰۰ روپے
تعداد : ۵۰۰
کمپوزنگ : محمد رضوان اللہ، ٹیچر 9835757228
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کے پتے

☆ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴ (Mob.9304888739)
☆ عثمانیہ بک ڈپو، 125 رابندر سرانی اسٹریٹ، کولکاتہ۔700073
☆ تاج بک ڈپو، اقرا کمپلیکس دکان نمبر A۔11 مین روڈ، رانچی، جھارکھنڈ

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

☆ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْن ☆

(اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

ہمارے جداعلیٰ ☆ شیخ جہاں گیر میاں (۱۶۶۷۔ ۱۷۲۰) سمبت

اِسّم میاں ابن شیخ جہاں گیر میاں (متوفی ۱۷۹۹ سمبت)

جانوؔ میاں ابن اِسّم میاں (متوفی ۱۸۸۸ سمبت)

بلاکی میاں ابن جانوؔ میاں (متوفی ۱۹۵۳ سمبت)

دسّن میاں ابن جانوؔ میاں، نکھید میاں ابن دسّن میاں اور پیر علی میاں ابن دسّن میاں

شیخ دِل جان میاں ابن دسّن میاں (متوفی ۲۹/اپریل ۱۹۴۱ء مطابق یکم ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ)

علی جان میاں ابن دسن میاں اور جیروا بوڑھی بنت دسن میاں

محمد مقبول حسین ابن شیخ دِل جان میاں (متوفی ۱۱/اپریل ۱۹۸۰ء بروز جمعہ)

عبدالرحمٰن ابن شیخ دِل جان میاں (متوفی ۸ فروری ۱۹۸۵ء بروز جمعہ)

محمد عثمان علی ابن شیخ دِل جان میاں (متوفی ۷ مئی ۱۹۸۷ء بروز جمعرات ۱۰ رمضان)

شبیرن خاتون، حسینہ خاتون، سکینہ خاتون، سفینہ خاتون بنت شیخ دل جان میاں

مدینہ خاتون بنت شیخ دِل جان میاں (متوفی: ۲۳ نومبر ۱۹۸۷ء بروز سوموار)

انتساب انہیں بزرگوں کے نام

جنہوں نے قوم کو سچی محبت، لگن، محنت اور دانشمندی سے اچھے مسلم معاشرہ کی امارت کھڑی کی جو آج تک ''تریانی محال'' کی شکل میں موجود ہے۔

ترتیب

☆ کاش کہ حق ادا ہوا ہوتا.....زین رامش ۱۳
☆ عرض مرتب مرتبین ۲۲
۱۔ ڈاکٹر عمران مشتاق ۲۴
۲۔ تسنیم عابدی ۲۷
۳۔ اشہر ہاشمی ۳۰
۴۔ بلقیس ظفیر الحسن ۳۴
۵۔ قیصر الجعفری ۳۷
۶۔ اسیم کاویانی ۴۱
۷۔ اظہار خضر ۴۳
۸۔ ڈاکٹر آفتاب رضوی ۴۷
۹۔ فرد الحسن ۵۰
۱۰۔ خواجہ جاوید اختر ۵۵
۱۱۔ ظفر گورکھپوری ۵۹
۱۲۔ محمد یعقوب اسلم ۶۲
۱۳۔ صادقہ نواب سحر ۶۵

۱۴۔ سید احمد قادری ۶۸

۱۵۔ منیر سیفی ۷۰

۱۶۔ سید احمد شمیم ۷۳

۱۷۔ پروفیسر عظیم الرحمٰن ۷۶

۱۸۔ عشرت بیتاب ۷۹

۱۹۔ متین عمادی ۸۲

۲۰۔ عطا عابدی ۸۷

۲۱۔ اعجاز مانپوری ۹۱

۲۲۔ مبین صدیقی ۹۴

۲۳۔ حشمت کمال پاشا ۹۸

۲۴۔ مسعود شمس ۱۰۰

۲۵۔ رفیق ہارون ۱۰۴

۲۶۔ نزہت طارق ظہیری ۱۰۸

۲۷۔ نجمہ محمود ۱۱۱

۲۸۔ ڈاکٹر اشرف جہاں ۱۱۴

۲۹۔ پریم کرن ۱۱۸

۳۰۔ ابھئے کمار بیباک ۱۲۲

۳۱۔ خالد جاوید ۱۲۷

۳۲۔ وقارؔ قادری ۱۳۱

۳۳۔ مظفر عالم ضیاؔ عظیم آبادی ۱۳۵

۳۴۔ علیم الدین علیمؔ ۱۳۹

۳۵۔ پروفیسر شاہ غلام سلطان ۱۴۱

۳۶۔ صباؔ نقوی ۱۴۳

۳۷۔ فریدہ عالمؔ ۱۴۶

۳۸۔ مرغوب اثرؔ فاطمی ۱۴۹

۳۹۔ کرشن بیتابؔ ۱۵۲

۴۰۔ نورالسلام ندوی ۱۵۵

۴۱۔ رخسانہ صدیقی ۱۵۸

۴۲۔ مسرت افزا روحی ۱۶۱

۴۳۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف ۱۶۵

۴۴۔ نازؔ قادری ۱۶۸

۴۵۔ پروفیسر راحت حسین بزمیؔ ۱۷۲

۴۶۔ معصوم شرقی ۱۷۹

۴۷۔ اویناشؔ امن ۱۸۴

۴۸۔ افسانہ خاتون ۱۸۶

۴۹۔ ایم نصراللہ نصرؔ ۱۸۸

۵۰۔ شرجیل احمد خاں ۱۹۱
۵۱۔ پروین شیر ۱۹۳
۵۲۔ احمد الیاس ۱۹۷
۵۳۔ کے ایل نارنگ ساقی ۲۰۱
۵۴۔ پروفیسر خالد محمود ۲۰۳
۵۵۔ ظفر انصاری ظفر ۲۰۷
۵۶۔ علیم صبا نویدی ۲۱۰
۵۷۔ فراغ روہوی ۲۱۲
۵۸۔ کہکشاں توحید ۲۱۵
۵۹۔ ریحانہ نواب ۲۲۲
۶۰۔ افتخار راغب ۲۲۶
۶۱۔ ضررو صفی ۲۳۰
۶۲۔ انور شمیم ۲۳۴
۶۳۔ ندا فاضلی ۲۴۱
۶۴۔ پروین شیر ۲۵۱
۶۵۔ اعجاز صدیقی ۲۵۶
۶۶۔ خالدہ خاتون ۲۶۰
۶۷۔ پرویز شاہدی ۲۶۲

۶۸۔ پروفیسر عبدالقادر فاروقی ۲۶۶

۶۹۔ حیرت فرخ آبادی ۲۷۰

۷۰۔ جسپال کور کی تخلیق کاری ۲۷۳

۷۱۔ ظہیر انور ۲۷۵

۷۲۔ فردالحسن ۲۷۷

۷۳۔ عظیم صدیقی ۲۷۹

۷۴۔ ڈاکٹر خالدہ خاتون ۲۸۲

۷۵۔ معراج احمد معراج ۲۸۴

۷۶۔ کہکشاں توحید ۲۸۷

۷۷۔ ڈاکٹر احسان اللہ دانش ۲۸۹

۷۸۔ طارق متین ۲۹۱

کاش کہ حق ادا ہوا ہوتا......

ڈاکٹر زین رامشؔ

شفقت، محبت، رواداری، وقار، تمکنت، شرافت، بردباری، بے نیازی اور ان جیسے بہت سارے الفاظ کے معانی ومفاہیم سے متصف شخصیات کا بہت معیاری اور بہت مختصر سا انتخاب بھی اگر سامنے آئے تو حلقۂ علم وادب سے متعلق ایک نام پروفیسر علیم اللہ حالیؔ کا ضرور ہوگا۔ ان کی علمی وادبی خدمات کا دایرہ وسیع اور لامحدود ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ یہ خدمات ایک دو نہیں بلکہ پچاس سے زیادہ سالوں پر محیط ہیں۔ شاعری کی مختلف اصناف سے لے کر تنقید، تحقیق، تبصرہ، تاثرات، سفر نامہ ادبی صحافت، ان سب پر انہیں دسترس حاصل رہی ہے۔ جن کا تجزیہ، اعتراف اور احتساب ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ میں نہ اس کا اہل ہوں اور نہ ہی شاید مجھ سے یہ جرأت ممکن ہے کہ میں پروفیسر علیم اللہ حالیؔ کی شخصیت یا ان کی علمی وادبی فتوحات کے تعلق سے کوئی تاثر قایم کرسکوں۔ مجھے باضابطہ طور پر حالیؔ صاحب کی نصابی شاگردی کا شرف حاصل رہا ہے، اور میں نے ان سے کلاس کے اندر اور باہر بہت کچھ سیکھا ہے۔ ۱۹۸۱ء کے آس پاس کا دور تھا ایس پی جین کالج سہسرام سے انٹر کرنے کے بعد گریجویشن کے لئے جب میں نے گیا کالج گیا میں (برائے اُردو آنرز) داخلہ لیا تو حالیؔ صاحب وہاں شعبۂ اُردو کے صدر تھے۔ ان سے یہیں میری پہلی ملاقات ہوئی۔ ان کی شخصیت غیر متعارف نہیں تھی۔ میں رسایل خصوصاً ماہنامہ ''سہیل'' گیا میں ان کی نثری تحریریں اور شاعری پڑھتا رہا تھا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''سفر جلتے دنوں کا'' شایع بھی ہو چکا تھا اور

مقبول بھی۔ میں نے جستہ جستہ اسے پڑھا بھی تھا اور متاثر بھی ہوا تھا۔ ان دنوں میں خود بھی جلتے دنوں کے سفر کے تجربے اور مشاہدے سے گزر رہا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ میں نے جلتے دنوں کے اس سفر کی روداد اور اس کے اظہار کو اپنے تجزیاتی مطالعہ کا موضوع بنایا اور ایک تفصیلی مضمون لکھنے کی جسارت کی۔ میں پورے یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرے خیال میں اس کی دو وجہیں رہی ہونگی ایک تو یہ کہ گیا کی ادبی نشستوں میں ہونے والی پذیرائی نے بڑا حوصلہ عطا کیا تھا اور دوسرے ممکن ہے کوئی نفسیاتی مصلحت پسندی بھی رہی ہو کیونکہ کتاب صدر شعبہ کی تھی۔ مضمون مکمل ہونے کے بعد حالی صاحب کی واقفیت اور اجازت کے بغیر میں نے وہ مضمون اشاعت کے لئے ''سہیل'' کے مدیر جناب مسعود منظر کے حوالے کیا باوجودیکہ انہوں نے مضمون کو بلا تاخیر ''سہیل'' میں شایع کرنے کا وعدہ کیا، وہ مضمون حسب توقع شایع نہیں ہوا۔ ''سہیل'' کے دو شماروں کی اشاعت کے بعد میں نے مسعود منظر صاحب سے مضمون کی عدم اشاعت کا سبب دریافت کیا تو بڑا ہی حوصلہ افزاء معاملہ سامنے آیا۔ انہوں نے بتایا کہ آپ کا مضمون ''سہیل'' کے علیم اللہ حالی نمبر کے لئے محفوظ کیا گیا ہے، دراصل آپ کا مضمون ''سہیل'' کی تازہ اشاعت میں شامل تھا لیکن اچانک خیال آیا کہ کیوں نہیں ایک علیم اللہ حالی نمبر ہی نکال لیا جائے۔ معاملہ حق بہ حقدار رسید کا تھا میں نے تحسین آمیز جملے ادا کئے۔ ایک طویل عرصے کے بعد ہی لیکن وہ نمبر شایع ہوا۔ نمبر میں مضمون کی شمولیت اور اشاعت سے زیادہ بڑی بات میرے لئے یہ تھی کہ میرا مضمون علیم اللہ حالی نمبر کی اشاعت کا محرک بنا۔

اگر یہ کہا جائے کہ پروفیسر علیم اللہ حالی کی شخصیت ہمیشہ ہی اس روشن چراغ کی رہی ہے جس کی روشنی یکساں طور پر اپنے اردگرد پھیلتی ہے اور بلا تخصیص فیضیاب کرتی ہے تو شاید غلط نہ ہو۔ ان کی شخصیت کی ایک اور طلسماتی کیفیت کی طرف بھی اشارہ ضروری محسوس ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پروفیسر علیم اللہ حالی سے قربت رکھنے والا ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ حالی صاحب اسے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، اس سے زیادہ محبت کرتے ہیں، اس سے زیادہ شفقت اور خلوص کا رویہ روا رکھتے ہیں اور اس پر زیادہ مہربان ہیں۔ ظاہر ہے یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں ہوسکتی۔ یہ سارا معاملہ ان کے اندازِ تکلم اور ان کے طرزِ اظہار شفقت و محبت سے ہی متعلق کہا

جائے گا یہ احساس ہمیشہ مجھے بھی رہا اور آج بھی ہے۔ حالیؔ صاحب گیا کالج گیا میں میرے استاد رہے۔ ایم اے کے دوران شعبۂ اُردو مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا میں میرے استاد رہے اور پھر میں نے اپنا تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی بھی انہیں کی نگرانی میں مکمل کیا۔ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ 99 فی صد مقالہ نگار اور نگراں کسی نہ کسی طور اس مدت میں جو کم از کم ۴ سے ۵ سال پر محیط ہوتی ہے ایک دوسرے کے شاکی رہتے ہیں لیکن میرے اور حالیؔ صاحب کے درمیان پی ایچ ڈی رجسٹریشن سے لے کر تھیسس جمع یعنی داخلِ دفتر کئے جانے تک ایسا کچھ نہیں ہوا' دونوں ایک دوسرے سے مطمئن رہے، نہ میں نے ان سے کبھی کچھ پوچھا نہ انہوں نے مجھ سے۔ میں نے موضوع منتخب کیا انہوں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''اچھا ہے''۔ میں نے موضوع کا تعارف اور خاکہ تحریر کیا انہیں دکھایا انہوں نے کہا ''جمع کرو''۔ حسبِ ضرورت ان کے دستخط لئے ضابطے کی کاروائی ہوئی میں نے کاغذات جمع کئے اور گیا سے پٹنہ منتقل ہو گیا۔ پٹنہ میں روزی روٹی کی فکر کے درمیان الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی مصروفیات نے وقت کے دبے پاؤں گزر جانے کا احساس ہی نہیں ہونے دیا، اور پانچ سال کی مدت کس طرح گزر گئی پتہ ہی نہیں چلا۔ حالانکہ اس دوران کوئی ایسا ہفتہ نہیں گزرا جب حالیؔ صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا نہ انہوں نے پی ایچ ڈی کے تعلق سے مجھ سے کچھ پوچھا اور نہ میں نے ان سے کچھ کہا۔ پھر اچانک ایک دن جب میں تھیسس کا مواد لے کر ان کے پاس پہنچا تو وہ مسکرائے، کہا ''ہو گیا'' میں نے کہا ''جی''۔ انہوں نے سرسری طور پر مواد کو دیکھا اور رکھ لیا۔ ہفتہ گزر جانے پر میں پھر حاضر ہوا انہوں نے کاغذات لوٹائے اور اس بات پر زور دیا کہ جلدی سے جمع کر دو۔ اور اس طرح یہ مرحلہ طے پایا۔ اس واقعے کو تحریر کرنے کا میرا مقصد یہ تھا کہ حالیؔ صاحب ہمیشہ اور ہر معاملے میں عام اساتذہ کے یہاں موجود منفی فکر اور منفی رویّے سے مبرّا رہے۔ وہ زندگی کے معاملات میں پتھر کا نشان چھوڑنے کے عادی رہے ہیں تا کہ کوئی بھی آندھی اسے اکھاڑ نہ پائے۔

علمی و ادبی ذوق و شوق اور جذبہ وجنوں ناچیز کو وراثت میں ملا جب ادبی شعور بیدار ہوا تو عمِ محترم حضرت نازشؔ سہسرامی استاد شاعر کی حیثیت سے اور والد گرامی آصف سہسرامی

مقبول شاعر کی حیثیت سے سہسرام کی ادبی وشعری نشستوں کی جان نظر آئے، جبکہ حسین الحق بحیثیت افسانہ نگار اور عین تابش بحیثیت صاحب اسلوب جدید شاعر کے اپنا امتیازی مقام بنا چکے تھے۔ لیکن گھر کے باہر جن معدودے چند علمی وادبی شخصیت سے میں نے استفادہ کیا ان میں علیم اللہ حالیؔ کی شخصیت کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ حالیؔ صاحب ان ادبی شخصیات میں ہیں جنہیں نثر و نظم پر یکساں قدرت حاصل رہی۔ ان کے اشعارِ نظم وغزل ہوں یا نثری تحریریں جن میں تحقیق، تنقید، تبصرہ، تاثرات، سفر نامہ، اداریے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ موجود ہے، ہر جگہ ان کا منفرد انداز قایم ودایم نظر آتا ہے یہاں تک کہ کسی بھی علمی وادبی مسئلے یا موضوع پر ان کی گفتگو بھی اہمیت اور اثر انگیزی سے بھر پور مانی جاتی رہی ہے، جس میں سنجیدگی، متانت، احتیاط، اور مادۂ نقد کی بھر پور آمیزش کا احساس بھی ہوتا رہا ہے۔

پیش نظر کتاب ''بیاں اپنا'' دراصل پروفیسر علیم اللہ حالیؔ کی ادارت میں شایع ہونے والے رسالہ ''انتخاب'' (پٹنہ) میں شایع ہونے والی ان تحریروں کا انتخاب ہے جن کا تعلق نئی شایع شدہ کتابوں کے تجزیے یا قلم کاروں کے تعارف یا اعترافِ خدمت سے ہے۔ یہ تحریریں ''انتخاب'' کے ہر شمارے میں تواتر اور تسلسل کے ساتھ شایع ہوتی رہی ہیں، اور یہ سلسلہ ہنوز قایم ہے۔ اس سلسلے میں کتاب کے مرتبین ڈاکٹر عبدالمنانؔ اور ڈاکٹر عاشق خان نے عرض مرتب کے تحت بجا تحریر کیا ہے کہ:

> ''......... پروفیسر علیم اللہ حالیؔ کی یہ تحریریں، تبصرے اور تعارف کی ایک خوب صورت، دلکش اور نہایت مفید سلسلے کی ایک روایت بن گئی ہے۔ ''بیاں اپنا'' کی تحریریں تخلیق کاروں کا تعارف بھی ہیں اور نئی علمی وادبی مطبوعات کا ناقدانہ جائزہ بھی۔ اس کے علاوہ یہ کہ پروفیسر علیم اللہ حالیؔ کی شگفتہ اور غیر رسمی تنقیدی تحریر کی وجہ سے اسے عام مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ ''انتخاب'' کے حلقۂ قارئین میں خاص طور پر یہ تبصراتی اور انتقادی تحریر بے حد پسند کی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ ہنوز قائم ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالیؔ کی تحریر کی مقبولیت تمام شائقین ادب کے نزدیک جدید اُردو تنقید کے باب میں

اہمیت کی حامل ہے۔''

اس کتاب میں جو''بیاں اپنا'' کی جلد دوم ہے کچھ طویل اور کچھ مختصر ملا کر کل ۷۸ تحریریں شامل ہیں ان تحریروں کے ذریعہ جہاں ایک طرف ندؔا فاضلی ، اشہرؔ ہاشمی، بلقیس ظفیر الحسن، قیصر الجعفری، سید احمد شمیم، عظیم الرحمن، متین عمادیؔ، وقار قادری، مظفر عالم ضیاؔ، شرجیل احمد خان، حیرت فرخ آبادی وغیرہ کی شخصیت اور فکروفن پر تاثرات پیش کئے گئے ہیں وہیں دوسری طرف کچھ بالکل نوواردان شعروادب کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے۔ساتھ ہی ساتھ کچھ ویسی شخصیات پر بھی تحریریں موجود ہیں جواب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن جنہوں نے اپنے بڑے ناقابلِ فراموش نقوش چھوڑے ہیں۔ کتاب میں جو تحریریں شامل ہیں ان میں شخصیات کے تعلق سے ان کی یاان کے مرتبے کوملحوظِ نظر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ ترتیب میں رسالہ ''انتخاب'' کی اشاعت جس ترتیب سے ہوئی ہے اور جس شمارے میں جس شخصیت پر تحریر موجود ہے اسی لحاظ سے اسے شامل کیا گیا ہے۔کیا ہی اچھا ہوتا کہ ترتیب میں شخصیات کی بزرگی اور ان کے معیارومرتبے کا خیال رکھا جاتا اور تحریر کے آخر میں شمارے کا حوالہ دے دیا جاتا۔

ابتدائی سطور میں ہی اس بات کا اعتراف کر چکا ہوں کہ میں نہ اس بات کا اہل ہوں اور نہ ہی شاید مجھ سے یہ جرأت ممکن ہے کہ میں پروفیسر علیم اللہ حالیؔ کی شخصیت یا ان کی علمی و ادبی فتوحات کے تعلق سے کوئی تاثر قایم کرسکوں۔لہٰذا ان تحریروں کے تعلق سے بھی کوئی گفتگو ممکن نہیں پھر بھی اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ ان تاثراتی تحریروں میں بھی حالیؔ صاحب کا مخصوص اندازِ فکر، شگفتگی بیانی اور ندرت اظہار پوری طرح موجود ہے۔بات کہنے کا سلیقہ اور اس سلیقے کے حصول کی ساری ہنرمندی انہیں حاصل ہے۔یہ ہنرمندی کبھی بہت اہم شخصیات کی خدمتِ علم وادب اور جذبۂ خودسپردگی کے اعتراف کے طور پر اپنا جلوہ دکھاتی ہے اور کبھی بالکل نوواردان شعروادب کی حوصلہ افزائی کے طور پر۔ زیرتذکرہ کتاب کی پہلی تحریر کا عنوان ہے''ڈاکٹر عمران مشتاق''۔اس تحریر کے ابتدائی جملے دیکھئے:

''ڈاکٹر عمران مشتاق کے شخصی کوایف سے میں واقف نہیں ہوں۔
میری ان سے کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے۔ہاں ایک آدھ بار برطانیہ سے

ٹیلی فون کے ذریعے ان سے بات چیت ہوئی ہے۔"

اور پھر دوسرے ہی لمحے حالیؔ صاحب پورے اعتماد کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتے ہیں:

"ہاں یہ ہے کہ میں نے ان کی کہانیاں پڑھی ہیں۔ان کہانیوں نے ان کی فنکاری اوران کی شخصیت کے نقوش بہت حد تک واضح کردیئے ہیں۔"

حالیؔ صاحب کے یہ جملے نہ صرف زندگی کے تئیں ان کے گہرے تجربات و مشاہدات کا اظہار کرتے ہیں بلکہ ادبی تحریروں کی نبض شناسی کے عمل میں ان کی مہارت کا اشاریہ بھی پیش کرتے ہیں۔کسی فنکار کی کہانی کا مطالعہ اگر قاری یا ناقد پر فنکار کی شخصیت کے نقوش واضح کردیتا ہے تو یہ یقینی طور پر قاری یا ناقد کا کمال ہنرمندی ہی کہلائے گا۔ بہ اعتبار ترتیب اس کتاب میں ۹ اور ۱۰ نمبر کی تحریریں عزیز گرامی فردالحسن اور دوستوں کے دوست خواجہ جاوید اختر سے متعلق ہیں گویا موضوعِ گفتگو فردالحسن کا مجموعہ غزل "بے ترتیب" اور خواجہ جاوید اختر کی غزلوں کا مجموعہ "نیند شرط نہیں" ہے۔فردالحسن قریۂ شعروادب میں نووارد نہیں ہیں کم عمری سے شاعری کررہے ہیں اور طویل مدت سے تنقید لکھ رہے ہیں، ہاں مگر ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ۔اپنے کو شاعری کا ظلِ سبحانی تصور نہیں کرتے بلکہ فقیرانہ شعروادب سے اپنا رشتہ استوار رکھنا چاہتے ہیں نہ کسی گروپ سے وابستہ ہیں نہ کسی ازم سے۔بس ایک مخصوص انداز میں قدرے پوشیدگی، اطمینان اور طمانیت کے ساتھ مہناز غزل کی زلف سنوارنے میں اپنے کو مصروف رکھتے ہیں اوراس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس بات کے لئے پابند عہد ہیں کہ:

آج تک جو بھی بزرگوں سے ملا ہے ہم کو
منتشر ہم وہ اثاثہ نہیں ہونے دیں گے

حالیؔ صاحب نے فردالحسن کے تعلق سے اپنے تاثرات تحریر کرتے ہوئے سچی بات کہی ہے:

"ناسٹلجیا، فردالحسن کے تخلیقی تحرک کا ایک مضبوط وسیلہ ہے اور اہلِ نظر

جانتے ہیں کہ ماضی تخیل، تصور اور انہماک کا ایک بھنڈار ہی نہیں ہوتا بلکہ
حساس ذہن کے لئے ایک پناہ گاہ بھی ہوتا ہے۔ یہ عہد حاضر کے نامساعد
حالات کے لئے Defence Mechanism کا کام بھی کرتا ہے"۔

ناسٹلجیا کو تخلیقی تحرک کا ایک مضبوط وسیلہ قرار دینے یا محسوس کرنے والا کوئی قاری یا ناقد وہی ہوسکتا ہے جو قرۃ العین حیدر کے اس بیان کے تمام تر محرکات سے بھی آشنا ہو کہ "سب سے بڑے مجرم ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے خواب کھو دیئے" اور اس شعر کی کیفیت سے بھی کما حقہٗ واقف ہو کہ:

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

حالی صاحب کی تحریروں خصوصاً نثر میں کیفیتِ مرعوبیت کا احساس کبھی نہیں ہوا انہوں نے ہمیشہ ذاتی محسوسات کو الفاظ کا پیکر عطا کیا اور بغیر کسی ہچکچاہٹ اور طرزِ ایں و آں کے پیش کیا۔ خواجہ جاوید اختر کی غزلوں کا مجموعہ "نیند شرط نہیں" ۲۰۰۹ء کے اواخر یا ۲۰۱۰ء کے اوائل میں شائع ہوا اور جو غالباً ان کا پہلا اور آخری مجموعۂ کلام ہے، اس کا پیش لفظ شمس الرحمن فاروقی کا تحریر کردہ ہے۔ اس مجموعہ غزل پر اپنا تاثر تحریر کرتے ہوئے حالی صاحب لکھتے ہیں:

"بڑا تنقید نگار کسی اوسط درجے کے فنکار کو اپنے تحسینی کلمات سے بڑا
تو نہیں بنا سکتا لیکن اسے ایک اچھا تعارف ضرور عطا کر سکتا ہے......اور جناب
فاروقی کا یہ قیمتی تحفہ خواجہ جاوید اختر کو مل گیا ہے تو بلاشبہ انہیں ناز کرنا چاہئے"۔

یہ چند جملے خواجہ جاوید اختر کے تعلق سے حالی صاحب کے مطمحِ نظر کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں۔ میں اس وقت اس بات کی وضاحت ضروری نہیں سمجھتا کہ واقعتاً خواجہ جاوید کی شاعری کا معیار کیا تھا اور میزان نقد پر ان کی شاعری نشیب و فراز کی کس حد کی متحمل تھی، میرا اشارہ صرف اس جانب ہے کہ حالی صاحب کی تحریریں کیفیت مرعوبیت سے دوچار نہیں ہوتیں۔ ہاں اس بات کا افسوس اور کسک ضرور ہے کہ خواجہ جاوید جیسا الہڑ، البیلا، دوستوں

کا دوست، یاروں کا یار، محفل کو زعفران زار بنا دینے والا، محفلوں اور نشستوں میں اپنی طرزِ ادا، اپنی گفتگو اور اپنے مشفقانہ ومخلصانہ رویوں کی بنیاد پر اپنا تعارف آپ بن جانے والا شخص اور فنکار آج سے ۴، ۵ سال قبل ہی ہمارے درمیان سے رخصت ہوگیا۔خواجہ جاوید اختر کا تعلق بنگال سے تھا اور اس کی پرورش وپرداخت کولکاتا کے نواح میں ہوئی تھی لیکن اس کی شخصیت کی تشکیل میں نہ جانے کون سے تہذیبی عوامل کارفرمارہے تھے کہ جب وہ قریب اور مخاطب ہوتا تو بنگال کا جادو بولنے لگتا تھا۔گزشتہ دنوں کولکاتا سے خواجہ جاوید اختر کی شخصیت اور شاعری پر لکھے گئے مضامین کا ایک مجموعہ شایع ہوا ہے۔جس میں جاوید کی شخصیت اور ان کے فنکارانہ امتیاز کے متعلق گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔لیکن حالیؔ صاحب نے خواجہ جاوید سے متعلق اپنی تحریر کا اختتام بہرحال ان جملوں پر کیا ہے:

> ''جناب شمس الرحمن فاروقی نے مجموعے کے ابتدائی صفحات میں خواجہ جاوید اختر کی شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی غیر مشروط محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔''

حالیؔ صاحب کی کچھ بہت اہم تحریریں ظفر گورکھپوری، قیصر الجعفری، سید احمد شمیم، پروفیسر خالد محمود، فراغ روہوی، ہمایوں اشرف، ریحانہ نواب، انور شمیم، ندا فاضلی، پروین شیر اور پرویز شاہدی سے متعلق اس کتاب میں شامل ہیں جو یقینی طور پر اس بات کی متقاضی ہیں کہ ان پر تفصیل سے گفتگو کی جائے لیکن یہاں پر شاید اس کا موقع نہیں ہے۔ہاں اس بات کا ذکر یقیناً ضروری ہے کہ حالیؔ صاحب کی انتقادی دیانت داری اور غیر مصلحت پسندانہ رویہ اپنی جگہ لیکن حوصلہ افزائی کے سلسلے میں ان کا مخلصانہ مشفقانہ اور نرم تر رویہ اپنی جگہ ہوتا۔وہ جب حوصلہ افزائی کا بیڑا اٹھالیتے ہیں یا مایل بہ رفاقت ہوتے ہیں تو کیسے کیسے رطب ویابس کو کیسے کیسے لعل وجواہر بنا کر پیش کردیں یہ کہنا اور سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔اس کیفیت کی کچھ تحریریں اس کتاب میں بھی شامل ہیں۔انہوں نے ایک سچے اور پکے مسلمان ہی نہیں بلکہ مومن کی طرح ''دل توڑنا بہت گناہ ہے'' کے احساس کے ساتھ دل توڑنے کے عمل سے پوری طرح پرہیز کیا ہے۔بعض ایسے حضرات کی تعریف وتوصیف بھی کی ہے۔جن کے استاد ہی انہیں

’’ناکارہ‘‘ کہتے ہیں۔خاتون کے تئیں ہمدردانہ رویہ انہماک اور توجہ تو خیر فطری عمل ہے لیکن بعض ایسی خاتون جن کے لئے خود اپنے نام سے چھپی ہوئی تحریر کی قرأت متن ممکن نہیں انہیں بھی حالیؔ صاحب نے بڑی خنداں پیشانی کے ساتھ سندِ توصیف عطا کر دی ہے۔یہ سب دراصل حالیؔ صاحب کی صفائی قلب کا معاملہ ہے۔یہ کتاب ’’بیاں اپنا‘‘(جلد دوم) جو ۲۹۴ (دوسو چورانوے) صفحات پر مشتمل ہے یقینی طور پر ادب کے طلبا و طالبات ہی نہیں بلکہ اساتذہ کے لئے بھی ایک تحفۂ نایاب ثابت ہوگی اور ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر دیکھی جائے گی۔اس کتاب کے مرتبین ڈاکٹر عبدالمنان جن کی ایک بہت اہم کتاب ’’جھارکھنڈ میں اُردو شعروادب کا ارتقا‘‘ پہلے بھی شایع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہے اور ڈاکٹر محمد عاشق خان، شعبۂ اُردو جے جے کالج کڈرمہ جن کی کتاب ’’اُردو تنقید کے فروغ میں طاہر تونسوی کی خدمات‘‘ کے علاوہ نصابی نوعیت کی کئی دیگر کتابوں کو دادو تحسین کی نظر سے دیکھا گیا ہے،مبارک باد کے مستحق ہے کہ انہوں نے ایک بڑا کام اس کتاب کی اشاعت کے طور پر انجام دیا ہے، حسنِ ترتیب پر خصوصی توجہ دیئے جانے کے ساتھ ساتھ صحت متن کا پورا پورا خیال رکھنا اپنے آپ میں قابلِ تعریف بھی ہے اور قابلِ مبارک باد بھی۔یہ دونوں حضرات خدمت ادب کے سلسلے میں بے حد سنجیدہ بھی ہیں اور جذبۂ خود سپردگی سے سرشار بھی۔لہٰذا یہ امید کی جانی چاہئے کہ آیندہ بھی سرافرازی کا مرحلہ طے کریں گے اور آیندہ سامنے آنے والے قافلۂ ادب کے لئے ذوق جنوں کا نمونہ پیش کریں گے۔

ڈاکٹر زین رامش

☆☆

عرض مرتب

اُردو کی ادبی دنیا عام طور پر اِس بات سے واقف ہے کہ پروفیسر علیم اللہ حالؔی نے اپنے رسالے ''انتخاب'' میں ادبی کتابوں اور اہل قلم حضرات کے کارناموں کے تعارف کا ایک سلسلہ قائم کیا ہے۔ ''بیاں اپنا'' کے نام سے تقریباً ہر شمارے میں پروفیسر علیم اللہ حالؔی کی یہ تحریریں، تبصرے اور تعارف کی ایک خوبصورت، دلکش اور نہایت مفید سلسلے کی ایک معتبر روایت بن گئی ہے۔ ''بیاں اپنا'' کی تحریریں تخلیق کاروں کا تعارف بھی ہیں اور نئی علمی وادبی مطبوعات کا ناقدانہ جائزہ بھی۔ اِس کے علاوہ یہ کہ پروفیسر علیم اللہ حالؔی کی شگفتہ اور غیر رسمی تنقیدی تحریر کی وجہ سے اسے عام مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ ''انتخاب'' کے حلقہ ٔ قارئین میں خاص طور پر یہ تبصراتی اور انتقادی تحریر بے حد پسند کی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ ہنوز قائم ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالؔی کی تحریر کی مقبولیت تمام شائقین ادب کے نزدیک جدید اُردو تنقید کے باب میں اہمیت کی حامل ہے۔ چنانچہ اِسی اہمیت و مقبولیت کے پیش نظر سب سے پہلے ۲۰۱۱ء میں ڈاکٹر خورشید انورؔ نے پروفیسر علیم اللہ حالؔی کی تحریر ''بیاں اپنا'' کو باقاعدہ کتابی شکل میں شائع کر کے ایک علمی فریضہ انجام دیا تھا۔ ڈاکٹر خورشید انورؔ نے اپنی کتاب ''بیاں اپنا'' میں جو قسطیں شامل کی ہیں وہ ''انتخاب'' کے شمارہ اول سے لے کر شمارہ بیس تک محیط ہے۔ انہوں نے اِس بات کا اعتراف کیا ہے کہ باوجود تلاش بسیار شمارہ گیارہ اور بارہ حاصل نہیں ہو سکا، اس لئے جلد اول میں اِن شماروں کی تحریریں شریک نہیں کی جا سکی ہیں۔

ہم نے پروفیسر علیم اللہ حالؔی کی تحریروں کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اور اِن میں

ادب وتنقید کے متعدد اہم نکات کی روشنی میں ''بیاں اپنا (جلد دوم)'' ترتیب دینے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اِس میں ''انتخاب'' کے وہ دو شمارے [۱۱،اور ۱۲] کی تحریریں بھی شامل کر لی گئی ہیں جو ڈاکٹر خورشید انور کی ''بیاں اپنا (جلد اول)'' میں شریک نہیں ہو پائی تھیں۔ گویا اب یہ کتاب ''انتخاب'' کے شمارے (۱۱) اور (۱۲) کی تحریروں کی شمولیت کے ساتھ ''انتخاب'' کے شمارہ اکیس سے شمارہ تینتیس تک کی اُن تمام تحریروں کا مجموعہ ہے جو پروفیسر علیم اللہ حالیؔ ''بیاں اپنا'' کے نام سے لکھتے رہے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ اہل علم وادب اِن تحریروں کے ادبی وقار وافادیت کے ساتھ ساتھ پروفیسر علیم اللہ حالیؔ کے مخصوص انتقادی اسلوب کے پیش نظر اِس کتاب کو اُردو نقد و بصر کے باب میں نہایت اہم تصور کریں گے اور ہماری اِس کوشش کو بنظر استحسان دیکھیں گے۔ ہمیں اِس سلسلے میں آپ کی رایوں کا انتظار رہے گا۔

مرتبین

☆☆

ڈاکٹر عمران مشتاق

ڈاکٹر عمران مشتاق کے شخصی کوائف سے میں واقف نہیں ہوں۔ میری ان سے کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے۔ ہاں ایک آدھ بار برطانیہ سے ٹیلیفون کے ذریعے ان سے بات چیت ہوئی ہے۔ ہاں یہ ہے کہ میں نے ان کی کہانیاں پڑھی ہیں۔ ان کہانیوں نے ان کی فنکاری اوران کی شخصیت کے نقوش بہت حد تک واضح کردیئے ہیں۔

ڈاکٹر عمران مشتاق عہد حاضر کے ادبی منظرنامے میں شہرت و مقبولیت کے لحاظ سے نمایاں تو نظر نہیں آتے لیکن ان کی کہانیاں پڑھی جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ کئی حیثیتوں سے ان کے امتیاز کا احساس کیا جاسکتا ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ ان کے افسانے عام طور پر خاصے مختصر ہوتے ہیں لیکن یہ اختصار الفاظ و صفحات تک محدود رہتا ہے یعنی یہ کہ وہ اپنی کہانیوں میں ایجاز کا غیر معمولی حُسن پیدا کردیتے ہیں۔ ان کی ایسی کہانیوں میں بیان کی سطح پر تو اختصار ہوتا ہے لیکن افسانہ اپنی اشاریت اور تہہ داری کی وجہ سے قاری کے ذہن میں دور تک سفر کرتا ہے۔ انہوں نے افسانے کو محض وقوعوں کے بیان واظہار تک محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ فنی اور معنوی خوبیوں کی وجہ سے افسانہ بہت دور تک قاری کے ذہن میں سرایت کرجاتا ہے۔ اس تکنیک کو ڈاکٹر عمران مشتاق نے کئی صورتوں میں برتا ہے۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے حقیقت اور مشاہدے کی اوپری سطح بیان کرنے کی بجائے کردار اور واقعے کی نفسیات میں اترنے کی کوشش کی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانے کے اسلوب میں Sharp Edge کی خصوصیت پیدا کی ہے عموماً ان کے افسانے غیر متوقع نتائج پیدا کرتے ہوئے تعجب خیزی

اور حیرت انگیزی کی صورت حال سامنے لے آتے ہیں۔ ناصر عباس نیر نے کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر عمران مشتاق کے اسلوب کا تجزیہ کرتے ہوئے فریم اسٹوری کی بات کہی ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ عمران کی کہانیاں اکہری نہیں ہوتیں۔ اکثر دو کہانیاں متوازی خطوط پر آگے بڑھتی ہیں لیکن آگے چل کر ان میں ایک مخصوص اتحاد کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر عمران مشتاق اپنے اظہار و بیان پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ ان کی نثر میں روانی ہے اس لئے متعدد اقسام کے situation کو وہ بڑی آسانی سے پینٹ کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں کرداروں کے بہترین خاکے ان کی اس دسترس کے ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اظہار و بیان پر مکمل قدرت نے اضافی خصوصیت یہ پیدا کی ہے کہ ان کی تحریر میں انشا پردازی کی شان بھی پیدا ہو گئی ہے کہیں خود کلامی کی خاصیت ہے۔ یہ خود کلامی کہانی کے واقعاتی پھیلاؤ پر اس لئے اثر انداز نہیں ہوتی کہ یہ سراسر ذہنی اور داخلی ہوتی ہے۔ فنکار اسے اپنی تحریر میں تو لاتا ہے لیکن اس خود کلامی کو کہانی کا جز نہیں بناتا۔ عمران کا نیم وضاحتی انداز اظہار بھی اختصاص پیدا کر دیتا ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ ڈاکٹر عمران مشتاق ایجاز کو برتنے کا ہنر جانتے ہیں قاری ان کی کہانی کو مختصر سمجھ کر پڑھتا ہے لیکن ایک طویل طویل مخمصے میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ بالکل وہی صورت حال ہے جو مصحفی کے اس شعر سے مترشح ہوتی ہے۔

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

اس لئے عمران مشتاق کے اختصار کے دھوکے میں نہیں آنا چاہئے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ایک جست میں عہد حاضر ماضی سے جا ملتا ہے یا مستقبل میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ سب ''سوچ'' کا کرشمہ ہے۔ یہی سوچ ہے جو بسا اوقات ان کے یہاں وقوعوں کے مشاہداتی بیان کی بجائے تصوراتی عمل کو تیز تر کر دیتا ہے اور کبھی فنتاسی کی خصوصیت پیدا کرتا ہے اور کبھی قاری کو ایک مفکرانہ انداز سے قریب کرتا ہے، اپنے مختصر افسانے میں گہرے مفکرانہ انداز بیان کو کہانی کا جز بنانے کی جو قدرت ڈاکٹر عمران مشتاق کو حاصل ہے اس نوع کی مثال

بہت کم ملتی ہے۔ایک جگہ کہانی یوں شروع کرتے ہیں:

''دنیا میری نظر میں کسی بڑی جیل سے کم نہیں۔یہاں ہم سب قیدی ہیں۔کوئی حالات کا قیدی ہے تو کوئی خواہشات کا۔کوئی وقت کے دائرے میں بند ہے تو کسی نے ان دیکھی بیڑیاں پہن رکھی ہیں اپنی مرضی سے کسی اسیری سے رہائی ممکن نہیں۔اور جب بالآخر رہائی ملنے لگتی ہے تو بندے کی اپنی خواہشات کے خلاف اور رب کی منشاء کے مطابق روح انسانی پنجرہ خالی کر جاتی ہے۔اور مٹی میں مل جاتی ہے۔کتنی عجیب بات ہے کہ انسان ہر وقت دکھوں تکلیفوں کا واویلا کرتا رہتا ہے....زندگی کو کسی عذاب سے کم نہیں سمجھتا۔اسے ایسا بوجھ جانتا ہے جسے وہ اٹھانے پر مجبور ہے''۔

مندرجہ بالا سطور میں ڈاکٹر عمران مشتاق کے جن امتیازات کا ذکر کیا گیا ہے ان کے ثبوت کے لئے ان کی کہانی ''کمرہ نمبر ۱۳'' پڑھی جاسکتی ہے جہاں طویل واقعے کو اختصار کے ساتھ ڈھالنے کے علاوہ Parallel کہانی کی خوبی ملتی ہے۔کہانی ''اپنا خون'' میں اختصار ''خوابوں کا قیدی'' میں فنتاسی اور ''سبز باغ'' میں تصور آفرینی اور روانی اظہار کہانی ''خاک'' میں ریچرڈ کی چلتی پھرتی تصویر....غرض ہر کہانی کچھ نئی خوبیوں کا اشارہ کرتی ہے۔اُردو کہانی کی موجودہ کائنات میں فی الحال شناخت اور درجہ بندی کے جھمیلوں سے ہٹ کر کم سے کم اتنی بات تو ضرور کہی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر عمران مشتاق کا یہ افسانوی مجموعہ خود ان کی شناخت کا ایک نہایت موثر ذریعہ ہے

(انتخاب۔۱۱صفحہ ۸۰ سن اشاعت ۲۰۰۶ء)

☆☆

تسنیم عابدی

تسنیم عابدی محفل شعر وسخن میں دبے پاؤں آئی ہیں، ان کے تین مجموعہائے کلام کی اشاعت کی مجھے اطلاع ہے۔ ''صحرا، آنکھیں اور تنہائی'' کے بعد ''بصیرت کے چراغ'' اور پھر تازہ مجموعہ کلام ''تماشا'' کے ذریعہ ان کی تخلیقی شخصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ میں نے نہ صرف ان کے دو مجموعوں (صحرا، آنکھیں اور تنہائی' نیز' تماشا') کا بغائر مطالعہ کیا ہے بلکہ پٹنہ میں ذاتی ملاقات اور ادب وشعر سے متعلق قدرے تفصیلی گفتگو کے وسیلے سے انہیں پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ اچھی فنکاری کے لئے پہلی منزل فطری ذوق وصلاحیت ہے۔۔۔ اور تسنیم اس دولت سے مالا مال ہیں۔ شعر وادب کا یہ فطری ذوق انہیں ان کے خانوادے سے بطور وراثت حاصل ہوا ہے۔ خاص طور پر ان کی ذہنی تربیت وپرداخت میں ان کے وراثت ماموں کی عبقری شخصیت کا بڑا دخل رہا ہے۔ اس امر کا اعتراف خود تسنیم نے کھلے دل کے ساتھ کیا ہے۔ ڈاکٹر وراثت شکوہ کشمیری اگرچہ سائنس کے شعبۂ حیاتیات کے اعلیٰ درجے کے محقق رہے ہیں مگر ان کا ادبی ذوق بھی نہایت بالیدہ تھا، آخر چل کر امریکہ کی نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ میں تحقیق کا کام تو انہوں نے اپنے ذمہ رکھ لیا اور شعر وادب کی ذمہ داریاں تسنیم عابدی کو سونپ دیں۔ تسنیم نے اس امانت کو سینے سے لگا لیا ہے۔۔۔ اور متذکرہ بالا تین مجموعے اس امانت کی دیانت دارانہ حفاظت کا ثبوت ہیں۔

''تماشا'' کے ابتدائی صفحات میں مختلف علمائے ادب نے اپنے اچھے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ یہ بات تو ہماری شرافت وتہذیب کا حصہ بن چکی ہے کہ کتاب میں بطور

تقریظ، پیش لفظ یا تعارف وغیرہ جو تحریریں لکھی جاتی ہیں وہ بالعموم تحسینی اور توصیفی ہوتی ہیں۔ اور وہ ایسی نہ ہوں تو پھر مصنف ان تحریروں کو شریک کتاب ہی کیوں بنائے۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ معتبر ناقدین اور ادب کے علمائے حق کبھی غلط بیانی سے کام نہیں لیتے، محض مصنف کو خوش کرنے کے لئے کوئی تحریر نہیں لکھ دیتے کہ اس طرح خود ان کے قلم کے وقار کو صدمہ پہنچتا ہے۔پھر ہم جیسے ادب کے شیدائیوں کی بھی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ کتاب میں شریک تحریروں کا اوسط حاصل کر لے۔مستزاد سے ہٹ کر تحریر کے مرکز پر نظر ڈال لے اور پھر ان کی توثیق متن کے آزاد اور راست مطالعے کے ذریعہ کر لے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے تسنیم عابدی کو ایک خود شناس شاعرہ کہا ہے۔ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ان کا سفر کائنات سے ذات کی طرف ہے۔ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی نے انہیں کرب ذات کے عالم میں دیکھا ہے۔ڈاکٹر عبدالکریم خالد کا خیال ہے کہ وہ آشوب ذات اور آشوب کائنات کے دو چند عذاب جھیل رہی ہیں۔ان تمام آراء میں یہ نکتہ مشترک ہے کہ تسنیم عابدی کی شاعری ان کے نہاں خانۂ دل کی آواز ہے۔یہ مشق و مزاولت، کاوش و ریاضت اور شوق سخن سنجی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک فطری شاعرہ کی طرح وہ دل پر جو گزرتی ہے رقم کر جاتی ہیں لیکن یہ کہتے ہوئے اس بات کا اضافہ ضروری ہے کہ وہ صرف اپنی بپتی نہیں گاتیں بلکہ احساس کی شدت کو فکر کی توانائی بخشنے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔ان کے یہاں جہد خود شناسی کی وہ التہاب آگیں منزل ہے جس میں عرفان ذات سے زیادہ تلاش ذات کا کرب انہیں مضطرب بنائے رکھتا ہے۔عرفان ذات تو انسان کو مطمئن بنا دیتا ہے اور بسا اوقات اسے مستغنی ہی نہیں متکبر بھی بنا دیتا ہے۔تسنیم کو وہ اطمینان و اعتماد حاصل نہیں اور ہونا بھی نہیں چاہئے کہ

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذت طلب

تسنیم عابدی اپنے آپ کو پانے کے لئے سرگرداں ہیں۔یہ سفر استعجاب اور اذیت سے بھرپور ہے، یہاں تحرک تو ہے مگر آسودگی نہیں، اصیل فنکار کے لئے یہ دل مبتلا ایک بڑی

نعمت ہے کہ اسی سے تخلیق کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ تسنیم کو اس پر ناز کرنا چاہئے اور دوسرے بہت سے فن کاروں کو رشک۔

تسنیم کو شکوہ ہے کہ آج کا عہد انسان کو بے حس بنا رہا ہے۔ اسے اتنی فرصت بھی نہیں ملتی کہ اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ دور جدید کی صنعتی ترقی نے انسان سے تلاش ذات کی لذت (کرب آگیں لذت) چھین لی ہے۔ (نظم ''یہ آواز کس کی ہے'' ملاحظہ کیجئے)

مذہب و معتقدات راست اور شفاف موضوعات بننے کی بجائے شعری تخلیقیت کا استعارہ بنتے ہوئے تخلیقی شخصیت کے مرکزے میں داخل ہونے لگیں تو بڑی بات ہے ---------مذہبی شاعری کرنے والے بیشتر لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں اور تب ان کی شاعری Poetry بننے کی بجائے Verse بن جاتی ہے۔ ہیہات ہیہات

تسنیم عابدی نے شاعری کی ہفت اقلیم میں کئی منزلیں کامیابی کے ساتھ طے کی ہیں۔ ابھی انہیں اور آگے جانا ہے۔ بہت آگے۔

(انتخاب۔ ۱۱ صفحہ ۸۲ سن اشاعت ۲۰۰۶ء)

☆☆

اشہر ہاشمی

میں اشہر ہاشمی کے مجموعے "زیاں کدے میں دوپہر" کی منظومات پڑھ کر کرب و انتشار میں مبتلا تھا کہ بالآخران کی غزلوں کے مطالعے کی طرف راغب ہوا۔ مجھے ان کی غزل گوئی اور نظم نگاری کے لہجے اور رویے میں غیر معمولی فرق کا احساس ہوا۔ اس احساس کی تفصیل بعد میں بیان کی جائے گی۔ پہلے ان کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے۔

آنکھوں سے مرے دل میں سمایا ہے جو اشہر
اس شوخ کی سرکار یہاں بھی ہے وہاں بھی

میں جہاں بھی اسے چاہوں مل لوں
وہ کبھی ہاتھ نہ آنے والا

بت جیسی کھڑی ایک دہائی میں اچانک
حرکت سی ہوئی بول پڑی اس کی گلی میں

انکشافِ شہرِ نامعلوم ہر شعر میں
تجربے کی تازہ کاری صورت اشعار تھی

موجود لفٹ بھی تھی مگر سیڑھیاں چڑھا
کچھ لے سکا نہ کام وسیلے سے بے خبر

دشمنوں کے درمیاں میرا محافظ ہے قلم
میں نے ہر تلوار روکی ہے اسی تلوار پر

شب کے سناٹے ہی میں کرتا ہے سچی گفتگو

شہر اپنا دکھ سناتا ہے در و دیوار پر
زندگی کرنا وہ مشکل فن ہے اشہر ہاشمی
جیسے کہ چلنا پڑے بجلی کے ننگے تار پر
ہم چھوٹ گئے راہ میں بچھڑے تو نہیں ہیں
ہے اس سے ابھی ملنے کا امکان سلامت
ہے لطف موسم باراں کا بھیگ جانے میں
یہ کیا کہ پھوار پڑی، چھتریاں نکل آئیں
میں شہر چھوڑ چکا تو ہوئی یہ تبدیلی
کہ میری سمت تری کھڑکیاں نکل آئیں
گھر سے دفتر کا بڑا فاصلہ رکھا تھا مگر
اب تو ہم گھر بھی چلے آتے ہیں دفتر لے کر
ہے گلی تنگ بہت، آؤ قطاروں میں چلیں
کوئی چل سکتا نہیں سب کو برابر لے کر
اجاڑ دشت کھڑی دوپہر، اکیلا میں
غبار سر میں بہت، ابر کوئی سر پہ نہیں
کیسی کشیدہ ساعتیں گزریں کسی کے ساتھ
جب درمیان حرف شکایت نہیں رہا
یا اُٹھا دشت میں دیوانے سے بارِ فرقت
یا ترے شہر میں اک چاہنے والے سے اُٹھا
تو میرے پاس نہیں ہوتا یہ سچ ہے لیکن
تیری آواز پہ ہر صبح میں سوتے سے اٹھا
یہ اُجالوں کی عنایت ہے کہ بندہ اشہر
اپنے سایے پہ گرا، اپنے ہی سایے سے اُٹھا

خواب سا، خوشبوؤں سا، خواہش سا
میرے شانے پہ سر کسی کا ہے
کبھی شاخ گل پر کبھی خاک پر
لہو ایک بے منظری میں رہا

میں نے اشہر ہاشمی کے اتنے سارے اشعار اس لئے نقل کئے ہیں کہ ایک تو یہ بتاؤں کہ ''زیاں کدے میں دوپہر'' کے ان اشعار نے کسی نہ کسی جہت سے مجھے متاثر کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بتاؤں کہ یہ فنکار بنیادی طور پر غزل پر پوری دسترس رکھتا ہے۔اس صنف میں اپنی بہترین تخلیقی جودت کا اظہار کرسکتا ہے۔اور یہ بھی کہ اساسی طور پر اشہر ہاشمی، ہماری شعری روایات کے مستحکم، پائیدار اور خوشگوار روش سے ذہنی مطابقت رکھتے ہیں۔ان اشعار میں جدت کی متعدد شاخیں بھی پھوٹتی ہیں۔یہ اُردو غزل کے امکانات کو وسیع بھی کرتے ہیں۔

اب ایسے فروزاں اور جدت بردوش اشعار کے ساتھ جب میں ان کی منظومات پر غور کرتا ہوں تو یقین نہیں ہوتا کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی فنکار کی لکھی ہوئی ہیں۔میں جس طرح نثر میں شعریت کے داخلے کو نثر کی حرمت کے خلاف تصور کرتا ہوں اسی طرح شاعری میں نثر زدگی اس کے لئے ایک گالی تصور کرتا ہوں۔اشہر ہاشمی کے شوق جدت طرازی نے یہاں انہیں اس عوامی رنگ سے قریب کردیا ہے۔جو رنگ رس سے دور اور سپاٹ پن سے قریب ہے۔یہ بات تو درست ہے کہ شاعری کو اب قدیم اور محدود ارکان و بحور میں مقید نہیں کیا جاسکتا۔اسے کھلا پن چاہئے لیکن کُھلا پن کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ اسے شعری اور صوتی نظام سے برطرف کر کے عام بیانیہ کے کوڑے دان میں ڈال دیا جائے، شاعری کے لئے خواہ وہ کوئی صنف، ہیئت یا پیکر اختیار کرے، فکر، روانیِ اظہار، صوتی خوش آہنگی، جذب درون کا out burst اور تھوڑا سا موسیقانہ اہتمام ضروری ہے--------یہ عوامل نہ ہوں تو پھر شاعری چہ ضرور است۔

اشہر ہاشمی کی کئی نظموں میں فکری عنصر تو ضرور ملتا ہے۔مگر اکثر و بیشتر یہ فکر رنگ و بوئے سخن سے محروم رہ جاتا ہے۔ان کی نظموں کے عنوانات بسا اوقات suggestive

ہوتے ہیں۔ان سے یہ امید بندھتی ہے کہ اچھے فن پارے خلق ہوسکیں گے۔

مگر حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

بایں ہمہ اشہر ہاشمی ان تخلیق کاروں میں ہیں جن سے توقعات قائم کی جاسکتی ہیں۔ خاص طور پر غزل کے باب میں۔

(انتخاب۔۱۲صفحہ ۷۸ سن اشاعت ۲۰۰۶ء)

☆☆

بلقیس ظفیر الحسن

بلقیس ظفیر الحسن شعر وادب کے منظرنامے پر ایک جانا پہچانا نام ہے۔شاعری کے علاوہ وہ نثر کی مختلف صنفوں پر ان کے کارناموں کی ستائش کی گئی ہے۔۱۹۹۶ء میں پہلا شعری مجموعہ ''گیلا ایندھن'' شائع ہوا اور اہل ذوق نے اسے خاصا سراہا۔ان کی ادبی فتوحات کا ایک میدان ڈرامہ بھی ہے۔انہوں نے ''شیشے کے کھلونے'' اور 'بجھی ہوئی کھڑکیوں میں کوئی چراغ' کے نام سے جو ڈرامے مرتب کئے وہ ادبی حلقے میں نہ سہی لیکن اسٹیج کی سطح پر خاصے مقبول ہوئے۔اب ان کا دوسرا شعری مجموعہ 'شعلوں کے درمیاں' شائع ہوا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ نئی تخلیقی فضا میں یہ شاعر ایک گونج پیدا کرے گی۔

بلقیس اُردو ادب کے منظر اور پس منظر سے اچھی طرح آشنا ہیں۔ادب میں مختلف عہد کی تبدیلیوں اور لسانی مدوجزر سے یہ نہ صرف کہ واقف ہیں بلکہ اس میں شریک کار بھی رہی ہیں۔ان کی ذہنی تربیت مستحکم روایات واقدار کے سائے تلے ہوئی ہے اس لئے وہ شعر وادب کے بدلتے ہوئے رموز واسرار کو سمجھتی بھی ہیں اور انہیں اپنے فن میں برت بھی رہی ہیں۔

مجموعہ 'شعلوں کے درمیاں' میں بلقیس کی منظومات اور ان کے غزلیہ اشعار دونوں دامن توجہ کھینچتے ہیں----------اس فرق کے ساتھ کہ ان کی غزلیں بالعموم ان کے ذاتی آلام ومسائل کی ترجمان ہیں اور منظومات انفرادی شخصی حصار سے نکل کر آفاقیت کی طرف مائل پرواز رہتی ہیں۔ان ایک خوبصورت نظم 'ہوا کی مجھ سے کیسی دشمنی ہے' نے مجھے خاصا متاثر کیا ہے۔اس نظم میں فنکار نے زندگی کے چھوٹے مسئلوں سے ایک بڑے مسئلے کے

پیدا ہونے کے سچویشن کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس نظم میں بڑے فطری طور پر ایک نسائی نفسیاتی لہجہ تخلیق کو فنکار سے زیادہ قریب کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

بلقیس ظفیر الحسن کی غزلیں اگر ایک طرف ان کے احساسات کے تموجات کی آئینہ بردار ہیں تو دوسری طرف ان کی نظمیں فکری تیور کی غماز ہیں۔ان کی تخلیقی شخصیت میں افکار ،دانش اور داخلی جذبے کی تثلیث کلیدی رول ادا کرتی ہے۔متعدد مختصر اور اوسط بسط کی نظموں کے علاوہ ان کی دو نظمیں انی کنت من الظالمین اور الرجال قوامون علی النساء اس لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ان میں سیاسی،سماجی اور ثقافتی مسائل کو شعری پیکر عطا کیا گیا ہے۔ اول الذکر نظم عالمی سطح پر ایک مخصوص طبقے کے اجتماعی آلام کی طرف اشارہ کرتی ہے۔اس ضمن میں ایک اہم اور نہایت موثر دعا لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین کا حوالہ دیتے ہوئے نئی قوت حیات کے امکانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔دوسری نظم نسائی تحریک کی ایک احتجاجی آواز پیدا کر رہی ہے اور اس معاشرے پر شدید حملہ کرتی ہے جہاں مرد حاوی سماج عورتوں کا استحصال کرتا ہے۔ان نظموں کے علاوہ دوسری کئی نظموں سے بلقیس کے فکر و نظر کی توانائی کا اندازہ ہوتا ہے۔استحصال،نابرابری،فساد،طاغوتی طاقتوں کی کارکردگی،انسانیت کشی،اقدار کی پامالی اور مستحسن اقدار حیات کی ہمنوائی سے جڑے ہوئے متعدد موضوعات ہیں جو بلقیس کی نظموں کو عصر حاضر کا آئینہ بناتی ہیں۔

بلقیس ظفیر الحسن کی غزلیں اگرچہ بنیادی طور پر ان کی شخصیت کے ذاتی کرب والم کی ترجمان ہیں لیکن ان کی شدت احساس ہر قاری کو یہ گمان دلاتی ہے کہ یہ ان کے مسائل ہیں جو بلقیس نے پیش کئے ہیں۔لہجے کی ندرت اور غزل کے پرانے رنگ میں نئے موضوعات کی چمک قاری کو متاثر کرتی ہے۔مندرجہ ذیل اشعار سے بلقیس کا منفرد لہجہ آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔

ساری راہیں لے جاتی ہیں ایک اندھیری گھاٹی میں
روشنی بس فرلانگ ہی بھر ہے کوئی کہاں تک جاسکتا ہے

جان میں کیسی یہ اک لو سی لگی ہے بلقیس
اپنی آنکھوں میں جلوں روز پگھل کر ٹپکوں
کرنے چلے ہیں لوگ قلم میری انگلیاں
کس طرح اعتراف مرا اے ہنر ہوا
کوئی بھی میری جان بچانے نہیں بڑھا
یوں قتل دیکھنے کو کھڑا شہر بھرا ہوا
جتنا نظر آیا ہے وہ اتنا ہی نہیں تھا
جو سامنے آیا نہیں وہ بھی تو ہوا تھا
وہ قافلہ بہار کا کب کا گزر چکا
خوشبو رُکی تھی وہ بھی ہوا ہو رہی ہے اب
بلقیس ایسی بات کا کس کو یقین آئے
آنکھیں کہیں کچھ اور بتائیں کچھ اور لب
اتنا تباہ جان کو کرتا کبھی نہ تھا
ہے حال کچھ دنوں سے جو دل کا کبھی نہ تھا
ہر پل ہرایک لمحہ تھی دم ساز ایک یاد
فرقت کدے میں غم مرا تنہا کبھی نہ تھا
اب کیا بتاؤں گزری ہے کس رنگ زندگی
رنگ حنا بھی ٹھیک سے چڑھتا کبھی نہ تھا

'شعلوں کے درمیاں' اُردو شاعری کے جدید تر منظرنامے پر اپنے دستخط ثبت کرے گا----- اس کا مجھے یقین ہے۔ (انتخاب۔۱۲ صفحہ ۸۰ سن اشاعت ۲۰۰۶ء)

☆☆
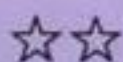
قیصر الجعفری

قیصر الجعفری: جناب قیصر الجعفری ایک نہایت کامیاب تخلیقی زندگی گزار کر ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ہمیں اب ان کی فتوحات کا جائزہ لینا چاہئے۔ سفر کا معتبر جائزہ ختم سفر کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ بسا اوقات فنکار جب تک زندہ رہتا ہے اس کا عصر اس کے فن کی تقدیر و تعین میں منصفی سے کام نہیں لے سکتا۔ ایسی صورت حال میں رایوں کی پیش کش میں بہرحال تجاوزات کا احتمال رہتا ہے۔ نجی مراسم، معاصرانہ چشمک، نظریات کے اختلافات، فنکار کا سماجی مرتبہ، اس کے محدود یا وسیع وسائل وغیرہ جیسے عوامل کے علاوہ خود فن کا تخلیقی تسلسل صحیح اور حتمی نتائج میں مانع نہیں بن جاتا ہے۔

گزشتہ چالیس برسوں کے ادبی و شعری منظر نامے میں قیصر الجعفری نے کون کون سے نقوش ثبت کئے ہیں اور شاعری کے ذخیرے میں موضوعات، مسائل، الفاظ و لغات، تراکیب و اشارات اور لہجہ و اسلوب کا اضافہ کرتے ہوئے زبان و بیان کی کیا خدمت کی ہے۔۔۔ یہ مطالعہ ظاہر ہے کہ ایک فعال منصوبے کا متقاضی ہے چنانچہ اس کام کے لئے قیصر الجعفری فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا ہے اور اسی نے مرحوم کے مجموعہ کلام ''اگر دریا ملا ہوتا'' کی اشاعت کے ساتھ ان کی مجموعی تخلیقی شخصیت کے احاطے کا پروگرام بنایا ہے۔ خدا کرے کہ یہ ادارہ حسب خواہ کام کر سکے۔ اس کی ضرورت یوں بھی ہے کہ قیصر الجعفری نے ہمارے سامنے رنگ حنا، نبوت کے چراغ، سنگ آشنا، دشت بے تمنا، پتھر ہوا میں پھینکے، چراغ حرا، مولسری کا پھول، دیواروں سے مل کر رونا، بستی کتنی دور بسالی، آوارہ ہوا کا جھونکا اور ''اگر

دریا ملا ہوتا' جیسے مجموعوں کی صورت میں شعری اظہار کا ایک Bulk پیش کیا ہے، اس میں غزلیں، نظم کی مختلف ہیئتیں اور مذہبی شاعری کے والہانہ نمونے وغیرہ بہت کچھ موجود ہیں۔ چند مطبوعات دیوناگری رسم خط میں بھی سامنے آئی ہیں۔قیصر الجعفری کا تعلق اس طبقۂ شعرا سے ہے جو روایت کے چمن زار سے جدت کے خارزار کی طرف سفر کرتے ہیں اور ایک طرف ماقبل کے لہجۂ سخن سے استفادہ کرتے ہیں تو دوسری طرف اپنی شناخت اپنے عہد کے مذاق و معیار میں بناتے ہوئے آنے والے مسافران جادۂ فن کے لئے قبلہ نما بن جاتے ہیں۔

قیصر الجعفری روحانی وقلبی رشتے کے شاعر ہیں، محبت ان کا خاص موضوع ہے۔۔۔ وہ محبت جو انسان کی شخصیت میں نرم دلی، خوش مزاجی، فراخ وکشاد، جذبۂ ترحم احترام آدمیت اور امن و آشتی کے احساسات جگاتی ہے۔قیصر الجعفری شدت احساس کو نظم کرنے کی غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔غزل کے عام مضامین بھی ان کے یہاں نئی چمک دکھاتے ہیں چنانچہ دنیا کی ستم ظریفی، اہل عشق کی تڑپ، محبوب سے قربت روحانی کے بعد دوری کی بے معنویت، آلام و مصائب کی شدت، ناقدری فن، نارسائی۔۔۔اور ان سب محسوسات و موضوعات میں سب سے اہم اور نمایاں نکتہ یعنی 'انا' قیصر الجعفری کی تخلیقی شخصیت کی علامت بن جاتی ہے۔عرفان ذات کا موضوع پہلو بدل بدل کر ان کے کلام میں ابھرتا ہے:

ایک زنجیر انا دونوں طرف پاؤں میں تھی
بیچ میں سرحد انکار تھی ملئے کیسے

ہوا میں میری انا بھٹکتی رہی ورنہ
میں آشیانے میں برسات کاٹ سکتا تھا

میں نے منہ دیکھ کے لوٹا دئے اوروں کے چراغ
رات ایسی بھی کٹی دشتِ انا میں گزری

غزل کو جو چیز امتیاز وافتخار بخشتی ہے وہ شاعر کا اپنا مخصوص لہجہ ہے جس کے ذریعہ وہ دوسرے بہت سے ہم عصروں کے درمیان پہچانا جا سکتا ہے۔قیصر الجعفری اپنے طرز اظہار سے پہچانے جاتے ہیں، الفاظ کا مخصوص رکھ رکھاؤ، تراکیب واشارات کی صنعت

گری، جذبے کے اظہار میں نیم گفتنی کی کیفیت اور رمزیہ لب ولہجہ یہ سب خصوصیات قیصرا لجعفری کو نہ صرف اپنے ہم عصروں میں ممتاز بناتی ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے غزل کی ایک بوطیقا تیار کر دیتی ہیں۔ مجھے ان کے اوپر کے تین اشعار کے علاوہ درج ذیل اشعار اچھے لگتے ہیں۔

(بحوالہ: اگر دریا ملا ہوتا)

مرے خدا مجھے تھوڑا سا اختیار سفر
بھنور دیئے ہیں تو یارائے ناخدائی بھی دے

میں ایسی سر پھری دنیا کو کیا کہوں قیصر
کہ سنگِ راہ بنے طعن نا رسائی بھی دے

اب ایک ایک حرف سے چھنتی ہے روشنی
تم سے ملے نہ تھے تو یہ حسن غزل نہ تھا

زندگی اپنی فقط راہ بناتے گزری
بھیڑ لوگوں کی سر راہ گزر تھی اتنی

مرے وجود میں کیا شاہکار ہے پنہاں
چڑھا رہا ہے زمانہ خراد پر کب سے

تم ایک شام کے جھونکے سے بجھ گئے قیصر
غبار درد کی بارش تو عمر بھر ہے عیاں

مجھے کیا دکھا رہے ہو مرا داغ نارسائی
مری جستجو سے پوچھو کوئی راستہ بچا ہے ؟

زمین بیچ کے رہتے رہتے آسمانوں پر
مرے بزرگوں میں صاحب فراغ ایسے تھے

ہوا کو شمع بجھانے کا حوصلہ تو نہ تھا
کہیں یہ دامن جاناں کا فیصلہ تو نہ تھا

آوارہ پھر کے دیکھ لیا رات رات بھر
اس کی گلی کے بعد کہیں روشنی نہیں

اسلاف کے کچھ نام تو چہرے پہ لکھے ہیں
ویرانے میں ٹوٹی ہوئی دیوار سہی ہم

یہ بُعد ہے برسوں کے نہ ملنے کا نتیجہ
مل جاؤ کسی دن تو وہی تم ہو ،وہی ہم

ذرا سا واقعہ تھا دل کا بجھنا
ہواؤں نے دھواں پھیلا دیا ہے

قیصر ابھی غزل کے مسائل بہت سے ہیں
رونا تھا جتنی دیر محبت میں رو لئے

قیصر الجعفری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔دانہ پانی،کھویا ہوا گاؤں،اور ایک لمحہ جیسی کامیاب نظمیں ان کی غزلیہ شاعری کے حسن رفتار میں حائل نہیں ہو سکتیں۔

(انتخاب۔۲۱ صفحہ ۶۷ سن اشاعت ۲۰۱۰ء)

☆☆
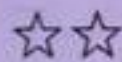
اسیم کاویانی

جناب اسیم کاویانی کے دیگر فتوحات کے سلسلے میں تو میں فی الوقت کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جناب شمس کنول کے رسالے لگن کا دو جلدوں میں انہوں نے جو انتخاب شائع کیا ہے وہ تاریخی اہمیت کا حامل اور عظیم الشان علمی کارنامہ ہے۔

شمس کنول کی نابغۂ روزگار اور دانشورانہ شخصیت آج تک ہم اُردو والوں کے لئے تفہیم وتحسین کے لئے ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شمس کنول غلطی سے اُردو والوں کے درمیان پیدا کر دئے گئے تھے اس لئے کہ ان کے فکر ونظر اور مجتہدانہ تصورات کے جذب وقبول کی صلاحیت ہنوز ہمارے معاشرے میں پیدا نہیں ہو سکی ہے۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو معاشرہ شروع سے آخر تک بالحیث المجموع متقدیانہ،اتباعی اور رجعت پرستانہ رہا ہے۔ترقی پسند تحریک کی انگیخت بھی اس تن مردہ میں جان نہیں ڈال پائی۔شمس کنول کی عبقری شخصیت اور ان کے فکر کی عدم تفہیم اور اس کے نتیجے میں ان سے عمومی اجتناب کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم تعطل پسندی اختیار کر کے فرسودہ تصورات (جو شروع سے ہمارے معاشرے میں حاوی رہے ہیں) سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں چاہتے ،نہ جانے کتنے شمس کنول اس صورت حال میں اپنی تمام تر دانشوری کے ساتھ منظر نامے سے غائب ہو چکے ہیں۔تشویش کی بات تو یہ ہے کہ اِدھر کم وبیش تیس برسوں سے ہمارے اجتماعی فکر کا قبلہ رجعت نواز تحریکوں سے مزید کج ہوتا جا رہا ہے اور ہم عالمی سطح کی دانشوری سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ہم مری ہوئی مچھلیوں کی طرح دھارے میں بہتے جا رہے ہیں۔

اسیم کاویانی نے گگن اور افق تا افق کا انتخاب شائع کر کے ہمیں ایک بار پھر صراط مستقیم پر چلنے اور سوچنے کا موقع عطا کیا ہے۔انہوں نے جلد اول میں اپنے طویل مقدمہ کے ذریعہ جناب شمس کنول کی شخصیت اور ان کے انداز فکر کا نہایت کامیاب تعارف پیش کر دیا ہے۔۔۔اور بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے کہیں بھی اپنے تصورات اور Comments کی ضرورت نہیں سمجھی ہے۔اس معروضیت کے ذریعہ اگر ایک طرف انہوں نے اپنے آپ کو'محفوظ' کر لیا ہے تو دوسری طرف شمس کنول کے فکر و نظر کو آزادی کے ساتھ سمجھنے کی فضا پیدا کر دی ہے۔

''انتخاب گگن'' کی یہ دونوں جلدیں اُردو میں دانشوری کے ابھرتے ڈوبتے آفاق کی ایک قیمتی دستاویز بھی ہے اور ذہنی فراغ و کشاد کے لئے ایک خاموش دعوت نامہ بھی۔

(انتخاب۔۲۱ صفحہ ۶۹ سن اشاعت ۲۰۱۰ء)

اظہار خضر

ادھر چند برسوں سے اُردو تنقید کی پُر خار وادیوں میں الجھنے والے نئی نسل کے تین ذہین اہل قلم باری باری سے ذہن میں آتے ہیں۔ان کی غیر معمولی ذہانت،طباعی،انفرادیت اور بے پناہ جرأت اظہار اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ ان کی تحریروں کا سنجیدگی سے محاسبہ کیا جائے۔میری مراد مبین صدیقی،جمال اویسی اور اظہار خضر سے ہے۔یہ وہ شعلہ صفت چنگاریاں ہیں جن کے یہاں فکر ونظر،مطالعہ واستنتاج،خوداعتمادی،تجزیہ کاری اور اظہار و بیان پر مکمل دسترس ہے۔یہ نوجوان ہیں۔آنے والے وقتوں میں دیر تک تخلیق وتنقید کے میدانوں میں ان کی تحریریں راستے بناتی رہیں گی۔۔۔راستہ دکھاتی رہیں گی۔

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن

فی الوقت اظہار خضر کی دو مطبوعات (زبان کی جمالیات اور مانپوری۔۔۔احوال آثار) میرے سامنے ہیں۔اول الذکر کتاب ان کے مقالات کا مجموعہ ہے اور دوسری کتاب میں انجم مانپوری کے انشائیوں کا انتخاب پیش کرتے ہوئے ان کی حیات وخدمات پر بسیط مقدمہ رقم کیا گیا ہے۔

اپنے تفصیلی مقدمے میں اظہار خضر نے انجم مانپوری کی تحریروں کی تفہیم اور ان کے انشائیوں کی معنویت سے متعلق جن امور کا ذکر کیا ہے ان سے ان کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔مزاح وظرافت کی افادیت کے سلسلے میں خود انجم مانپوری کا یہ شعر معیار واصول کا اشارہ نما ہے،وہ کہتے ہیں:

مانپوری مسخرہ پن کو نہیں کہتے مزاح
چاہئے سنجیدگی بھی کچھ ظرافت کے لئے

انجم مانپوری کے تمام انشائیے اسی اصول کے ترجمان ہیں۔ اظہار خضر نے اسی روشنی میں مانپوری کی تحریروں کا جائزہ لیا ہے اور وہ ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتے ہیں کہ:

''خیال رہے کہ مزاح میں جب سنجیدگی کے راستے طنز کے عناصر اپنی جگہ بنا لیتے ہیں تو ظرافت کا ایک عمدہ تخلیقی نمونہ وجود میں آجاتا ہے چنانچہ مانپوری کی مزاحیہ تحریریں ہنسوڑ پن، تمسخر، استہزا اور پھبتی سے بالاتر طنز کی تیز دھار سے فرد اور زندگی کے پھوڑوں پر نشتر زنی کرتی نظر آتی ہیں۔ اب یہ مزاحیہ تحریریں محض ہنسنے ہنسانے کی چیز نہ رہ کر ہمیں اور آپ کو غور و فکر کے لئے اکساتی ہیں۔''

اظہار خضر نے اس کتاب میں انجم مانپوری کے بارہ انشائیوں کا انتخاب کر کے اسے ایک قیمتی تحفہ بنا دیا ہے اس لئے کہ ان کی کتاب طنزیات مانپوری (حصہ اوّل و دوم)، مطائبات مانپوری اور مرنے کے بعد اب ناپید ہو چلی ہیں۔

اس کتاب سے مانپوری کی تحریروں کے شیدائی بادۂ شبانہ کی سرمستیاں حاصل کر سکتے ہیں۔

اظہار خضر کی کتاب ''زبان کی جمالیات'' نظریاتی اور تجزیاتی مقالات کا مجموعہ ہے، پانچ مقالات تجزیات کے ضمن میں آتے ہیں ان میں کہیں جمیل مظہری کے شعری کردار کا تعارف ہے، کہیں شکیل الرحمن کی کتابوں (مولانا رومی کی جمالیات اور تصوف کی جمالیات) پر مفصل گفتگو ہے، کہیں اختر پیامی کی نظم نگاری کا مطالعہ ہے اور کہیں الیاس احمد گدی کے ناول ''فائر ایریا'' کا تنقیدی جائزہ ہے۔ ان تجزیاتی مضامین میں بھی فن پاروں کے خوب و زشت کا جائزہ لیتے ہوئے اظہار کے انتقادی نظریات کی عکاسی مل جاتی ہے۔ ان کے علاوہ جو مقالات ہیں وہ مقالہ نگار کے فکر و نظر کو تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔ ایک اچھی بات یہ ہے کہ اظہار خضر انتقادی مسائل پر غور کرتے ہوئے آزادانہ اور بسا اوقات بے باکانہ روش اختیار کرتے

ہیں۔ 'بڑے ناقدین' کے اتباع اوران کی تقلید وتائید سے ہٹ کرادبی امور پر وہ خوداپنی رائے رکھتے ہیں اور عام کلیات ومحاکمات کی دریوزہ گری نہیں کرتے۔ یہ آزادی اور خوداعتمادی آگے چل کران کے اختصاص وامتیاز کا وسیلہ بن سکتی ہے۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اظہار خضر تخلیق فن میں فکر وموضوع کے مقابلے میں الفاظ کے دروبست اوران کے غیر رسمی استعمال کوزیادہ اہمیت دیتے ہیں۔کئی جگہ انہوں نے اپنے اس تصور کا اعادہ کیا ہے۔اس نقطۂ نظر کے حوالے سے طویل گفتگو ہوسکتی ہے اورفن پارے میں Content اوراسلوب نیز ان کے رشتے اور تناسب پر تبادلہ خیال کی بڑی گنجائش ہے۔مگر میں اس وقت اس بحث سے قطع نظر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اظہار خضر نے اپنے اس نقطۂ نظر پر جس اسلوب اور جن الفاظ کے وسیلے سے زور ڈالنے کی کوشش کی ہے وہ جگہ جگہ مبہم اور پیچیدہ ہوگئے ہیں۔اس کی چند مثالیں یوں ہیں:

> ''تخلیقی فنکاروں کی فنکاری کا کمال فن ان کے وسیلہ اظہار میں ہی پوشیدہ ہے ذہنی کوائف اور باطن کی ہیجان انگیزیاں، خارج کی سطح پر فکر وشعور کی جس صورت میں ظاہر ہوتی ہیں ان میں فن کار کی اظہاری صلاحیتیں موجزن رہتی ہیں۔''
>
> (زبان کا تخلیقی شناخت نامہ)
>
> ''کسی فن پارے میں زبان فن کار کی فکری سرگرمیوں کے ترسیلی تقاضوں سے فن کی سطح پر عہدہ برآ ہوتی ہے تو فن کار کی یہ لفظی بُنت کاری اس کے تخلیقی ڈکشن کی ضامن بنتی ہے۔''
>
> (جمیل مظہری کا شعری کردار)
>
> ''اظہارفن کی سطح پران افکار پریشاں کے مختلف اجزا ایک اکائی کی صورت میں نظر آتے ہیں یعنی باطن کی کشاکش ہائے ذہنی لفظوں کی فن کاری کی صورت میں ظاہر ہوکرفن کی ایک فطری صورت اختیار کرجاتی ہے۔''
>
> (جمیل مظہری کا شعری کردار)

''لہٰذا اظہار کی سطح پر لفظوں کے تخلیقی اور فنکارانہ استعمال میں چونکہ اس کی قوت بیان ہی کلیدی حیثیت رکھتی ہے اس لئے یہ ایک ارادی عمل ہے جس میں بہر صورت آوردی کیفیتوں کا ہونا لازمی ہے۔''

(زبان کا تخلیقی شناخت نامہ)

''زبان کے تخلیقی نظام سے میری مراد وہی جذباتی نظام ہے جس میں الفاظ اپنے لغوی معنٰی سے ہٹ کر اظہار کی سطح پر ترسیل وابلاغ کے ایک نئے معنیاتی نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔ظاہر ہے کہ فن کار کا یہ عمل بالکل شعوری اور ارادی ہوگا۔''

(زبان کا تخلیقی شناخت نامہ)

''میرے نزدیک ادب نام ہے زبان کے امکانات کو وسیع سے وسیع تر کرنے کا۔کیونکہ زبان میں ایسی بے پناہ ترسیلی قوت ہوتی ہے کہ وہ فن کار کی فکر کو ہر وقت دعوت غور وفکر کے لئے مہمیز کرتی رہتی ہے۔''

(زبان کا تخلیقی شناخت نامہ)

صحیح اور اچھی باتیں رواں اور غیر مبہم اور شگفتہ زبان اور لہجے میں ادا ہوتی ہیں تو قابل قبول ہو جاتی ہیں، اظہار خضر خود بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ''بے ربطی اور جملوں کے انتشار و پراگندگی سے مملو تحریریں نثر کے بہترین فنی نمونے ہو ہی نہیں سکتیں خواہ اس میں علوم وفنون اور معلومات کا وافر ذخیرہ ہی کیوں نہ ہو۔(ص:۴۸)

مجھے امید ہے کہ میری باتیں صدا ابھرا ثابت نہیں ہوں گی اس لئے میں مستقبل کے ایک اچھے تنقید نگار سے ہم کلام ہوں۔ (انتخاب۔۲۱صفحہ۰۷سن اشاعت ۲۰۱۰ء)

☆☆

ڈاکٹر آفتاب رضوی

میں اس بات پر اصرار نہیں کروں گا کہ ڈاکٹر آفتاب رضوی کو شاعر مان لیا جائے مگر ان کی کتاب ''اجلے اندھیرے'' کے مطالعے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ مجھے بہر حال مصنف اور اس کی تصنیف کے بارے میں کچھ لکھنا چاہئے۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ عرض کروں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر آفتاب رضوی کی اس ضخیم کتاب (۳۸۵ صفحات) سے ان کے تخلیقی اظہار کا ایک نمونہ پیش کردوں........وہ اس لئے بھی کہ جن حضرات نے اس کتاب کا اب تک مطالعہ نہیں کیا ہے وہ مصنف کے فرمودات کی روشنی میں میری تحریر کا جائزہ لے سکیں۔ آفتاب رضوی کی ایک تخلیق ''دل عقل اور احساس'' یوں ہے:

جب کبھی میں نے گردش حالات کے مرگھٹ پر
اپنے افکار کو الجھن میں الجھتے دیکھا میرے جذبات نے
صحن گلستاں میں قدم رکھے ہیں
کھلتے پھولوں کے لب ورخسار کو چھونے کے لئے
کھلتے پھولوں کے بازو میں لگے کانٹوں نے
مقصد تعمیر گلستاں کا بھرم رکھنے کے لئے
میرے دامن کو جھنجھوڑا ہے بہت
دل کی آوارہ نقوش پھر بھی تعاقب کرتے رہے
شام کی ڈھلتی ہوئی گیسوئے حسن پر مچلنے کے لئے

شب کی دہلیز پر چراغوں کو جلانے کے لئے
زیست کی مانگ کو نغمہ و ساز سے سجانے کے لئے
میرے جذبات نے
چاند کی نگری سے اترتی ہوئی رونق کو
شیشۂ دل میں اترنے کو کہا
بیتی یادوں نے
تلخئ ایام کی کھڑکی سے
میرے احساس کی سوتی ہوئی دھڑکن کو
جگایا ہے۔ بہت
دل کی آوارگی نے پھر بھی
عقل و ادراک سے سازش کر کے
گرمی احساس کے سلگتے ہوئے انگاروں کو
یہ کہہ کے۔ بجھانا چاہا
کل جو بیت گئی اس کے لئے پہلے ہی
اشکوں کی سوغات دیئے بیٹھے ہو
ایک عمر شگفتہ دیئے بیٹھے ہو
دل کے آوارہ نقوش پھر بھی پابندئ احساس رہے
زیست کی تشنہ لبی اندھیروں میں بھٹکتی ہی رہی
وقت کی مانگ کو شوق جنوں سے نہ سکی
دل تو معصوم تھا، ہار گیا
زخمی احساس کے پتھر سے
اپنے خوابوں کا شہر توڑ لیا
اس مجموعے میں شاعری کے نام پر اس سے زیادہ عبرت ناک مثالیں موجود

ہیں میں تو خیر نہیں لیکن جو لوگ نثری شاعری کی ہمنوائی اور تائید کرتے ہیں پتہ نہیں وہ ایسی تحریروں کے بے بحرہ پن کو کس خانے میں رکھیں گے۔ ابتدائی صفحات میں تعارف وغیرہ کے عنوان سے مصنف نے جو تحریر لکھی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کی معروف شخصیت ڈاکٹر وقار احمد رضوی اور ہندوستان میں جناب زبیر رضوی ان کے حقیقی بھائی ہیں۔ اس تعارف سے یہ اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ ڈاکٹر آفتاب رضوی کا تعلق علمی گھرانے سے ہے اور تنقید و تحقیق کے میدانوں میں ان کے اعزہ نے نمایاں کام کیے ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود آفتاب رضوی کی شتر بے مہار قسم کی تحریروں سے (جنہیں وہ شاعری کہتے ہیں) قاری کس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔ کلام کے حسن و قبح سے قطع نظر میں قارئین کو اس نکتے کی طرف لے جانا چاہتا ہوں کہ آخر وہ کون سی نفسیاتی اور ذہنی کیفیت ہے اور کس طرح کا ذہنی ابال ہے جو آفتاب رضوی کو ایسی یگانہ رُوزگار قسم کی تحریر لکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ یہ ضخیم مجموعہ تمام کا تمام ایسی ہی الجھی ہوئی تحریروں سے مملو ہے۔ میں یہ بات تو مانتا ہوں کہ اچھی شاعری اپنے پورے جذب و کیف اور والہانہ پن کے ساتھ اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جب فن کار کا ذہن اعتدال اور توازن، ترتیب اور غایت درجے کی تہذیب و متانت سے ہٹ کر فریفتگی، بے ساختگی اور ایک طرح کے Uncontrolled upsurge کی طرف مائل ہو جائے۔ یہی وہ منزل ہوتی ہے جہاں خیالات، تصورات اور جذبات و محسوسات کا وفور ہوتا ہے اور فن کار شاعری نہیں کرتا بلکہ خود شاعری ایک بے قابو تموج کی طرح ظہور پذیر ہوتی ہے۔ غالب نے اس بے محابہ جذبے کو تعلّی کے لئے یوں استعمال کیا ہے:

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

ابھی ہمارے علم النطق اور لسانیات نے اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ ہم طویل تر، بے اختیارانہ اظہارات کے مفہوم متعین کر سکیں۔ خدا معلوم وہ وقت کب آئے گا لیکن یقین ہے اس وقت تک اُردو زبان مر چکی ہوگی اور اس ضمن میں ڈاکٹر آفتاب رضوی کا نام زندہ رہے گا۔ (انتخاب۔ ۲۱ صفحہ ۳۷ سن اشاعت ۲۰۱۰ء)

فردالحسن

میرے سامنے جناب فردالحسن کا مسودہ ''بے ترتیب'' موجود ہے۔ میں نے اس کے تمام مشمولات کا مطالعہ کیا ہے۔ اول اول مجھے اس مجموعے کے نام پر تعجب ہوا، جی چاہا کہ شاعر سے کہوں کہ مجموعے کا نام بدل لے، کوئی اچھا سا نام رکھ لے لیکن غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ شعوری یا غیر شعوری جس طور سے فن کار کے ذہن میں یہ نام آیا ہے وہ تخلیق بالخصوص شعری تخلیق کے لئے نہایت مناسب ہے۔ اس کے ذریعہ کہیں نہ کہیں سے اس نکتے کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے کہ فطری شاعری احتیاط و اہتمام، نظم وضبط اور تکلف و ترتیب کو خاطر میں نہیں لاتی۔ شاعری تو جذبے کے اس out burst کا نام ہے جو جذبے کے تیز و تند دھارے کی طرح بہت سی بندشوں کو توڑ دینے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ غالبؔ کے الفاظ میں ''سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود'' رہ کر اچھی اور فطری شاعری نہیں ہوسکتی۔ یہاں تو خیال و جذبہ کا ایک ریلا ہوتا ہے جو رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ سچا فن کار ایک ایسے والہانہ اور بے تابانہ جذبے سے سرشار ہوتا ہے جس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوسکتی۔

اے خوشا عاشق سرمست کہ بر پائے حبیب
سر و دستار نہ داند کہ کدام اندازد

اب ظاہر ہے کہ اس یورش جذبات میں ترتیب و تنظیم کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔ سرکش جذبہ کبھی کوئی عنان قبول نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں تو تندیٔ صہبا سے آبگینہ پگھلنے لگتا ہے۔ یہی شکست و ریخت ہے جو توانا شعری اظہار کی بشارت دیتی ہے۔

فردالحسن کے شعری مجموعے کے اس نام نے بالآخر اس میں میری دلچسپی پیدا کردی اور ایسی دلچسپی پیدا کردی کہ میں اس کے مشتملات کے سلسلے میں اپنی رائے قلمبند کرنے پر مجبور ہوگیا۔ یوں بھی مجھ پر الزام لگایا جاتا ہے کہ میں نئی نسل کے قلم کاروں کی طرف زیادہ متوجہ رہتا ہوں، یہ بات بہت حد تک صحیح بھی ہے۔ اصل یہ ہے کہ پختہ کار اور کہنہ مشق فن کاروں کو تو جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ ان میں بسا اوقات تغیر اور ترقی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اس کے امکانات بھی بہت کم ہوتے ہیں لیکن نو واردان بساط ادب کے سلسلے میں اسی بات کی ضرورت ہے کہ انہیں خدشات و امکانات سے باخبر کیا جائے۔ فن پاروں پر رائیں صرف اس لئے نہیں دی جاتیں کہ موجود تخلیقات سنور جائیں بلکہ ان کا اصل تعلق مستقبل میں سامنے آنے والی تخلیقات سے ہوتا ہے۔ شاعری پر تنقید ان معنوں میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ آگے آنے والی نسلیں خبردار رہیں۔ تنقید لمحۂ حاضر کے لئے معالجے کا کام کرے نہ کرے وہ حفظ ماتقدم کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ نوجوان نسل سے میری دلچسپی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔

شاعری چاہے جیسی بھی ہو وہ بہر حال فن کار کی ذات کی ترجمان ہوتی ہے۔ یہ اس کی شخصیت کو سمجھنے اور پہچاننے کا بہترین وسیلہ ہوتی ہے۔ اس سے سوانح اور آپ بیتی دونوں اصناف کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ افراد کی شناخت ایک عہد کی پہچان بنتی ہے اس لئے بالواسطہ طور پر ہر فنی و تخلیقی نمونہ اپنے دور کی ایک تاریخی دستاویز بن جاتا ہے۔ اس میں ہم عصر سیاسی، سماجی، لسانی، تہذیبی و ثقافتی اور معاشرتی و ذہنی احوال کا انعکاس ہوتا ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ یہ نقوش خاصے دھندلے ہوں لیکن اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تخلیق کی اسی اہمیت کی وجہ سے میں ہر نئی کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور ہر جگہ فن کاری کے اس درِ شہوار کو تلاش کرتا ہوں جس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ فردالحسن کو نہ میں خود اہم شاعر سمجھتا ہوں نہ دوسروں پر یہ جتانا چاہتا ہوں لیکن حق بہ حقدار رسید کے طور پر ان کے امتیازات کی نشاندہی بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

زندگی کی پارینہ صالح قدریں فردالحسن کے لئے بنیادی تخلیقی تحرک کا کام کرتی ہیں۔

روایتوں سے گھرے ہوئے اور ان کے حسن سے مزین گھرانے کا کردار جب اس احساس میں مبتلا ہوتا ہے کہ ماضی کی قدریں اس کے ہاتھوں سے چھوٹ رہی ہیں تو وہ ایک خاص انداز سے Bewildered ہونے لگتا ہے۔اس کا ایک ہاتھ اقدار کے دامن کو سنبھالنے میں مصروف رہتا ہے اور دوسرا ہاتھ فضا میں نئے سہارے تلاش کرنے لگتا ہے۔فرد الحسن کی شاعری میں اس کشاکش کو بطور خاص محسوس کیا جا سکتا ہے ماضی سے اٹوٹ تعلق، عہد رفتہ سے جذباتی رشتہ، بزرگوں کی وراثت کے تحفظ کی فکر، فقر واستغنا، بدلتے ہوئے تہذیبی منظر نامے کا دکھ اور ناسٹلجیا جیسے محسوسات فرد الحسن کے لہجے کو انفرادیت عطا کرتے ہیں۔ان کے مندرجہ ذیل اشعار اس طرح کے ملے جلے جذبات سے عبارت ہیں:

نہ ویسے لوگ ، نہ فرصت، نہ وہ رواداری
نہ لوٹ پائے گی اب سائبان کی خوشبو

آج تک جو بھی بزرگوں سے ملا ہے ہم کو
منتشر ہم وہ اثاثہ نہیں ہونے دیں گے

اپنے پرکھوں کی کہانی بھولنا چاہوں اگر
اے خدا میری دعا تب بے اثر ہونے لگے

سنا ہے شاعری پہلے تو درس دیتی تھی
سنا ہے اب تو یہ فن پھر بگڑنے والا ہے

کھنڈر کھنڈر سی حویلی کے بام ودر روشن
ہے ان میں زندہ ابھی تک کسی مکین کا دکھ

پیڑ پودوں کی حفاظت کا ہنر بھول گیا
شہر کی بھیڑ میں وہ گاؤں کا گھر بھول گیا

نئی تہذیب کے آداب سے واقف حسن ہیں یوں
کہ عہد نو میں بھی ماضی سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں

'ناسٹلجیا' فرد الحسن کے تخلیقی تحرک کا ایک مضبوط وسیلہ ہے اور اہل نظر جانتے ہیں کہ

ماضی تصور، تخیل اور انہماک کا ایک بھنڈار ہی نہیں ہوتا بلکہ حساس ذہن کے لئے ایک پناہ گاہ بھی ہوتا ہے۔ یہ عہد حاضر کے نامساعد حالات کے لئے ایک Defence Mechanism کا کام بھی کرتا ہے۔ فردالحسنؔ اپنے تخلیقی سفر میں اس سے بڑا کام لے سکتے ہیں۔ مٹی کی خوشبو، ماں کی تقدیس، گاؤں کا گھر، عہد گزشتہ کی دلربائی، فرصت اور محبت یہ اور اس طرح کے متعدد محسوسات ہیں جو فن کار سے بہترین فن پاروں کی توقع رکھتے ہیں۔

فردالحسنؔ کے کئی تخلیقیت بردوش اور بے ساختہ اشعار اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایک کامیاب تخلیقی سفر پر روانہ ہو سکتے ہیں۔ شاعری وقت اور ارتکاز ذہنی کی طلبگار ہوتی ہے۔ فردالحسن کے حالات انہیں اس کے لئے کتنا موقع فراہم کر سکیں گے نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال! ان کے یہ اشعار مستقبل کے لئے ان سے توقع استوار کر لیتے ہیں:

سچ بات تو یہ ہے کہ کبھی بھول نہ پایا
کہتا ہوں ہر اک سے کہ تجھے بھول چکا ہوں

یہ حزن، یہ وحشت، یہ اداسی، یہ خموشی
میں کب سے وہی لمحہ بھلانے میں لگا ہوں

نگارخانۂ دل میں سکوت کا عالم
یہ حادثہ تو سر شام ہم بھی لکھتے ہیں

اب حسنؔ لوٹ چلو گھر کو بہت دیر ہوئی
منتظر کس کے ہو اب تک کوئی آیا ہی نہیں

نہ یاد ماضی، نہ حال رکھا
تمہاری یادوں کو پال رکھا

محرومیٔ حیات سے شعلے بھڑک اٹھے
جذبوں نے پھر بھی کوئی تقاضا نہیں کیا

دنیا میرے نام سے نالاں
ہم دنیا کے یار رہے بھائی

فرد الحسن کو ابھی اپنے لہجے کو مزید تب و تاب دینا ہے، روایتی Institutions سے ہٹ کر اپنی شخصیت کو زیادہ خود اعتماد بنانا ہے، انحراف کی طاقت حاصل کرنی ہے، نیاز مندانہ اور عاجزانہ روش ترک کر کے ایک خوشگوار سر پھرا پن اختیار کرنا ہے۔ دین بزرگاں کا احترام کرتے ہوئے اپنے لیے الگ راہ بنانی ہے۔ چونکہ فرد الحسن کی شاعری میں اس کے امکانات موجود ہیں اس لیے یہ باتیں انہیں مہمیز کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ شاعری میں معزز منفرد مقام کا حصول دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے لیے انہماک اور مطالعہ چاہیئے، اپنی شخصیت پر اعتماد اور بزرگوں کی دعا چاہیئے۔ اور بس۔

میں فرد الحسن کے لئے ہمیشہ دعا گزار رہتا ہوں۔

(انتخاب۔۲۱ صفحہ ۶۷ سن اشاعت ۲۰۱۰ء)

☆☆

خواجہ جاوید اختر

خواجہ جاوید اختر کی غزلوں کا مجموعہ ''نیند شرط نہیں'' بس ابھی ابھی آیا ہے۔ اُردو میں آج کل شعری اور افسانوی مجموعے اتنی کثیر تعداد میں چھپ رہے ہیں کہ ان کے سلسلے میں تاثرات بیان کرنا تو دور کی بات ہے ان تمام کتابوں کا مطالعہ بھی آسان نہیں۔ مجھ جیسے ہیچمداں کے پاس متعدد مطبوعات اس انتظار میں ہیں کہ ان پر کچھ لکھوں لیکن اکثر و بیشتر معاملہ ٹلتا رہتا ہے۔ لکھنے میں تاخیر ہوتی ہے تو صاحب کتاب کی طرف سے بدگمانی کا خطرہ بھی رہتا ہے اور شرمندگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن خواجہ جاوید اختر کے مجموعہ کلام کو پڑھ کر فوراً لکھنے بیٹھ گیا۔ یقیناً اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اس مجموعے کا پیش لفظ لکھا ہے۔ بڑا تنقید نگار کسی اوسط درجے کے فن کار کو اپنے تحسینی کلمات سے بڑا تو نہیں بنا سکتا لیکن اسے ایک اچھا تعارف ضرور عطا کر سکتا ہے..... اور جناب فاروقی کا یہ قیمتی تحفہ خواجہ جاوید اختر کو مل گیا ہے تو بلاشبہ انہیں ناز کرنا چاہئیے۔

خواجہ جاوید اختر اپنے منفرد لہجے کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ غزل کی شاعری لہجے کی انفرادیت پر منحصر ہے۔ اسی سے مضامین نو کی یافت بھی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس میں لفظی Tricks بھی لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ خواجہ جاوید اختر اپنی منفرد پہچان کے لیے کوئی بھی حربہ استعمال کرنے پر قدرت رکھتے ہیں، مثلاً اس طرح کے شعر بھی کہہ لیتے ہیں:

بھنویں ہو، صبر کی چادر ہو یا تلوار ہو جاوید
جہاں جس کی ضرورت ہو اسی کو تان لیتے ہیں

خواجہ جاوید کے یہاں ایک بے تابانہ اظہار کی کیفیت ہے۔ یہ بے تابی بسا اوقات

لسانی آداب سے بھی فن کار کو بے نیاز کر دیتی ہے اور اہل زبان کو گرفت کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ مثلاً آنکھ چرانا، باقاعدہ ایک محاورہ ہے، اب شاعر اسے یوں نظم کرتا ہے کہ:

جو فرصت ہو تو ہم سے بھی ملا کر دیکھ لے نظریں
تری آنکھیں چرا لیں گے تجھے حیران کر دیں گے

تو قاری کو حیرانی ہوتی ہے یا جب وہ اپنے شعر

بظاہر تم اسے شاہ جہاں کہتے ہوا ے لوگو
کبھی سوچا پس پردہ حکومت کون کرتا ہے

تو لوگ 'اے لوگو' پر معترض ہو سکتے ہیں یا پھر جب وہ 'پہ' کو بہ وزن 'پر' استعمال کر جاتے ہیں تو اچھا نہیں لگتا، مثلاً:

نکلے جو سفر پہ تو یہ ہم نے نہیں دیکھا
رستے میں کہیں کوئی شجر ہے کہ نہیں ہے

ناز میں تم پہ کرتا ہوں
تم بھی مجھ پر ناز کرو

لیکن ان باتوں سے خواجہ جاوید اختر کے اس تخلیقی ابال پر کوئی فرق نہیں آتا جس سے ان کی حیثیت مسلم ہوتی نظر آتی ہے۔ ان کے اظہار کی سادگی بظاہر سہل لگتی ہے لیکن اسی کی تہہ نشیں معنویت ذہین قاری سے شرکت کی اپیل کرتی ہے۔ شاعری میں قاری کی اپنی شخصیت کا Involvement نہ ہو تو وہ بے کیف ہو جاتی ہے۔ خواجہ جاوید کے متعدد اشعار اپنی سریت کا عرفان اسی وقت عطا کرتے ہیں جب قاری سادگی کی تہہ میں معنویت تلاش کرے اور فن کار کے مدعا تک پہنچ جائے۔ ذیل کے اشعار کچھ اسی نوعیت کے ہیں:

تھک گئے ہیں پکارنے والے
کوئی رہتا نہیں مکان میں کیا

تمنا تھی کہ تجھ کو دیکھتا میں پاس سے اک دن
مگر اے زندگی مجھ کو ترا محور نہیں ملتا

ہر شخص کر رہا ہے درندوں کی بات کیوں
ان جنگلوں میں ایک بھی آہو نہیں ہے کیا

خواجہ جاوید اختر نئی غزل میں ایک اجنبی شعری آہنگ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے جو راستہ اپنایا ہے وہ ان معنوں میں خطرناک ہے کہ فن کار اگر بیچ میں رک جاتا ہے تو عادل منصوری اور محمد علوی بن کر رہ جاتا ہے۔ آگے بہت آگے تک پہنچ جائے تو میر اور ناصر کاظمی کی بارگاہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ میری نظر میں ان کے مندرجہ ذیل اشعار قاری سے توجہ اور محبت کے مستحق ہیں:

ہاں کہہ کہ اپنی جان بچانے لگے ہیں لوگ
یعنی کہ اب زمانہ نہیں کا نہیں رہا

وصال یار سے اچھا تو ہجر ہی ہے کہ اب
سکوں سے رہتے ہیں وہ بھی اور اپنی شان سے ہم

یہ سر بلند تو ہو جائے گا مگر جاوید
ضرور جائیں گے اک روز اپنی جان سے ہم

جس وقت آسمان کو چھونے لگا تھا میں
نیچے تھی میرے ایک خدائی لگی ہوئی

جانے کب آ کے وہ دروازے پہ دستک دے دے
زندگی موت کی آہٹ سے ڈری رہتی ہے

آندھیاں اب اور کیا لے جائیں گی
چار تنکوں کا سہارا جائے گا

تھک گئے ہیں پکارنے والے
کوئی رہتا نہیں مکان میں کیا

ہر ایک سمت سے پتھر چلے مری جانب
ہوا وجود کا اپنے بھی کچھ گمان مجھے

نازک رشتے ٹوٹ گئے
مفت کی کھینچا تانی میں

سورج کو نکلنا ہے وہ نکلے گا بہر حال
یہ میرا مقدر ہے سحر آئے نہ آئے

یہ اور بات ہے کہ وہ میرا نہیں ہوا
لیکن مجھے کسی کا بھی ہونے نہیں دیا

میں خیالوں میں گم تھا کسی اور کے
میرے دل میں کوئی گھر بناتا رہا

اک سناٹا گونج رہا ہے
شہر کے شور و شر کے پیچھے

کسی کے سہارے کے محتاج ہیں ہم
کوئی ڈھونڈتا ہے سہارا ہمارا

ہدف کوئی ہو کہیں ہو، یقین ہے مجھ کو
یہ سارے تیر اسی کی کماں سے آئے ہیں

میں ایک راہ گزر کی تلاش میں ہوں مگر
تلاش کرتی ہے مجھ کو بھی رہ گزر کوئی

ہوا ہے آنکھوں پہ نازل عذاب کچھ دن سے
دکھائی دیتا نہیں کوئی خواب کچھ دن سے

سبب کیا ہے اسے کھونے کا کچھ بھی غم نہیں ہوتا
جسے پانے کا اس دل کو بڑا ارمان تھا پہلے

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے مجموعے کے ابتدائی صفحات میں خواجہ جاوید اختر کی شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی غیر مشروط محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(انتخاب۔۲۱ صفحہ ۷۹ سن اشاعت ۲۰۱۰ء)

ظفر گورکھپوری

بہت سے قلم کار ایسے ہیں کہ جب ان کے فن پاروں پر کچھ لکھا جاتا ہے تو وہ اس لئے کہ انہیں Promote کیا جائے۔ اس کے برخلاف کچھ ایسے فن کار بھی ہیں جن کے بارے میں لکھ کر آدمی یہ سوچتا ہے کہ اس تحریر سے ان کا تو کچھ بھلا نہ ہوگا ہاں اس کے ذریعہ قارئین کو یہ اندازہ ہو سکے گا کہ خود تنقید نگار میں فن کی تفہیم و تحسین کا کیا معیار ہے۔ جناب ظفر گورکھپوری پر قلم اٹھاتے ہوئے میں کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں کہ اس کے ذریعہ مجھے اپنے تعارف کا موقع ملے گا۔

ابھی حال میں جناب ظفر گورکھپوری کا تازہ مجموعہ کلام ''ہلکی ٹھنڈی، تازہ ہوا'' شائع ہوا ہے اس سے پہلے ''زمین کے قریب،'' آر پار کا منظر'' چراغ چشم تر'' گوکھرو کے پھول' اور وادی سنگ' وغیرہ جیسے مجموعوں سے وہ اپنے آپ کو اس طرح Establish کر چکے ہیں کہ فراق، سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، احمد ندیم قاسمی، شمس الرحمٰن فاروقی، محمد علی صدیقی، حمایت علی شاعر، قمر رئیس، اور دوسرے متعدد اکابرین ادب انہیں تحسین و آفرین سے نواز چکے ہیں۔ اب اس کے بعد میرا کچھ لکھنا اس سے زیادہ اور کیا سمجھا جائے گا کہ میں بھی اپنے آپ کو اس انبوہ عاشقاں میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔

لیکن عام خطوط سے ہٹ کر جناب ظفر گورکھپوری کے کلام بالخصوص ان کی غزلیہ شاعری کے حوالے سے میری نظر میں کچھ ایسے زاویے روشن ہوتے ہیں جن کا اظہار نہ کرنا کتمان حق کے مترادف ہوگا۔ اس بات پر اکثر زور دیا جاتا ہے کہ ظفر گورکھپوری بڑے شہروں سے اکتائے ہوئے ہیں، ان کی روح اپنے گاؤں کی مٹی میں سانس لیتی ہے، وہ اپنی زمین سے

جڑے ہوئے ہیں، شاعر جب شہر میں آیا تھا تو اس کی روح اور شخصیت سالم تھی، شہر کے تجربے نے اسے مجروح و مجوس کر ڈالا ہے۔ ان قضیات کی جزوی تائید میں کچھ اشعار ضرور مل جاتے ہیں مگر بنیادی سچائی یہ ہے کہ ایک اصیل فن کار کی طرح جناب ظفرؔ زندگی کے تضادات سے تخلیقی ہیجان حاصل کرتے ہیں۔ تخلیق تضاد کے احساس سے وجود میں آتی ہے۔ ظفرؔ فطرت کے شیدائی ہیں، انہیں مصنوعی اور مشینی زندگی سے الجھن ہوتی ہے۔ ایک سچے فطرت پسند شاعر کی وہ آزاد اور غیر مشروط زندگی کے طلب گار ہیں۔ ہمارا معاشرہ خواہ وہ گاؤں اور چھوٹے قصبات کا ہو یا بڑے شہروں کا...... رکھ رکھاو، تہذیب، تصنع، جھوٹی قدروں، مصلحتوں، فرسودہ رشتوں کے کرب اور دکھاوے کے اخلاق سے اس قدر آلود ہو چکا ہے کہ کوئی حساس آدمی گھٹن محسوس کر سکتا ہے۔ ظفر گورکھپوری کی شاعری کا ایک بڑا حصہ اسی گھٹن کا اظہار یہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ممبئ جیسے بڑے شہر میں رہتے ہوئے وہ اپنے گاؤں کی طرف مراجعت کے لئے بے چین ہیں بلکہ جہاں بھی ہے انہیں ہلکی، ٹھنڈی، تازہ ہوا، گھنی گھنی پیپل کی چھاؤں، بپھرتے پھیلتے دریا اور آگ اگلتے، پہاڑ، لب دریا درختوں پر جھکے مہتاب، ریت پر بیٹھ کر خوابوں کی سیپیاں بٹورنے اور تپتے صحرا کے اس پار پھولوں کی ڈالی جیسی شخصیت اور ایک ماورائی اور سماوی فضا کی تلاش ہے۔ ان کی روح کا اضطراب انہیں کہیں چین نہیں لینے دیتا۔ یہ اضطراب کچھ اسی نوع کا ہے جسے منیر نیازی نے بڑی ہنر مندی سے ظاہر کیا ہے۔ منیر نیازی کہتے ہیں:

عادت سی بنا لی ہے تم نے تو منیرؔ اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

یہی لازوال اضطراب ہے جو ظفر گورکھ پوری کے یہاں متنوع انداز سے ظاہر ہوتا ہے۔ ظفر گورکھپوری کی تخلیقی فضا ایک کابوسی کیفیت، بولتی ہوئی تنہائی، گرد و پیش کی سریت، ایک ان دیکھے وجود کے احساس اور کسی غیر مرئی شئے کی طلب مسلسل سے عبارت ہے۔ جسم میں قید ایک متلاشی روح انہیں ہر حال میں مضطرب کئے رکھتی ہے:

میں دل کے ساتھ جیوں ، شہر ہو کہ جنگل ہو
اذیتِ سروسامان سے نکل آؤں

'مٹی' ظفر گورکھپوری کے یہاں ایک شعری استعارہ بن جاتی ہے جس سے فکرو احساس کی متعدد معنوی جہتیں پیدا ہوتی ہیں۔

اسلوب اور لہجے کے اعتبار سے ظفر گورکھپوری نے اُردو غزل کو ایک بالکل نئی آواز بخش دی ہے...... ایک ایسی آواز جس کا سراغ نہ ماقبل کے فن کاروں میں ملتا ہے اور نہ جسے معاصرین اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں۔ ان کا اسلوب وقفہ، سکون اور ٹھہراؤ کی وجہ سے غزل کی ایک انوکھی قرأت کا متقاضی ہے۔ غزل کے عمومی لہجے میں قرأت کی روایتی دلکشی کے مقابلے میں ظفر گورکھپوری کا لہجہ ہم سے اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اظہار کے خارجی رنگ و روغن سے ہٹ کر اشعار کی معنوی تہ داری اور اس میں چھپے تہ نشیں محسوسات تک رسائی حاصل کی جائے کہ یہی سچے فن کار کا مدعا اور ماحصل ہوتا ہے۔

(انتخاب۔٢١ صفحہ ٨١ سن اشاعت ٢٠١٠ء)
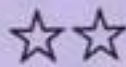
محمد یعقوب اسلم

ابھی ابھی محمد یعقوب اسلم کی نئی کتاب ''مٹی کی خوشبو'' آئی تو مجھے خیال آیا کہ میری نظر سے ان کی گزشتہ چند مطبوعات بھی گزر چکی ہیں۔ میں نے ان کا مطالعہ بھی کیا ہے لیکن شاید ان کے سلسلے میں اپنے تاثرات بیان نہیں کر سکا تھا۔ یعقوب اسلم شعر و ادب اور تصنیف و تالیف کے میدان میں اچھی طرح متعارف اور خاصے مقبول ہیں۔ اُردو زبان کے فروغ اور اُردو شعر و ادب کے ارتقا کی تاریخ ان کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ بنیادی طور پر بچوں کو اُردو زبان سے وابستہ رکھنے اور ان میں تخلیقی تحریک پیدا کرنے میں ان کی کتابیں 'معیاری کہانیاں' اور 'امر کہانیاں' اہم رول ادا کرتی ہیں۔ 'اُردو گرامر' شائع کر کے انہوں نے مبتدیوں میں لسانی شعور پیدا کیا ہے۔ 'رسول عربیؐ' لکھ کر انہوں نے نعت گوئی کا حق ادا کیا ہے۔ اپنی کتاب 'ایک مفکر، ایک مدرس ایک رہنما' میں انہوں نے محسن علم و ثقافت جناب منڈی عبدالغنی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کی کتاب 'عکس در عکس' بھی متعدد اہم شخصیات کا خوبصورت تعارف نامہ ہے۔ افسانوں کا مجموعہ 'چہروں کی دیوار' شعری مجموعہ 'دو ندیوں کے پار'، اور دوسرے کئی تخلیقی اور علمی کارناموں کا جائزہ کسی مختصر تحریر میں ممکن نہیں۔ سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے۔

مجھے جناب یعقوب اسلم کی جملہ تخلیقی و تصنیفی فتوحات کے پیش نظر یہ بات بطور خاص متاثر کرتی ہے کہ وہ نہایت خوبصورت معیاری زبان و اسلوب کے مالک ہیں۔ میں نے تامل ناڈو کے کئی باصلاحیت نثر نگاروں کی تحریر میں اس لسانی معیار اور دسترس کی کمی محسوس کی ہے جو

شمال کے اہم اُردو مراکز میں امتیازی وصف پیدا کرتی ہے۔ جناب یعقوب اسلم کے اظہار و بیان کی شگفتگی، روانی، برجستگی اور صحت و ادبیت کسی بُعد کا احساس ہونے نہیں دیتی۔

پیش نظر کتاب 'مٹی کی خوشبو' میں تامل ناڈو کے تیس مشاہیر کے سوانحی و تعارفی خاکے پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں سے کئی نام تو ایسے ہیں جن کی خدمات کا کچھ نہ کچھ اندازہ اس دور افتادہ کو بھی تھا لیکن محمد یعقوب اسلم نے ان کی ادبی و علمی فتوحات کو تفصیل سے بیان کر کے مجھے ان کے مزید قریب ہونے کا موقع عنایت کر دیا ہے۔ عبدالرزاق افسر، دانش فرازی، راز امتیاز، عابد صفی اور علیم صبا نویدی کی شخصیتیں جناب یعقوب اسلم کی اس کتاب سے روشن تر ہوگئی ہیں اور غلط نہ ہوگا اگر یہ کہوں کہ خود مصنف کتاب کی ادبی شخصیت کے کئی خوشگوار پہلو اس کے ذریعہ آشکار ہو گئے ہیں۔ میں اپنے اس تاثر کا اظہار کرنا بھی ضرور سمجھتا ہوں کہ جن شخصیتوں کا تعارفی خاکہ مصنف نے پیش کیا ہے ان میں سے کئی حضرات ایسے ہیں جن کی عظمت و بلندی اور ان کے گرانقدر کارناموں کے تعارف کا حق ان مختصر تحریروں کے ذریعہ ادا نہیں ہوتا۔ قائد ملت محمد اسماعیل، کاکا محمد ابراہیم، منڈی عبدالغنی، دانش فرازی، راجی صدیقی، سجاد نجاری اور جلال مدنی کے علاوہ کئی دوسرے لوگ ایسے ہی اہم اور یگانۂ روزگار افراد ہیں جن کے لئے یہ مختصر تحریریں ناکافی ہیں۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

جلال مدنی کے مندرجہ ذیل اشعار نے تو حیرت میں ڈال دیا ہے:

سفر دو قدم کا ہے کتنا طویل
کہ شاید یہ رستے بھی چلنے لگے
کئی مرحلوں سے گزرنا ہے تجھ کو
خرد سے جنوں تک بڑا فاصلہ ہے
مجھ سے پوچھے نہ حال دل کوئی
میں کسی کو رلا نہیں سکتا

منزل بھی راہ گیر بھی خود آپ ہوں جلالؔ
اپنی تلاش آپ کیے جا رہا ہوں میں

'مٹی کی خوشبو' کی اشاعت پر محمد یعقوب اسلم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔(انتخاب ۲۲ صفحہ ۸۸ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

☆☆

صادقہ نواب سحرؔ

ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ ہندی اور اُردو ادب دونوں میں یکساں طور پر مشہور ہیں۔ شاعری اور نثر دونوں صنفوں میں ان کے کارنامے قارئین کی توجہ کھینچ چکے ہیں، شاعری میں نظم، غزل، گیت، بچوں کی نظمیں وغیرہ متعدد اصناف سے ان کی دلچسپی رہی ہے۔ تنقید و تحقیق، ترجمے، ناول....اور جانے کیا کیا کچھ ان کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اتنی کثیر الجہات شخصیت اور اس کے کارنامے کا احاطہ دقت طلب بھی ہے اور وقت طلب بھی۔ اصل یہ ہے کہ متعدد شعبوں میں اپنی شناخت پیش کرنے والی شخصیت کی تفہیم کے وقت فطری طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے کسی ایک کارنامے کا تجزیہ ہرگز کافی نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں اس کی تخلیقی شخصیت کے بہت سے گوشوں کے چھوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔

میں تنقید کے لئے فن سے فن کار تک پہنچنے کی مہم جوئی کا قائل ہوں۔ صادقہ نواب کے فن کی سمتوں کا تعدد اور تنوع مجھے کسی نتیجے تک پہنچنے نہیں دیتا۔ شعر و ادب کے چہل خانہ گنج پر ان کی چھاپہ ماری سے ان کے Versatile genius کا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے مگر کسی ایک میدان کار میں ان کی درجہ بندی دشوار تر ہو جاتی ہے۔

میرے پیش نظر ان کا ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' موجود ہے۔ دو تین قراءتوں کے بعد بھی میں اپنے آپ کو اس لائق نہیں بنا سکا ہوں کہ اس کا کوئی ایسا تجزیہ اور تعارف پیش کرسکوں جس سے فن کار کے ساتھ انصاف ہوسکتا ہو۔ یقیناً اس کی بنیادی وجہ ناول میں وقوعوں (ضروری اور غیر ضروری دونوں) کی بھرمار ہے۔ آپ بیتی کے انداز میں لکھے گئے اس

ناول میں متاشا اپنے واقعات اور ان واقعات سے پیدا ہونے والی اپنی الجھنوں کا بیان پیش کرتی ہے۔ کہنے کو تو یہ متاشا کی کہانی ہے مگر اس میں متعدد کرداروں کے احوال سامنے آجاتے ہیں، کئی عہد کئی نسلیں ایک سلسلے سے وقت اور حالات کی ستم رسیدگی کی گواہی دینے لگتی ہیں۔ ناول میں وقت کا بہاؤ ایک تیز دھارے کی طرح متعدد انسانی، سماجی، تہذیبی اور عمرانی اقدار کو تہہ و بالا کرتا رہتا ہے۔ متاشا کئی نسلوں کی سماجی تبدیلیوں کے نتیجے میں ایک ایسے کردار کی طرح سامنے آتی ہے جس کے نزدیک مذہب اور عقیدہ بے روح رواجوں میں لپٹی ہوئی لاش ہے۔ متاشا کی Psyche میں مذہب کی تقدیس اس وقت بے معنی سی چیز ہو کر رہ جاتی ہے جب وہ یہ دیکھتی ہے کہ اس کے پردادا جگن ناتھ مندر کے شاستری تھے۔ روشن خیال تھے اس لئے بیٹے درگا پرشاد کو کونونٹ میں پڑھایا۔ درگا پرشاد عیسائی ہو گئے۔ عیسائی لڑکی سے شادی بھی کی۔

متاشا کے نانا بھی عیسائی مذہب کی طرف جھک گئے تھے۔ دادا پولیس میں کمشنر، دادی اسکول میں پرنسپل۔ متاشا کے پاپا فاریسٹ کانٹریکٹر تھے ان کا نام آریہ تھا۔ لیکن وہ نہایت بدمزاج اور غصہ ور تھے۔ انسانیت اور رشتوں کی تقدیس کی قدریں ان کے یہاں مفقود تھیں۔ عالم یہ تھا کہ وہ اپنی ماں کو بھی مارتے تھے۔ اس ظلم و جبر کے ماحول میں متاشا کی ممی برسوں صبر و ضبط سے کام لیتی رہیں والد کی سخت مزاجی اور والدہ کی نرم خوئی ایک تضاد کا ماحول پیدا کر رہی تھی اس پر ستم یہ ہوا کہ متاشا کے باپ لڑکی کی پیدائش سے ناخوش تھے وہ لڑکا چاہتے تھے۔ اس طرح متاشا کے باپ کی زیادتی اور بڑھ گئی۔ خانگی زندگی کے تناؤ اور تضاد نے گھر کے تمام افراد کی زندگی درہم برہم کر دی تھی۔ خود متاشا کے مزاج میں بھی اس ماحول کی وجہ سے ایک انقلابی رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ باپ دادا اور نانا وغیرہ نے تہذیب و معاشرت کی جو ٹیڑھی میڑھی لکیریں بنائیں تھی متاشا بھی غیر شعوری طور پر اسی راستے پر چلنے لگی وہ آزاد رہنا چاہتی تھی لیکن اس کا چال چلن دیکھ کر پندرہ سال کی عمر میں یووراج سے اس کی سگائی ہو گئی جو خود ایک مخلوط کلچر کا پروردہ تھا یعنی یہ کہ اس کا باپ کتھلک تھا ماں پروٹسٹنٹ اور دادی کسی دوسرے عقیدے سے تعلق رکھتی تھیں۔ حالات کے بہاؤ میں وہ متاشا کے ٹیڑھے میڑھے راستے میں

یووراج کہیں گم ہوکر رہ گیا اب صورت حال یہ تھی کہ متاشا جانے انجانے میں بے راہ روی کے راستے پر چل پڑی تھی۔ ناول نگار نے اس طویل داستان کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔متاشا مختلف پناہ گاہوں کی تلاش میں اپنا سب کچھ لٹاتی رہی کبھی پاپا کے دوست موریشور نے اسے دھوکا دیا کبھی ہوسٹل کی ساتھی منجو کے بھائی پربھاکر کی شخصیت میں پناہ لینے کی کوشش کی کبھی بھرت سامنے آتا ہے پھر سردار جی سے ملاقات، ثمیر، منجیت، فوزان، اور اس طرح باری باری سے متعدد شخصیتیں اور ایک وہ وقت بھی آتا ہے جب متاشا گوتم، پربھاکر، یووراج، اور ثمیر کی شخصیتوں میں انسانی اقدار، سچی محبت اور اٹوٹ رشتے کو مسلسل تلاش کرتی رہتی ہے۔

صادقہ نواب سحر کا یہ ناول الجھے ہوئے واقعات کا ایک دلچسپ بیانیہ ضرور ہے اور نئے نئے واقعات کی وجہ سے قاری کو اپنے آپ سے باندھے رکھنے میں کامیاب ضرور ہوتا ہے۔لیکن کوئی مظبوط اور مستحکم فکر سامنے نہیں لاتا۔متاشا کا کردار بے سروسامانی اور انتشار کا شکار رہتا ہے۔بلاشبہ وہ حالات سے مقابلہ کرتی ہے لیکن زندگی کی کسی منزل میں وہ کامیاب نہیں ہوتی۔ٹوٹی، بکھری، ناشکیبا متاشا حالات سے نبرد آزما ہونے کے بعد بھی کوئی مثبت منزل کا اشارہ نہیں کرپاتی۔صادقہ نواب سحر کہانی کی بنت میں کامیاب ضرور ہوتی ہیں۔لیکن تہذیبی، سماجی اور عمرانی سروکار کی بنیاد پر ایک کامیاب ناول کی پیش کش کی ذمہ داری نبھانا ابھی باقی ہے۔

(انتخاب۔۲۲ صفحہ ۸۹ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

☆☆

سید احمد قادری

سید احمد قادری نئی نسل کے نہایت متحرک اور باصلاحیت قلم کار ہیں۔زبان وادب کے مختلف شعبوں میں انہوں نے کئی ایسے کام کیے ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ان کی شخصیت کی پہلی پہچان ان کی افسانہ نگاری رہی ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں سماجی مسائل خاص طور سے گھریلو زندگی کی کشاکش کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے ان کے افسانوں کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ واقعات اور کردار طبع زاد اور اختراعی ہونے کے باوجود سماج کے حقیقی کردار اور واقعات نظر آتے ہیں۔افسانوی آرٹ کی جملہ خصوصیت میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ کہانی تخیلی ہونے کے باوجود حقیقی معلوم ہو۔کہانی کا آرٹ تخیل اور حقیقت کی دوری کو ختم کر دیتا ہے۔جب حقیقت افسانے کا رنگ اختیار کرنے لگے اور افسانے پر خارجی حقیقت کا گمان گزرنے لگے تو اس سے فن کار کے موضوعاتی انسلات کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔لیکن اس فرق کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہئے کہ کہانی کے ذریعے حقیقت کی ترجمانی کی منزل میں فنکار کی طرف سے غیر معمولی تاثر کی افزائش ضروری ہے۔سید احمد قادری کی کہانیاں بیانیہ میں فنی جمالیات اور تاثرات کی پیشکش کے لحاظ سے بھی نمایاں ہیں۔

قادری کی ادبی شخصیت کا دوسرا پہلو ان کی تنقید نگاری ہے۔تنقید اور تحقیق کے میدانوں میں انہوں نے اپنے کئی پروجکٹس اور تجزیاتی تحریروں سے اپنی کامیاب پہچان کرائی ہے۔قادری صحافت کے مرد میدان بھی ہیں''بودھ دھرتی'' جیسے ہفتہ وار جریدے کے ذریعہ

انہوں نے سماجی اور سیاسی سروکار سے اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔''ادبی نقوش'' کے ذریعہ ہم عصر ادبی تخلیقات کی چھان پھٹک میں اپنی ہنرمندی ثابت کی ہے۔

آج سید احمد قادری کی ایک نئی مرتب شدہ کتاب ''ہم کلام'' میرے سامنے ہے اس میں انہوں نے سہیل عظیم آبادی کے وہ خطوط جمع کیے ہیں جو انہوں نے کلام حیدری کے نام لکھے تھے۔ مخطوطات محفوظ رکھ کر انہیں تاریخی ترتیب کے ساتھ شائع کرنا اور ان پر ضروری حاشیے لکھنا تو بذات خود بڑا کام نہیں ہے لیکن قادری نے کتاب کے ابتدائی صفحات میں ''عرض مرتب'' کے عنوان سے جو تحریر لکھی ہے وہ بلاشبہ ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ تیس بتیس صفحات پر پھیلی ہوئی یہ تحریر نہ صرف سہیل عظیم آبادی اور کلام حیدری کے رابطے پر روشنی ڈالتی ہے بلکہ اس سے متعلقہ عہد کے سماجی، سیاسی، تہذیبی اور معاشی احوال بھی روشن ہوتے ہیں۔ قادری نے جس ترتیب کے ساتھ اور جن اہم امور کی طرف اشارہ کیا ہے ان سے اس عہد کی ایک تاریخی دستاویز مرتب ہوتی ہے۔ ماضی قریب میں گزرے ہوئے یہ وقوعے اس کتاب کی وجہ سے حال اور مستقبل کے لئے ایک مستند تاریخ بن گئے ہیں۔

(انتخاب۔۲۲ صفحہ ۹۲ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

منیر سیفی

جناب منیر سیفی کا تازہ شعری مجموعہ ''پھول خوشبو ہوا'' شائع ہو چکا ہے۔ میں نے اس کا مسودہ پڑھ کر اپنی رائے دی تھی۔ انہوں نے ازراہِ ذرہ نوازی میری اس رائے کو کتاب میں شامل کرلیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پروفیسر وہاب اشرفی اور جناب رفیق شاہین جیسے علمائے ادب کے مقابلے میں میری رائیں منیر سیفی کے سلسلے میں ناکافی ہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف یہ کہ میرے مطالعے اور تجزیے کی نامکمل ترجمانی ہے بلکہ خود منیر سیفی کی شاعری سے انصاف نہیں کرتا۔ دراصل اچھی شاعری کی تفہیم و تحسین کے اظہارات کسی ایک نشست میں ممکن بھی نہیں ہوتے۔

''پھول خوشبو ہوا'' کے آخری صفحات میں منیر سیفی نے اپنی چند نظمیں بھی شریک اشاعت کی ہیں۔ ان میں 'گھر آجانا'، ''تازہ ہوا کے لئے''، 'میں ہی میں' وغیرہ منظومات ایسی ہیں جن سے فنکار کی تخلیقی انفرادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اچھی شاعری کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ قرأت کے درمیان بھی قاری کو متاثر کرتی ہے اور اس کے بعد بھی تادیر بار بار Haunt کرتی رہتی ہے۔ ان مختصر منظومات کی اس خصوصیت کو منہا نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ذہن میں احساس کی پرچھائیاں بن کر قاری کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔

بہ ایں ہمہ میں اپنے اس تاثر کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ منیر سیفی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ہم عصر اُردو غزل کو انہوں نے نئے احساسات، نئے لہجے اور نئے زاویے عطا کیے ہیں۔ روایت پسندی اور جدیدیت کا ایک بڑا فرق یہ ہے کہ روایت کا پابند شاعر الفاظ کی

جمالیات کا سہارا تلاش کرتا ہے۔ترکیبوں اور علامتوں سے ادائیگی کا حسن پیدا کرتا ہے۔اس کے یہاں الفاظ کے حسن ترتیب سے معنوی سطحیں پیدا ہوتی ہیں۔وہ احساسات کی ادائیگی کے لئے الفاظ کے اہتمام کو ضروری سمجھتا ہے۔اس کے برخلاف منیر سیفی کا تخلیقی مزاج اس آرائش و زیبائش اور وضع احتیاط کو خاطر میں نہیں لاتا۔منیر سیفی کا ذہن منظرنامے پر بکھری ہوئی بظاہر چھوٹی سچائیوں سے احساس کی کائنات تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔چنانچہ اکثر و بیشتر خوبصورت ترکیبوں سے اجتناب برت کر وہ عام مشاہدے سے فلسفیانہ عمود تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔'زخمی کبوتر' بارود کی بلیاں' تتلی، چاقو، باغات، پرندے، پھول خوشبو ہوا، مور، چمگادڑ، ابابیلیں، پرانی حویلی، اور اسی طرح کی مفرد سچائیاں منیر سیفی کے یہاں تخلیقی استعارہ بن جاتی ہیں۔ایک اہم بات یہ ہے کہ منیر سیفی عمومی مشاہدے کو احساسی شدت میں تبدیل کرنے کی غیر معمولی قوت رکھتے ہیں۔

اپنے اظہار کے لئے ان کا بے محابہ کرب لفظوں کے نظام کو تہ و بالا کر کے منفرد اور اجنبی تخلیقی قوتوں میں مبدل ہو جاتا ہے۔اصیل تخلیقی جوہر کا اظہار اسی وقت ممکن ہے جب فنکار To get something out of nothing جیسے محاربے میں کامیاب ہو جائے۔

اپنے معاصرین میں اس نوع کی تخلیقی قوت جس حد تک منیر سیفی میں پائی جاتی ہے دوسری جگہوں میں نہیں ملتی۔ان کے مندرجہ ذیل اشعار ممکن ہے میرے خیال کی ترجمانی سکیں۔

کچھ اتنا شعور ہے سناٹی کا
خموشی کی سماعت جل رہی ہے

دل کی راہوں میں قینچیاں رکھ دیں
تیری یادوں کے پر کترتا ہوں

جسے میں قتل کر آیا تھا سیفی
وہی اب مجھ میں زندہ ہو گیا ہے

جھیل، لڑکی، مور، تتلی، گل، ہوا
خاک کی دیوار پر رکھتا ہے وہ

منیر سیفی کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ بے ربطیوں میں ایک ربط پیدا کر لیتے ہیں۔نفی سے اثبات کا یہ تخلیقی سفر سیفی کو جدید اُردو غزل میں ممتاز بنائے رکھے گا مجھے اس کا یقین ہے۔ (انتخاب۔۲۲ صفحہ ۹۳ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

☆☆

سید احمد شمیم

سید احمد شمیم کی تازہ کتاب 'بند آنکھوں کا تماشا' یوں تو بقول مصنف خاکوں اور یاد داشتوں کا مجموعہ ہے لیکن اس میں خود نوشت سوانح حیات کی جھلکیاں زیادہ واضح ہیں۔ یہ ایک خاص عہد کی تاریخ بھی ہے اور ماہ و سال کے گزران کی متحرک تصویر بھی ہے۔ اسے پڑھ کر بند آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں کہ شمیم نے بہت سی نادیدہ و نایافتہ سچائیاں سامنے رکھ دی ہیں۔

یہ کتاب بھی کتابوں کے اس انبوہ میں گم ہو جاتی جن کے مطالعے کے بعد ان پر اپنے تاثرات رقم کرنے کا معاملہ ٹلتا ہی رہتا ہے کہ تا آنکہ مصنف بھی بھول جاتا ہے اور میں بھی۔ مسودے کی صورت میں تو یہ ہوتا ہے کہ کتاب چھپنی ہے اور جلد چھپنی ہے اس لئے چارو ناچار کوئی توصیفی تحریر جلد لکھ دینی پڑتی ہے۔ مطبوعہ کتاب پر اظہار تاثر کے سلسلے میں لکھنے والا آزاد رہتا ہے اور بات ہے کہ اکثر 'مشتے بعد از جنگ' کا احساس ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ یہ آزادی اس وقت اور گراں گزرتی ہے جب صاحب کتاب کے لئے دل میں محبت و موانست کا جذبہ موجود ہو۔ سید احمد شمیم کے ساتھ میرا کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔

شمیم فن کاروں اور اہل قلم حضرات کے جس گر گے کے فرد ہیں اس میں شروع سے آج تک میری رسائی ذرا کم ہی رہی ہے۔ زکی انور، محمد سالم،، جوہر بلیاوی، اسلم بدر، شمس فریدی، سید منظر امام اور منظر کاظمی کا شمار ایسے قلم کاروں میں ہوتا ہے جو تنظیم، تحریک، تخلیق اور ادبی فضا کی تعمیر میں نہایت سرگرم اور نمایاں رہے ہیں اور آج بھی جو حضرات بقید حیات ہیں وہ یگانۂ روزگار ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں سے میرے معمولی مراسم تو ضرور رہے ہیں لیکن

میری فطری کم آمیزی نے مجھے اس کہکشانِ ادب سے قربت قریبہ کا کبھی موقع ہی نہیں دیا۔اب سید احمد شمیم کے ان خاکوں کے مطالعے کے بعد مجھ میں نارسائی کی خلش بڑھ گئی ہے۔ان تمام خاکوں میں شمیم کی شخصیت مشترک کردار کی طرح نمایاں ہوتی ہے۔شاہو بیگھ، دربھنگہ، اسلام پور، جمشید پور جیسی جگہیں جو شمیم کے عہد طفولیت، عنفوان شباب، جوانی اور سن رسیگی کی شہادتیں مہیا کرتی ہیں وہ باری باری سے ان خاکوں میں محفوظ ہوگئی ہیں-----
اوراس طرح یہ سب مجموعی طور پر ان کی خودنوشت سوانح حیات کا معتبر حصہ بن جاتی ہیں۔یہی نہیں ان خاکوں کے ذریعہ اشتراکیت، ترقی پسندی اور معاشرتی زندگی کے نشیب وفراز کی ایک تاریخ بھی مرتب ہوتی ہے۔شمیم نے اپنا ادبی اور تخلیقی سفر جوش، جذبے، سماجی انقلاب، رجعت وروایت کے خلاف بکھرے ہوئے ماحول، جدوجہد، نئے خواب دیکھنے اور اوہام پرستی توڑنے کے عزائم کے جس توانا فلسفۂ حیات کی روشنی میں شروع کیا تھا وہ دھندلی ہوتی گئی۔ اس لئے نہیں کہ وہ غیر توانائی تھی بلکہ صرف اس لئے کہ وہ اُس وقت اس سرزمین کے لئے مانگے کا اجالا تھی۔زمین تیار کئے بغیر اچھے سے اچھا بیج ڈالا جائے تو وہ بے کار ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کو caste struggle سے نکل کر class struggle تک پہنچنے میں ابھی مزید کچھ اور وقت لگے گا لیکن اس کے آثار ظاہر ہو چکے ہیں۔مجھے افسوس ان لوگوں پر ہوتا ہے جو بے وقت کی شہنائی بجاتے رہے۔نظریے کو فکری اصابت، زمینی حقیقت اور حکمت عملی کے بغیر والہانہ اور مجنونہ انداز میں اپنانے کا جو نتیجہ ہوتا ہے اسے بہر حال سامنے آنا تھا۔بسا اوقات ردعمل عمل سے شدید تر ہوتا ہے۔سید احمد شمیم نے مختلف دوستوں کے خاکے لکھتے ہوئے جس جہد لا حاصل اور فکری بحران کا منظر نامہ پیش کیا ہے وہ ہمارے لئے عبرت اور سبق کا موجب ہے۔میں ان عاشقانِ پاک طینت کو بھی شہیدوں میں شمار کرتا ہوں جو تھک ہار کر اپنی ہزیمت چھپانے کے لئے تاریک راہوں کے مسافر بن چکے ہیں اور Blindlane کو جائے وافیت یا منزل سمجھنے لگے ہیں۔ہم عصر رجحان اور تو اور اقبال کو بھی فراموش کرنے پر تلا ہوا ہے۔جس کے 'بندۂ مولا صفات' اور 'یزداں بہ کمند آور' جیسے فقرے روح کو تڑپاتے اور قلب کو گرماتے تھے۔
ہیہات، ہیہات۔

سید احمد شمیم کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی نثر زیادہ اچھی ہے یا ان کی شاعری۔ دل نہیں چاہتا ہے کہ کسی ایک کو کمتر بتایا جائے۔ اچھی نثر ان معنوں میں اچھی شاعری سے زیادہ محترم ہوتی ہے کہ اچھی شاعری تو ودیعت الٰہی کا ثمرہ ہوتی ہے لیکن اچھی نثر لکھنے کے لئے فن کار کو غیر معمولی مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ خاندانی و تہذیبی پس منظر، پیہم مطالعے، مشق و مزاولت، زبان و بیان پر مکمل دسترس، تخلیقی جمال کا عرفان، مزاج کی فرح مندی اور اس کا فراغ، اچھی یادداشت اور نہ جانے کن کن وہبی و اکتسابی خوبیوں سے متصف ہونا ضروری ہے۔ غالباً غالبؔ کے حوالے سے یہ بات مشہور ہے کہ کسی اکھر پٹھان سے جب یہ پوچھا گیا کہ غالبؔ کیسا شاعر ہے تو وہ بول اٹھا "ایں قرمساق ہمہ خوش می گوید" حد درجہ تعریف کے لئے اس کے پاس الفاظ نہیں ملتے تو غصے میں گالی دینے لگا۔ میں سید احمد شمیم کے سلسلے میں ایسا کچھ تو نہیں کر سکتا بس صرف اتنا کہوں گا کہ ان کی نثر پر مجھے رشک آتا ہے---------بے حد رشک۔

(انتخاب۔۲۳ صفحہ ۶۵ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

پروفیسر عظیم الرحمٰن

صاحبان علم و فضل کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلی قسم میں ایسے حضرات کے نام آتے ہیں جو کسی خاص شعبۂ علم میں کمال رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت اپنے شعبے میں استناد کی حیثیت رکھتی ہے۔ لوگ ان کے حوالے دے کر اپنے مطالعے کی وسعت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اس سے ذرا ہٹ کر دوسری قسم ایسے باکمالوں پر مشتمل ہے جو بیک وقت کئی شعبہائے علم (faculties) پر دسترس رکھتے ہیں اور ہر موضوع پر اپنی غیر معمولی صلاحیت کی وجہ سے محترم، معزز اور مستند مانے جاتے ہیں۔ پروفیسر عظیم الرحمٰن کا شمار انہیں موخر الذکر شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ اپنے خاص موضوع یعنی نفسیات میں اساتذہ ان سے استفادہ کرتے ہیں، طلبہ فیض اٹھاتے ہیں۔ ان کی شخصیت کی وسعت زبان و ادب اور شعر و سخن کی مملکت تک پھیلی ہوئی ہے۔ زبان کے نکات، الفاظ کے صوتی نظام، موسیقی کے زیر و بم اور مشکل امور میں تسہیل کے طریقۂ کار پر انہیں جو عبور حاصل ہے وہ اس دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اس تنوع اور تعدد کی وجہ سے بعض لوگوں میں فطری طور پر عبقریت اور ژولیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ دراصل وہ گراں باریٔ علم سے تھکنے لگتے ہیں اور علوم کو سنبھالنے کے چکر میں خود ڈگمگانے لگتے ہیں۔ پروفیسر عظیم الرحمٰن کی شخصیت کی دبازت حیرت انگیز بھی ہے اور قابل رشک بھی۔

یوں تو شعر و ادب کی مختلف شاخوں پر ان کی شگفتہ بیانی، ان کے ادبی ذوق سے لوگوں کو متاثر اور محظوظ کرتی رہتی ہے مگر انہوں نے خاص طور پر عروض جیسے مشکل فن کو آسان بنانے کا عزم کر لیا ہے۔ چنانچہ ان کی دو سابقہ مطبوعات 'ابجد العروض' اور 'رباعی: ایک عروضی

مطالعہ' کے بعد ان کی تازہ کتاب 'کتاب العروض' ان کے اس مشن کا روشن ثبوت ہے۔اس کے تحت وہ تسہیل العروض پر مصر ہیں۔ظاہر ہے کہ عروض ایک ایسا فن ہے جو لفظوں کے استعمال سے صوتی آہنگ پیدا کرنے کا ہنر سکھاتا ہے اور اس طرح شاعری سے اس کا ناگزیر تعلق ہے۔عروض سیکھ کر آدمی اچھی شاعری کر سکتا ہے یا نہیں یہ ایک مشکوک بات ہے لیکن عام طور پر وہ مصرعے تو ضرور درست کر سکتا ہے۔یہ بنیادی بات ہے، اس کے بعد ذوق سلیم کا سارا معاملہ تو توفیق ایزدی پر منحصر ہے۔متعدد مثالیں موجود ہیں کہ عروض کی ابجد سے ناواقف لوگوں نے بھی رواں، سلیس، شگفتہ اور معیاری شاعری کے نمونے پیش کئے ہیں۔اس کے برخلاف عروضی حضرات ناپنے تولنے میں رہ گئے۔اپنے ذاتی تجربے میں آپ کو شریک کرلوں۔گیا کے ایک کالج میں اُردو کے ایک پروفیسر عروض کے استاد سمجھے جاتے تھے۔عروض سے متعلق ان کے پاس کئی موٹی موٹی کتابیں بھی تھیں اور وہ اس علم سے دوسروں کو فیض بھی پہنچاتے رہتے تھے۔افسوس ہے کہ اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ایک بار پٹنہ ریڈیو اسٹیشن کی محفل سخن کے مشاعرے میں وہ اپنا کلام سنانے آئے اس محفل میں حفیظ بنارسی مرحوم بھی تھے، میں بھی تھا۔کلام سناتے ہوئے عروض کے ان استاد شاعر نے غلط مصرعے پڑھے۔حفیظ بنارسی نے بعد میں انہیں ٹوکا، وہ ان سے رخصت ہو کر میرے پاس آئے مجھے وہ مصرعے سنا کر تعجب کا اظہار کرنے لگے کہ حفیظ صاحب ان مصرعوں کو غلط قرار دیتے ہیں۔میں نے ان سے کہا کہ وہ مصرعے لکھ کر مجھے دیجئے اور جواب دیا کہ حفیظ صاحب کی رائے صحیح ہے۔انہیں سخت حیرت ہوئی کہنے لگے گیا آئیے تو میں عروض کی نادر کتابیں دکھاؤں گا۔دس پندرہ دنوں کے بعد گیا میں ان سے ملاقات ہوئی۔میں ان کے دولت خانہ پر خاص طور پر اس لئے گیا کہ دیکھوں کن صاحبان نے اس وزن کو صحیح قرار دیا ہے۔وہ کچھ دیر تک کتابیں الٹتے پلٹتے رہے۔پھر کچھ سوچ کر بولے، ہاں مجھ ہی سے غلطی ہوئی ہے، دراصل میں ان مصرعوں کو کسی اور وزن میں رکھ کر تقطیع کر رہا تھا۔بات آئی گئی ہوگئی۔اس واقعہ سے اتنا تو ضرور نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ عروض کا بیمار عروض سے ہی شفایاب ہوتا ہے.....اور اس بات کو تو سبھی جانتے ہیں کہ ذوق سلیم ایک ودیعت ہے۔کسب وریاضت سے کوئی شخص شاعری کو قابو میں لا سکتا ہے لیکن ذوق سلیم ہو تو

شاعری اس شخص پر قربان ہونے لگتی ہے۔

علم بہر حال علم ہوتا ہے اس سے ذہن میں فراخ وکشاد پیدا ہوتا ہے۔اس بات پر بھی بحث کی جاتی ہے کہ خالص تخلیق کار کو ساختیات، تشکیلیات، رد تشکیل اور قاری اساس تنقید (Reader-based criticism) وغیرہ مباحث سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا، اس کے لئے تخلیق کی سرشاری کافی ہے۔لیکن آگہی تخلیقی ذہن میں وسعت وتوانائی پیدا کرتی ہے۔اس لحاظ سے یہ تمام علوم، بشمول عروض اہمیت سے خالی نہیں۔اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تخلیق کے رشتے دار ہیں۔

کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

پروفیسر عظیم الرحمٰن نے اپنی کتاب میں ان بتوں کو رام کرنے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے جس طرح ابواب کی تقسیم کی ہے اور عروض کے تمام اجزاء کو categorise کرتے ہوئے ہمیں اس فن سے قریب کیا اس سے فی الواقعی نہ صرف علم العروض کی دشواریاں کم ہوتی نظر آتی ہیں بلکہ اس میدان کار میں مصنف کے رجحان واستعداد کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔اس کتاب کو ہر علم دوست پسند کرے گا۔

(انتخاب۔۲۳صفحہ ۶۷ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

☆☆

عشرت بیتابؔ

عشرت بیتابؔ کے کثیر التصانیف اہل قلم ہونے کے باوجود انہیں وہ شہرت و مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس کے کیا اسباب ہیں؟ ایک بڑی وجہ جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کو علاقہ جاتی منظر نامے میں محدود رکھا ہے۔ تحقیقی و تنقیدی کاموں میں ان کے سندی مقالے 'مغربی بنگال میں اُردو افسانے کا سفر'، 'ابتداء' (آسنسول سب ڈویزن کے معروف افسانہ نگاروں کے اولین افسانوں کا انتخاب) اور 'بنگال کے افسانوں کا 60 سالہ انتخاب'.... ان سبھوں کا تعلق ایک مخصوص خطے سے ہے۔ اس کے علاوہ انفرادی طور پر بھی جن شعراء اور نثر نگار حضرات پر انہوں نے مقالات قلم بند کیے ہیں ان سبھوں کا تعلق بھی ایک مخصوص علاقہ سے ہے۔ یہ بات بذات خود خاصی اہم اور قابل ستائش ہے کہ انہوں نے مغربی بنگال میں اُردو شعر و ادب کے فروغ کے جائزے کو اپنی انتقادی کاوشوں کا مرکز بنایا ہے۔ خلیل رمزی، راحت آرا بیگم، ابوالخیر محمد فاروق، شانتی رنجن بھٹا چاریہ، شاہ مقبول احمد، جاوید نہال، علقمہ شبلی، شام بارکپوری، عابد ضمیر، اعزاز افضل اور ظفر اوگانوی وغیرہ جیسے اہم اہل قلم اور شعراء کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے انہوں نے مغربی بنگال میں اُردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی جو سعی کی ہے وہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو زبان کے فروغ اور ادب کی تخلیقی و تنقیدی سرگرمیوں میں مغربی بنگال کی خدمات کسی دوسرے خطے سے کم نہیں ہیں۔ عشرت بیتابؔ نے اس پہلو پر خصوصی توجہ دی ہے اور اہل بنگال کو ان کا حق دلانے کی پُر خلوص کوشش کی ہے۔ اس مہم اور

رویے کا ایک نتیجہ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ اُردو کی بسیط وعریض دنیا نے انہیں ایک section کے نمائندہ کے طور پر محمول کر لیا۔ حالانکہ اس حقیقت کو اس زاویے سے دیکھنا چاہئے کہ عشرت بیتاب نے اُردو شعروادب کے ایک متمول علاقہ کا جائزہ لے کر اُردو کی ہم گیری ثابت کر دی ہے اور اُردو دانشوری کی تاریخ کی تکمیل کی ہے۔

تحقیق وتنقید کے علاوہ عشرت بیتاب کی ادبی شخصیت کی تشکیل میں ان کی افسانہ نگاری بھی اہمیت کی حامل ہے۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے 'ٹھنڈی آنچ کا سورج''، ریت پر اگا ہوا گلاب''، بے ثمر حیات''، برف میں چنگاری''، اور ذہن کے بند دریچوں سے'' شائع ہو چکے ہیں۔ عشرت بیتاب سماجی سروکار کے چھوٹے وقوعوں میں چھپی ہوئی سچائیوں کو تلاش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے مختصر بیانیے انسانی رشتوں کی تقدیس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں عصبیت اور استحصال کے خلاف ایک اثر انگیز احتجاج کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے معاشرے کے مختلف طبقات کی نہ صرف کہانیاں رقم کی ہیں بلکہ ان طبقات کے اجتماعی احساسات کی ترجمانی بھی کی ہے۔ اس ضمن میں کہیں کہیں تیسری جنس کی داخلی کیفیات اور محسوسات بھی ان کی کہانیوں میں منعکس ہو گئی ہیں (کہانی: بے نور آنکھیں)۔ یوں تو عشرت بیتاب کی بیشتر کہانیاں سادہ بیانیہ نوعیت کی ہیں لیکن بعض کہانیوں میں استعاراتی نظام بھی ملتا ہے (کہانی: بے حسی، وہ لڑکی)۔ عشرت بیتاب کہانی بننے کا ہنر جانتے ہیں۔ مختصر افسانے میں اخلاقی یا انسانی اقدار یا کوئی فلسفۂ حیات کہانی کار کے ذریعہ بیان نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ کردار کے عمل میں پنہاں ہوتا ہے۔ کچھ لوگ یہ بھول جاتے ہیں اور اپنے impression کے اظہار میں مبتلا ہو کر افسانے کو بوجھل بنا دیتے ہیں۔ عشرت بیتاب اپنی کہانیوں میں اپنی شخصیت کو سامنے لا کر مداخلت بے جا نہیں کرتے۔ ان کی کہانیاں خود کفیل ہوتی ہیں۔ مختصر ترین لمحوں کے شدید تر محسوسات کو کردار سے ادا کرنے اور ایک طرح کی حیرت اور استعجاب کی فضا پیدا کرنے میں ان کا تخلیقی سلسلہ موپاساں سے ملتا ہوا نظر آتا ہے۔ مختصر کہانی فنکار سے جس غیر معمولی ذہانت اور تخلیقی trick کا مطالبہ کرتی ہے وہ عشرت بیتاب کے یہاں بخوبی موجود ہے۔ کسی فلسفہ طرازی، نظریے کی ادعائیت اور فکر ونظر کے عمق کے بغیر معاشرے کے

عام افراد کے ذریعہ متنوع مزاج واقدار کی ترجمانی کرتی ہوئی یہ کہانیاں قاری کو ہمہ وقت قریب رکھنے میں کامیاب رہیں گی.... مجھے اس کا یقین ہے۔

(انتخاب۔۲۳صفحہ۶۹سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

☆☆

متین عمادیؔ

تمام اصناف نثر میں انشائیہ لکھنا اگر ایک طرف سب سے آسان کام ہے تو دوسری طرف یہ سب سے زیادہ دشوار بھی ہے۔آسان ان معنوں میں کہ اس صنف میں لکھنے والے کو پوری آزادی ملتی ہے۔جب جس موضوع کو جس طرح چاہے پیش کرے،جب جی چاہے موضوع کو بدل دے۔الٰہیات سے سیاست،معاشرت سے اقتصادیات،جنس کے موضوع سے تصوف،کساد بازاری سے منیش،علم سے فساد اور تہذیب سے عریانی ----------
غرض انشائیہ کی ذہنی آوارہ خرامی اس بات کی آزادی دیتی ہے کہ فن کار جب چاہے پہلو بدل لے اور اپنے فکر و اظہار کے لئے نئی جہتیں تلاش کر لے۔حنفی حیثیت سے اس کی بے ترتیبی اور بے اصولی ہی اس کا اصول ہے:

بے اصولی اصول ہے پیارے
پھر تو کہنا فضول ہے پیارے

لیکن اصل کہنے کی بات یہ ہے کہ انشائیہ کی آزادی مطلق العنانی نہیں ہوتی۔انشائیہ انارکی اور مزاج کو بڑھاوا نہیں دیتا بلکہ آزادی کی حد بندیوں اور پابندیوں کا شعور عطا کرتا ہے۔مکمل آزادی بذات خود گمراہ کن اور حد درجہ مضرت رساں ہو سکتی ہے۔آپ کو سڑک پر موٹر سائیکل یا کار چلانے کی آزادی ہے مگر پابندی یہ ہے کہ راستے کے بائیں طرف ہی چلنا ہے۔ آپ حسن پرست ہوں تو ہوں بوالہوس بننے کی آپ کو اجازت نہیں مل سکتی۔آپ امیر ہیں تو غریب کی تذلیل نہیں کر سکتے،غریب ہیں تو دوسروں کی دولت چھین نہیں سکتے --------غرض

ہر آزادی پابندیوں سے عبارت ہے۔

اور انشائیہ نگار اگر وہ اچھا انشائیہ نگار ہے تو فطری طور پر اپنی وسعتوں اور اپنے محدودات کو سمجھتا اور برتتا ہے۔ ان خصوصیات کا حامل ہونا ہر ایرے غیرے کا کام نہیں۔ اس کے متحمل معاشرے کے بے حد باشعور اور حساس افراد ہی ہو سکتے ہیں۔ ان معنوں میں انشائیہ نگاری مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ انشائیہ نگار کی تھوڑی سی لغزش، بے احتیاطی اور بے ہنری اسے کم عیار ہی نہیں گناہ گار بھی بنا سکتی ہے۔

انشائیہ کی صنفی حیثیت اور دوسری مماثل اصناف سے اس کے امتیاز کے سلسلے میں بہت سی باتیں کی جا سکتی ہیں لیکن اس کے بعد بھی یہ احساس رہے گا کہ اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا ہے--------- جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود۔ آسان یہ ہے کہ اس کے صنفی تعارف کے لئے خود اس کی مثالیں پیش کر دی جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ انشائیے کا تعارف خود انشائیے کے نمونے ہیں۔

جناب متین عمادی کے انشائیوں کا مجموعہ ''مری آنکھیں اٹھا لیتی ہیں اس کو'' اس صنف کے لئے ایک بوطیقا کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کے توسط سے ان تمام عناصر وعوامل کی تفہیم کی جا سکتی ہے جن سے انشائیہ کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ کتاب کا نام جناب عمادی کے شعر:

میری آنکھیں اٹھا لیتی ہیں اس کو
وہ رستے میں جو منظر ڈالتا ہے

سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے اس امر کا اثبات ہوتا ہے کہ انشائیہ نگاری کے لئے وسعت نظر ضروری ہے۔ یہ بند آنکھوں کا سفر نہیں ہے بلکہ یہ صنف کشادِ نظر کی متقاضی ہے۔ مشاہدے کا فراغ وبسط اس کا ضروری جزو ہے۔ غالب نے ایک جگہ بتایا ہے کہ:

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

میری بات کسی اور صنفِ ادب کے لئے لازمی ہو یا نہ ہو مگر انشائیے کے لئے تو فی الواقعی ضروری ہے۔ جناب متین عمادی کی خدمت میں اس نام کے لئے تو سب سے پہلے

ہدیۂ تبریک پیش کرنی چاہئے اس لئے کہ انہوں نے شروع میں ہی انشائیے کی علت نمائی کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے جو انشائیے شریک کئے ہیں ان سے بھی اس موضوعاتی تنوع کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کی انشائیہ نگاری کی اہم خصوصیت ہے۔ ''سنڈے کی فضیلت''، ''ٹانگ''، خراٹا''، ہذا من فضل ربی''، شرکت کی قربانی''، اور ''کرتا''----- یہ سب موضوعات و عنوانات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور زندگی کی متنوع جہات سے مصنف کی دلچسپی کے مظہر ہیں۔ انشائیہ اسی نوع کی 'دیدہ وری' کا تقاضا کرتا ہے۔

وزیر آغا مرحوم نے اپنی تحریروں میں اس بات پر اصرار کیا ہے کہ انشائیہ نگار میں ایک ایسی دیدہ وری ہونی چاہئے اور ان دیکھی سچائیوں کو دیکھنے کی ایسی چاہت ہونی چاہئے جو ہمارے اندر بصیرت پیدا کرے۔ تلاش، جستجو، مہم جوئی اور نظر کی دور رسی کو وہ انشائیے کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ جناب متین عمادی جس موضوع کو اٹھاتے ہیں اس سے ایک نیا زاویۂ خیال پیدا کر لیتے ہیں۔ جناب کلیم عاجز نے کہا ہے:

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیم
بات کرنے کا سلیقہ چاہئے

بات کرنے کے سلیقے کے ساتھ اگر بات بھی سلیقے کی ہو تو نور علی نور۔ جناب عمادیؔ کے انشائیے ان دونوں معیاروں پر کھرے اترتے ہیں۔ ان کا منفرد طنزیہ انداز ان کی گفتار کے سلیقے کو بھی ظاہر کرتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ نہ فنکار کے بنیادی مقصد کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

> ''محسوس کیجئے کہ سنڈے کی فضیلت کتنی ہے۔ شاہ صاحب، مولوی صاحب، امیر صاحب، ناظم صاحب، قاضی صاحب کے دلوں میں یہ جاگزیں ہے تو پھر ہم اور آپ کس کھیت کی مولی ہیں۔ تعجب نہیں کہ ایک وقت وہ بھی آئے کہ جمعہ کی نماز بھی سنڈے ہی کو پڑھی جائے۔ جدت پسند طبیعت کا ابال حد سے بڑھے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قاضی شریعت اپنے جبہ و دستار کے ساتھ ٹی وی کے پردے پر ظاہر ہو کر فرمائیں کہ مسلمانو! عید کا چاند ہو گیا

ہے، روزہ چھوڑ دو لیکن نماز کے لئے سنڈے کا انتظار کرو"۔

(انشائیہ: سنڈے کی فضیلت)

واضح ہو کہ اس اقتباس کا صحیح لطف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اسے سابقہ عبارت سے مربوط کر کے پڑھا جائے۔

انشائیہ نگار دوستی دشمنی اور اپنے پرائے کے جذبے سے پاک ہوتا ہے۔ اس کا ہدف کوئی بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کا مقصد کبھی کسی کو گزند پہنچانا یا تکلیف دینا نہیں ہوتا۔ وہ تو اکثر و بیشتر اپنے آپ کو نہیں بخشتا۔ اس کا بنیادی کام خامیوں کی نشاندہی کرنا اور معاشرے کی اصلاح کرنا ہوتا ہے کہ اس کا طنز ناخوشگوار نہیں لگتا۔ خامیوں کی نشاندہی تنقید نگار اور انشائیہ نگار دونوں کا فریضہ ہے لیکن دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ تنقید نگار کے لہجے میں تضحیک و تذلیل اور معاندانہ رویے کا احساس بھی ہوتا ہے۔ تنقید نگار غلطیوں کی سزا دیتا ہے، انشائیہ نگار خطاؤں کو درگزر کر دیتا ہے۔ انشائیہ نگار کا طنز اس کے ہمدردانہ جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ تنقید نگار کے اعتراضات سے Repulsion پیدا ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کی تحریر سے دوستانہ فضا کی تعمیر ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ان دونوں کے رویے میں خنجر قاتل اور نشتر جراح کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ تنقید نگار احساسِ برتری کا شکار ہوتا ہے، انشائیہ نگار متواضع، منکر اور مونس ہوتا ہے۔ بے رحمانہ انتقادی ریمارکس سے منفی ردعمل پیدا ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کی باتوں سے آدمی بددل نہیں ہوتا بسمل ضرور ہو جاتا ہے، اسد اللہ خاں غالبؔ کی طرح بسمل:

اسدؔ کس شان کا بسمل ہے خود قاتل سے کہتا ہے
تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

لیکن ایسا بسمل بننے کے لئے قاتل ویسا ہی چاہئے جیسا غالبؔ نے بتایا ہے:

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور '

مجھے لگتا ہے میں بہک رہا ہوں۔ یہ دراصل جناب متین عمادی کے انشائیوں کا اثر ہے۔ انشائیہ نگار خود بہکتا ہے اور بہکاتا بھی ہے۔ ایک لفظ "پولوشن" جناب عمادی کے یہاں

سیاسی، تہذیبی، مذہبی، رسمی، ادبی، کاروباری، طبی اور تعلیمی گویا متعدد شعبوں اور میدانوں کی سیر کراتا ہے اور سر راہے نہ جانے کتنی معاشرتی Oddities کے عبرت ناک مناظر دکھاتا ہے۔ اسی طرح 'ٹانگ' یا 'کرتا' تخیل کی ہفت اقلیم کی متحرک تصویریں پیش کر دیتا ہے۔ جناب متین عمادی کے انشائیوں میں سیر تماشا بھی ہے اور حکمت وعبرت، فکر ونظر، زجر و توبیخ، محبت و موانست، اقدارِ عبادت اور معیارِ شرافت کے متعدد نکات بھی ہیں۔

تعارف کی اس تحریر کو آپ زیادہ سے زیادہ مقدمتہ الجیش کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک پردہ بھی ہے جو قاری اور فن کار کے بیچ آجاتا ہے۔ میں اب اس حجابِ اکبر کو اٹھاتا ہوں تا کہ آپ جناب متین عمادی سے راست ملاقات کر سکیں۔

تماشا پیش دیگر سُو نبیند
اگر باشد بہ گلشن گل مچیند

(انتخاب۔۲۳صفحہ ۱۷ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

☆☆

عطؔا عابدی

عطا عابدی کی شعری تخلیقی شخصیت دو شعبوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ پہلی شق ان کی مذہبی اور معتقدانہ شاعری کی ہے جس میں حمد، نعت، مناجات اور اظہار عقیدت پر مبنی منظومات ہیں۔ انہوں نے اپنے پہلے مجموعۂ غزلیات 'بیاض' میں ایک جگہ لکھا ہے "شاعری میرے لئے نہ جنون ہے نہ ذہنی تشنگی کے لئے آب حیات۔ شاعری میری باطنی آسودگی کا ذریعہ ضرور ہے"۔ --------- اور ان کے مذہبیانہ شاعری ان کی باطنی آسودگی کا سب سے مضبوط وسیلہ ہے۔ چنانچہ ان کی تخلیقی شخصیت کا سب سے بہتر مظہر ان کی نعتیہ اور حمدیہ شاعری ہے۔ ان کا مجموعہ 'افکار عقیدت' اسی نوع کی تخلیقات سے مزین ہے۔ انہوں نے شروع کے صفحات میں ایک جگہ بتایا ہے:

> "سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے شعر وسخن کے ذریعہ خدا اور رسول کی تعریف نہیں کی ہے بلکہ خدا اور رسول کی تعریف کر کے اپنے شعر وسخن کو قابل تعریف بنالیا ہے"۔

دیکھنا یہ چاہئے کہ اس نوعیت اور موضوعات سے فی الواقعی وہ اپنے شعر وسخن کو قابل تعریف بنا سکے ہیں یا نہیں۔ متاثرین کی ایک کثیر تعداد جن میں سے چند کی رائیں انہوں نے اپنے مجموعوں میں پیش کی ہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ عطا عابدی کی یہ تخلیقی شق عام طور پر لائق تحسین سمجھی جا رہی ہے اور اسی لیے میں ان کی شخصیت کے اس پہلو کو ان کی صلاحیت کا آئینہ سمجھتا ہوں۔ بس چلتے چلاتے صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ معیار کی بلندی

شاعری کے موضوعات سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ موضوعات کو فنکار نے کس ہنر مندانہ طریقے سے پیش کیا ہے۔یہی ہنر ہے جو ہر نوع اور ہر موضوع کو دلنشیں بناتا ہے۔ فنکار میں اس کا فقدان ہو تو اچھے سے اچھا موضوع غیر دلچسپ ہو جاتا ہے۔نعت گوئی کو ہی لیجئے تو ہندو پاک میں اس کا ایک عظیم الشان ذخیرہ جمع ہو چکا ہے اور اس کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے سامنے آچکے ہیں۔اس کے ساتھ اظہار و بیان، جذبہ و کیف اور شعری محاسن کے لحاظ سے لاتعداد کمزور نمونے بھی ہیں۔محض ان کے موضوع کی بنیاد پر انہیں قابل تعریف نہیں کہا جاسکتا۔مذہبی شاعری کا کوئی حصہ محض اپنے موضوع کی وجہ سے قابل تحسین نہیں ہوسکتا۔انیسؔ و دبیرؔ کے مراثی محض اس وجہ سے ممتاز نہیں ہیں کہ ان میں خانوادۂ حسین کا ذکر ہے، کربلا کے واقعات و مصائب نظم کئے گئے ہیں۔ان واقعات کو تو حصول ثواب کا ذریعہ سمجھتے ہوئے بے شمار شعرا نے پیش کیا ہے۔مراثی انیسؔ و دبیرؔ کو جو چیز قابل صد ستائش بناتی ہیں وہ ان کا فنی حسن ہے، موضوع نہیں۔مذہبیانہ شاعری کی دوسری صنفوں کا جائزہ اور محاکمہ بھی اسی پیمانے پر ہونا چاہئے اور ہوتا ہے۔عطا عابدی نے تو خود ایک جگہ ایک پیمانہ بنایا ہے اور صحیح کہا ہے:

آتش کے ریگ زار پہ چلنے کی دیر ہے
آسان ہے پہنچنا عطا کے مقام تک

اگر اس قول سے تعلّی کا حصہ منہا کردیا جائے تو تخلیقی پراسس کا ایک اچھا معیار ہاتھ لگ سکتا ہے کہ حقیقت میں اس التہاب و اضطراب کے بغیر اچھا فن پارہ وجود میں نہیں آتا جو جلتے ہوئے ریگ وزار پر چلنے کے مماثل ہوتا ہے۔

عطا عابدی کی تخلیقی شخصیت کا ایک پہلو ان کی غزل گوئی بھی ہے۔یہ پہلو خاصا وسیع ہے۔اس کینوس پر ان کی خارجی شخصیت کی خصوصیات مکمل طور پر منعکس ہوتی ہیں۔عطا عابدی سادہ، بے ریا، تصنع سے عاری، وفا شعاری، انسانیت نوازی، روایت پسندی، صابر و شکر، اخلاص اور معصومیت اور دوسری متعدد خوبیوں کے حامل ہیں۔یہ خصوصیات جگہ جگہ سے ان کے اشعار سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ہماری مستحکم شعری روایات عہد بہ عہد مختلف فنکاروں کے کلام سے متمول ہوتی رہی ہیں اور سینکڑوں برسوں کے سفر نے اس میں اتنے Shades

پیدا کردیئے ہیں کہ ان کا شمار بھی آسان نہیں۔ یہاں بیک وقت کئی متضاد سمتوں اور رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ کبھی سہل پسندی تو کبھی سادہ بیانی، کہیں نکتۂ چندز پیچیدہ بیانی کی روایت ہے کہیں شاعری کو عوام سے گفتگو کا وسیلہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے، کہیں شعری صنائع کی بھرمار ہے کہیں سہل ممتنع، کہیں موضوعات کے بیان پر اصرار ہے تو کہیں لہجے اور اسلوب کی کرشمہ سازیاں -------غرض اس خزانۂ عامرہ سے متقدمین، متاخرین اور معاصرین میں سے ہر روایت پسند شاعر اپنے مزاج ورجحان کے لحاظ سے اثرات قبول کرتا رہا ہے۔ عطا عابدی کی سادگی پر کہیں کہیں میرؔ کا گمان گزرتا ہے لیکن میرؔ کی روایت محض سادہ بیانی سے نہیں بنتی۔ اس کے لئے وہی دہکتے ہوئے ریگ زار پر چلنے کا ہنر بھی چاہئے جس کا ذکر عطا عابدی نے کیا ہے اور جس کا کچھ شائبہ ناصر کاظمی کے یہاں ملتا ہے۔ محض سادگی تو اکہرا پن بھی پیدا کردیتی ہے جو شعر کو ایک خاص سطح سے اوپر نہیں اٹھا سکتی۔ سادگی کے سہارے شعر کو بیان منظوم سے بچانے کی جدوجہد تو بہتر حال عطا عابدی کو کرنی ہی ہوگی۔ غزل کا شعر تضادات سے ابھرتا اور حسین ہوتا ہے۔ عطا عابدی کے یہاں یہ کوشش ایک خاص صورت میں جلوہ گر ہوتی ہیں، جہاں تضاد کھل کر سامنے نہیں آتا مگر اپنی معنوی پہنائی میں اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک غزل کے یہ دو اشعار دیکھئے:

حقائق اب ہوئے ہیں جا کے روشن
میں خوابوں کی طرح ٹوٹا ہوا ہوں

سمیٹوں خود کو برپا حشر ہو تو
عجب انداز سے بکھرا ہوا ہوں

اس طرح کی اور کئی چھوٹی بڑی خوبیاں عطا عابدی کی غزلیہ شاعری ان کے منفرد لہجے کی تشکیل کرتی ہیں۔ عابدیؔ کو غزل کے آرٹ اور اس کی مشکلوں کا اندازہ ہے۔ فنی منازل سے واقفیت کے باوجود تخلیق کے مرحلے میں حسب خواہش انہیں استعمال کرنا دو الگ الگ سچائیاں ہیں۔ عطا عابدی بتاتے ہیں:

کیا شان غزل لکھوں یہ تجربہ اپنا ہے
یہ فن تو ہے شعلوں کو مٹھی میں سمونے کا

عطا عابدی غزلیہ شاعری کے اس تخلیقی پروسس پر قابو پانے کے کوشاں ہیں لیکن ایک خطرناک بات یہ ہے کہ ان کے پیشِ نظر مجموعے 'نوشت نوا' کے مقابلے میں ان کے پہلے مجموعے 'بیاض' میں کہیں بہتر اشعار ملتے ہیں۔ عابدیؔ نے کہا ہے کہ:

سنبھالو اپنا حرف دادو تحسین
میں کب ہوں مطمئن عرضِ ہنر سے

فن کار مطمئن ہو یا نہ ہو مگر دادو تحسین پیش کرنے والوں کو تو اس بات سے اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ فنکار کا تخلیقی گراف اوپر اٹھ رہا ہے۔

(انتخاب۔۲۳ صفحہ ۷۵ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

☆☆
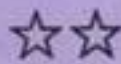
اعجاز مانپوری

غزل کو روایت سے الگ نہیں کیا جا سکتا لیکن آج جب یہ بات کہی جاتی ہے تو لوگ ناک بھنوؤں چڑھانے لگتے ہیں اور اس کلیے کی اکثر مخالفت کرنے لگتے ہیں۔ ذرا غیر جذباتی انداز میں غور کیا جائے اور روایت اور جدت کے رشتے پر غور کیا جائے، روایت کے سفر کا جائزہ لیا جائے، اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ ہر قدر اور ہر رجحان میں فطری طور پر تبدیلیاں ہوتی ہیں، ہر نئی تخلیق ماقبل کی تخلیقی کاوشوں سے آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔---------

تو بہت سے قضیے طے پا جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ روایت بذات خود کوئی جامد نقطہ نہیں ہے، یہ تبدیلیوں اور ارتقاء سے عبارت ہے اور یہ آگے بڑھتے بڑھتے وہ روپ اختیار کر لیتی ہے جسے ہم جدت کہتے ہیں۔ جدت تو خود روایت کے سفر کی علامت ہے، جدت روایت کو توڑنے کا نام نہیں ہے، اس راستے پر آگے بڑھنے اور بڑھتے رہنے کا نام ہے، نئی سمتیں تلاش کرنے کا عمل ہے، شاہراہ سے پگڈنڈیاں نکالنے کا مجاہدہ ہے۔ جدت انکار اور ترک سے نہیں مسابقت اور اختراع سے روشن ہوتی ہے، یہ جڑوں سے نئے برگ و بار پیدا کرنے کی ہنرمندی ہے اور اس طرح تخلیقی عمل کا سچا وظیفہ بتاتی ہے۔ اسی لئے بات بالکل صاف ہے کہ روایت اور جدت کے مابین کوئی خط فاصل کھینچا نہیں جا سکتا۔ یہ relative terms ہیں۔ ان کی کوئی علیحدہ اور واضح نوعیت متعین نہیں کی جا سکتی۔ تخلیق کے باب میں سب سے اہم بات فنکار کی ہنرمندی ہے۔ فنکار تو کمہار ہوتا ہے اس کے ہاتھ میں ہنر نہیں تو اس سے گیلی مٹی بھدے مجسمے اور بدنما برتن بن جاتی ہے، ہنر ہے تو کمہار آذر بن جاتا ہے۔

اعجاز مانپوری کی شاعری کا مطالعہ اسی پس منظر میں کرنا چاہئے۔ بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ دوسری اصناف سخن سے ان کی دلچسپی کو ضمنی اور اضافی کہا جاسکتا ہے۔ غزل کے میدان میں ان کی خوش قدمی کے سلسلے میں متعدد نکات پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن کچھ باتیں تو ایسی ہوتی ہیں جو ماقبل یا معاصر فنکاروں میں مشترک ہوتی ہیں۔ انہیں کسی خاص فنکار کا امتیازی وصف نہیں کہا جاسکتا۔ ان امور میں فنکاری کا جائزہ اس لہجے اور اسلوب سے لگایا جاسکتا ہے جو فنکار کی پہچان ہوتا ہے۔ اعجاز مانپوری کی تخلیقی شخصیت میں عجز و انکسار، تحمل، درویشی اور انسان نوازی کی خصوصیات آسانی سے دریافت کی جاسکتی ہیں۔ معاشرے کے لئے دردمندی، مظلوم طبقے سے ہمدردی کے نیم مخفی محسوسات اعجاز کے یہاں کسی معاشرتی تغیر پر اکساتے تو نہیں لیکن اس صورت حال میں خاموشی کے ساتھ کردار سازی کی دعوت ضرور دیتے ہیں۔ ان محسوسات کو غیر موضوعاتی بناتے ہوئے قاری کے احساسات تک پہنچانے کے لئے اس لاسلکی عمل کی وجہ سے اعجاز اپنے معاصرین میں آسانی سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس نکتے کی تائید ہوتی ہے:

مفلسی کتنی تڑپ اٹھتی ہے بے تابی سے
آکے سائل جو کبھی در پہ صدا دیتا ہے

ایک اک درپہ نہ امید کا کاسہ رکھیے
ہر گھنا پیڑ کہاں سب کو ہوا دیتا ہے

چین سے رہتا ہے بنیاد کا پتھر اعجاز
زلزلہ اونچی عمارت کو گرا دیتا ہے

تاریک نہ رہ جائے ہستی کا کوئی گوشہ
ہر موڑ پر چاہت کا اک دیپ جلانا ہے

سب کو سبیل بن گئی لیکن غریب پر
ایک سرسری نگاہ بھی ڈالی نہیں گئی

ان اشعار پر یہ الزام عائد کیا جاسکتا ہے کہ یہ یک سطحی ہیں اور ظاہری شعری محاسن

سے عاری ہیں۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاعری کی قرأت اوراس کی تفہیم کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اسے خارجی رنگ وروغن سے نکال کر احساس اور جذبے کی سچائی اور شدت کی میزان پر رکھا جائے۔اعجازؔ مانپوری کے یہاں اخلاص فکر کے ساتھ ساتھ مثبت انسانی روایت کے موضوعات، سادگی، بے ریائی اور والہانہ انداز میں سامنے آتے ہیں۔

اعجازؔ مانپوری کی شاعری میں آپ کو تجرباتی تصنع کا دور دور نشان نہیں ملے گا۔ تجربات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔نئے موضوعات کی درآمد اور اسالیب میں ندرت اور تازگی تجربات کے طفیل ہی آتی ہے۔لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تخلیقی جمالیات (جس کا پہلا فریضہ محسوسات کی ترسیل ہے) کی قیمت پر جو تجربات ہوتے ہیں وہ بالآخر بے اثر ہوجاتے ہیں۔غزل میں ہیئتی تجربات کے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ ہماری عبرت کے لئے کافی ہیں۔چنانچہ آج غزل نما یا آزاد غزل کو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔اس کے عشاق کے جذبے بھی سرد پڑ چکے ہیں۔غزل اپنی روایتی ہیئت کے ساتھ آج بھی تابندہ و درخشاں ہے ---------- اس حد تک روشن ہے کہ دوسری اصناف سخن پر گہن لگ جانے کا اندیشہ ہے۔

میں اعجازؔ مانپوری کے مجموعۂ کلام ' ' کا استقبال کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اس سے ہم عصر غزل کی تابندگی اور حرمت میں اضافہ ہو۔امین!

(انتخاب۔۲۳صفحہ ۷۷ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

مبین صدیقی

مجھے بہت عزیز ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ غیر معمولی اختراعی ذہن کے مالک ہیں۔ ان کی تحریر میں بے باکی ہے، اظہار و بیان پر انہیں حیرت انگیز دسترس حاصل ہے۔ ان کا انداز فکر اچھوتا منفرد اور اجنبی ہے۔ ان میں بے پناہ جرأت اور بے باکی ہے۔ ان کی ساری دوستی و دشمنی کا مدار شعروادب اور نقد و بصر ہیں۔ ان کا ذہن غیر اتباعی اور مجاہدانہ ہے۔ ان کی شخصیت فرسودہ اور روایتی اقدار سے پاک ہے۔ ادب کے حوالے سے ان میں ایک درویشانہ اور مجذوبانہ کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مکمل اخلاص اور انہماک کی بنا پر ان کی کئی باتوں سے اختلاف کے باوجود وہ مجھے بہت عزیز ہیں۔

مبین صدیقی نے ایک لایعنی بحث 'خالق' کے سلسلے میں اٹھائی ہے۔ ان سے پہلے بھی یہ مسئلہ کسی صاحب کے ذریعہ سامنے آچکا ہے لیکن اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خالق حقیقی تو بس اللہ تعالیٰ ہے، وہی اس کا مرکز و منبع ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی متعدد قدرتوں کو اپنی افضل ترین مخلوق انسانوں میں بھی تقسیم کیا ہے۔ اس مخلوق کو نیابت الٰہی دینے اور اسے فی الارض خلیفہ مقرر کرنے کے لئے ایسا کرنا ہی تھا۔ چنانچہ رازق تو انسان کو بھی بنایا ہے مگر ذات باری تعالیٰ بلاشبہ خیر الرازقین ہے۔ یہ لفظ 'خیر الرازقین' بتا رہا ہے کہ اللہ نے اپنے علاوہ رزق کا حوالہ انسانوں کو بھی بنایا ہے۔ اسی طرح تمام مخلوقات میں بشر کا امتیاز یوں بھی رکھا ہے کہ وہ خالق بھی ہے۔ ذات باری تعالیٰ تو احسن الخالقین ہے (سورہ المومنون)۔ یہاں بھی یہ قرآنی لفظ 'احسن الخالقین' ثابت کرتا ہے کہ تخلیق کی تھوڑی سی قدرت

انسان کو بھی ودیعت کی ہے۔اس کے علاوہ جب ہم ادبی فن پاروں کے لئے تخلیق کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو یہ لفظ معنوی وسعت کا حامل ہو جاتا ہے۔ یہاں صناعی اور ہنرمندی کی صلاحیت بھی مقصود ہے۔ انسان صناع ہو سکتا ہے لیکن صناع ازل تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے تو دوسری مخلوقات کے مقابلے میں اسے اضافی شرف ملنا ہی چاہئے تھا۔ آپ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ خالق حقیقی نے مرکزۂ صفات سے انسان کو بہت سی صفتوں سے جزوی طور پر نوازا ہے۔ آخر تم اللہ کی کن کن نعمتوں سے انکار کروگے۔ اللہ تعالیٰ المصورُ ہے تو انسان بھی کسی درجے میں مصور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ العدل ہے تو انسان کو بھی عدل کی تاکید کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ الوکیلُ ہے تو انسان کو بھی وکالت کی ذمہ داری دی گئی ہے۔ کتنی مثالیں دی جائیں۔ انسان جن خوبیوں سے متصف ہوتا ہے یا اسے ہونا چاہئے وہ سب کی سب اسی خزانۂ عامرہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ مبین صدیقی نے اپنی کتاب 'اکسیر' میں اس مسئلے کو بیجا طول دے دیا ہے۔ انہوں نے اپنی کئی تحریروں میں دینی محور کو اپنا قبلہ بنانے کی بات کہی ہے (ص:140)۔ اس مشورے سے کسی کافر کو ہی انکار ہو سکتا ہے۔ اب اس کا جواب دینے کے لئے پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، جگن ناتھ آزاد، بلونت سنگھ، بانی رام لعل وغیرہ پچیسیوں غیر مسلم ادبا و شعراء تو رہے نہیں لیکن جو بچ رہے ہیں وہ جانیں۔ گوپی چند نارنگ، پرتپال سنگھ بیتاب، جوگیندر پال، شین کاف نظام، بلراج کومل، مہندر پرتاپ چاند، کشمیری لال ذاکر، کیول دھیر، کے ایل نارنگ ساقی، گلشن کھنہ وغیرہ پتہ نہیں کیا کہتے ہیں اور کس طرح دینی محور کو اپنا قبلہ بناتے ہیں۔ اتنا تو ضرور ہے کہ ان میں سے ہر شخص شعروادب کے بامقصد، تعمیری، انسانی واخلاقی اقدار کے ترجمان بننے کی تائید کرے گا مگر شاید مبین صدیقی اس پر اکتفا نہ کریں..... اور بے چارے وہ مسلمان ادیب وفنکار کیا کریں جو انگریزی، فرانسیسی، جرمن، ہندی، تلگو، ملیالم، وغیرہ زبان وادب میں شعروادب کی تخلیق کرتے ہیں۔ دینی محور کی شرط صرف اُردو پر کیوں لگائی جائے اور اسے فنی تحسین کا سب سے اہم معیار قرار دیا جاتا ہے تو اس معیار سے صرف دو ایک شاعروں کا ذکر کیوں۔ دوسروں کی توصیف کے لئے الگ معیار کیوں قائم کیا جائے۔ انفرادی طور پر چند ہم عصروں کی تعریف

اور توصیف کے باوجود مبین صدیقی موجودہ یا نئی نسل کے تخلیقی رویہ سے بددل ہیں۔

۱۔ 'واقعہ یہ ہے کہ ہمارے شاعروں / ادیبوں کی روح تقریباً مصنوعی اور حمیت تقریباً خراب ہو چکی ہے وہ غالباً ضالین و مغضوب کی راہ فرار کا لقمہ بن چکے ہیں۔ گمراہیوں کے فروغ کو ادب کا نام دے رہے ہیں'۔ (ص:122)

۲۔ پتہ نہیں نئی نسل میں یہ غلط فہمی کیوں فروغ پا گئی کہ اپنی شاندار مایہ ناز بنیادوں، اصنافوں اور روایات کو رد کر دینے کے بعد ہی ان کی شناخت ہوگی۔ (ص:103)

۳۔ آج (1999ء) نو واردان ادب میں اس کی بحران ہے۔ان میں سے بیشتر تیسرے درجے کا ادب لکھ رہے ہیں یا اپنے مستقبل سے خائف ہونے کے سبب فن کی بجائے عیار ادبی سیاست پر اپنا زور صرف کر رہے ہیں۔(ص:208)

۴۔ آج کے نوجوان جیسا کہ اپنی تہذیب اور اپنے بزرگوں کا مذاق بنا رہے ہیں اُردو ادب پر احمقوں کا ایسا دور شاید کم ہی گزرا ہو۔ کچھ عجب نہیں کہ جب یہی احمق تھک مار کر خود بزرگ صورت ہونے لگیں تو انہیں خود سے زیادہ بڑے احمقوں کا سامنا کرنا پڑے۔

(ص:219)

۵۔ صرف نئے نئے کی گردان کر کے خود کو نیا ثابت نہیں کیا جا سکتا بلکہ اکثر لوگ جو خود پر تقریریں فرما رہے ہیں اپنے فن یا فن پاروں میں قاعدے سے اس کی اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ (ص:213)

مبین صدیقی اپنے فکر میں بے ریا ہیں۔تحریر اور اظہار میں ذرا جذباتی ہو جاتے ہیں۔مسائل کو ارتکاز و اختصار سے بیان کرنے کی بجائے طوالانی بنا دیتے ہیں۔اس لئے ان کے یہاں ژولیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔انہوں نے ادب میں content کی اہمیت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''ادبیات عالم کے شاہکار شہ پاروں میں content کی جو بنیادی اور اولین اہمیت رہی ہے اس پر محاسبہ و مباحثہ، تفہیم و تشریح یا دریافت و بازیافت کی جو تاریخ موجود ہے اس کے مدنظر ہمیں اس کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہئے کہ آج ہم اپنے

ادب میں کانٹینٹ باہر ہو چکے ہیں۔(ص:226)''

مبین صدیقی نے اصیل ،خالص ،اعلیٰ اور مثالی معیار ادب کے لئے اکسیر، اکسیریت، تکسیر وغیرہ اصطلاحات وضع کی ہیں۔ان میں کہیں نہ کہیں سے کچھ معقولیت بھی نظر آتی ہے۔یہ ان کی اپنی ایجاد ہے وہ شوق سے بلا شرکت غیرے انہیں استعمال کر سکے ہیں۔ اس میں کسی کو روک ٹوک کا حق نہیں پہنچتا لیکن اس پہلو پر بہر حال غور کرنا پڑتا ہے کہ'اکسیر' کے لفظ کو جس معنیاتی سطح پر انہوں نے stretched کیا ہے، کیا واقعی یہ لفظ اتنی وسعت ،توانائی اور معنوی ہمہ گیری کا متحمل ہے۔اس کے علاوہ Biological Term سے فنون لطیفہ کی روحانی اور Etheric کیفیات کی کہاں تک ترجمانی ہو سکتی ہے۔اس پر غور کرنا چاہیئے۔

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس 'آن' میں دیکھا

مبین صدیقی یہ مانتے ہیں کہ نیا پن یکسر نہیں آتا۔یہ تسلسل کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے

(ص:209)

وہ غزل اور فکشن کے علاوہ دوسری اصناف کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں۔

(ص:214)

وہ تخلیق میں اخلاص اور تنقید میں اختراعی اور انکشافی خصوصیات پر زور دیتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے متعدد نکات مبین صدیقی کی تھوڑی نرگسیت اور اظہار کی پیچیدگی کے درمیان نمودار ہوتے رہتے ہیں۔اپنی نسل میں فکر کے عمود اور اسکے پھیلاؤ کے لحاظ سے وہ ممتاز ہیں تحریر کی جذبائیت ،پیچیدگی اور ژولیدگی ان کے مستقبل کے لئے خدشات پیدا کر سکتی ہیں لیکن بہر حال امکانات خدشات پر حاوی ہیں۔

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

(انتخاب۔۲۳ صفحہ ۸۰ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

☆☆

حشمت کمال پاشا

چونکہ بچوں کے ذوق ور جحان اور ان کی نفسیات کی تفہیم آسان نہیں ہوتی اس لئے کوئی ایسا نسخۂ کیمیا بھی تیار نہیں کیا جا سکتا جس سے ان نونہالوں میں تہذیب و اخلاق اور انسانی اقدار نیز صحت مند ردعمل کی بنیاد ڈالی جا سکے۔ یہ بات تو طے ہے کہ نو زائیدہ بچوں کا ذہن tabula Rasa (سادے کاغذ کی طرح) ہوتا ہے۔ پیدائش کے بعد سے ماحول، تربیت، تدریس، صحبت، موانست جیسے خارجی عوامل اس پر جو کچھ تحریر کرتے ہیں وہی ان کے کردار کی ساخت اور شخصیت کی تشکیل کے اسباب بنتے ہیں۔ شیر خواری سے لے کر عہد طفل کی مختلف منزلوں تک یہ پروسس انتہائی پیچیدہ ہوتا ہے۔ ذہن میں بے شمار خطوط و نقوش بنتے اور مٹتے رہتے ہیں اور جب بچہ اس عمر کو پہنچ جاتا ہے کہ اس کا تعلق حروف و الفاظ سے قائم ہو اور کتاب و قلم سابقہ نقوش کو بہتر بنائیں تو لازمی طور پر اس منزل میں زیادہ احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے کہ اب جو نقشہ تیار ہوتا ہے اسے تا عمر رہنا ہے یہ عمر بچوں کی نفسیات کو تشکیلی دور سے تکمیلی دور میں پہنچانے لگتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ حشمت کمال پاشا نے بچوں کی نفسیات فہمی کے سلسلے میں کتنا مجاہدہ کیا ہے مگر بچوں کے لئے جو منظومات انہوں نے اپنے مجموعے 'ننھی بیلیں' میں پیش کی ہیں ان کے مطالعے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ انہیں اس میدان میں مکمل دسترس حاصل ہے۔ انہوں نے بڑی حکمت سے ان موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو عہد طفلی میں بچوں کے راست مشاہدے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس عمر میں سنے سنائے الفاظ اور فقرے جو بسا اوقات

بچوں کو اچھے لگتے ہیں انہیں بھی بچوں کی تعلیم وتدریس کا وسیلہ بنا کر حشمت کمال پاشا نے ہنر مندانہ تجربہ کیا ہے۔ ’’اٹکن بٹکن دہی چٹا کن‘‘ جیسے الفاظ جو عموماً ہمارے معاشرے کے چھوٹے بچوں کو اچھے لگتے ہیں۔

حشمت کمال پاشا نے فطری مناظر ’’پھل پھول‘‘ پرندے اور جانور اور ماحولیات جیسے امور کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور اپنی منظومات میں ان کا ذکر کر کے بچوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سے بچوں کو دانش وفہم کے راستے بھی ملتے ہیں۔

اُردو میں نرسری کے بچوں بچیوں کے لئے انگریزی طرز کے rhymes کا کوئی رواج نہیں تھا۔ پاشا نے اس کمی کو بھی پورا کیا ہے اور ’’گاتے حروف‘‘ (حصہ اول ودوم) کی تخلیق کر کے ایک نہایت تعمیری تجربہ کیا ہے۔ نئے نظامِ تعلیم وتدریس میں حشمت کمال پاشا نے اپنے معاشرتی امتیازات کی معنویت کر کے بڑی خوبصورتی کے ساتھ علمی فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ اُردو معاشرے کو چاہئے کہ پاشا کو ہدیہ تشکر پیش کرے اور ان کے کارناموں سے استفادہ بھی کرے۔

(انتخاب۔۲۳ صفحہ ۸۳ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

☆☆
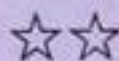
مسعود شمس

گزشتہ صدی کی ساتویں، آٹھویں اور نوویں دہائیاں اس لحاظ سے خاصی اہمیت کی حامل ہیں کہ اس عرصے میں اُردو افسانہ نگاری کی رفتار بہت تیز ہوگئی، نئے نئے موضوعات پیش ہونے لگے، سیاسی، تغیرات کے طفیل تحریر وتخلیق میں نئی بصیرت آشکار ہوئی، سماجی و سیاسی بصیرت نے معاشرے سے نئے سروکار کی طرف متوجہ کیا۔ اس عہد میں موضوعاتی تنوع کے ساتھ لہجے اور اسلوب کی بوقلمونی نے بھی اُردو افسانے کو متمول کیا، تخلیق کار اور ادب کے نئے رشتے سامنے آنے لگے، مسائل سے وابستگی کی نوعیت بدلنے لگی، لسانی تبدیلیاں بھی تیزی کے ساتھ سامنے آنے لگیں۔

اس منظرنامے میں جو بات خاص طور پر محسوس کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس عرصے میں ریاست بہار میں افسانوی تخلیق نمایاں ہوگئی اور یہ خطہ اُردو افسانہ نگاری کے ضمن میں مرکزے کی حیثیت اختیار کرگیا۔ بہار کے افسانہ نگاروں کے اس ہجوم میں مسعود شمس کا نام بھی نمایاں ہوا اور پندرہ بیس برسوں کے اندر انہوں نے تیزی کے ساتھ اپنی شناخت قائم کرلی یہ اور بات ہے کہ تخلیقی وفور کے انحطاط کی وجہ سے یہ گل نودمیدہ مرجھانے لگا اور آج ممکن ہے کچھ لوگوں کو اس نام سے اجنبیت کا احساس بھی ہو۔ مسعود شمس کی مقبولیت کے اضمحلال کی دوسری وجہیں بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہانی فرد کی ذات سے نکل کر راست سماجی مسائل کی طرف سفر کرنے لگی، فنکار کی اپنی شخصیت کا involvement غیر جذباتی انداز میں ہونے لگا۔ مسعود شمس اپنی کہانیوں میں پوری جذباتی کیفیت کے ساتھ نظر آتے ہیں، کرداروں کے آلام ومصائب میں

وہ خود شریک ہو جاتے ہیں۔ ان کے دکھوں سے خود بھی دکھی ہو جاتے ہیں گویا اس طرح اپنی کہانیوں میں وہ آپ ہی کردار بن جاتے ہیں لیکن اُردو کہانی نے اب ایک نیا انداز اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ موضوع و کردار سے فن کار کی جذباتی وابستگی کا جو مشرقی طرز اظہار تھا وہ مغربی ادبیات کے اثر سے Objective Co-relatives میں بدلنے لگا۔ اپنے فن پارے سے فن کار کی محویت اور انجذاب کا زاویہ بدلنے لگا تو مسعود شمس کی کہانیاں تمام تر جذباتی بیانات کے باوجود آج کے صارفی نظام کی استعارے کے استعمال کی نوعیت بدل گئی۔ ان تمام تغیرات کے باوجود مسعود شمس کی کہانیاں اپنے مخصوص لہجے اور اسلوب نیز انسانی درد کی پیش کش کے اعتبار سے معاشرے کی ترجمانی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے زیر دستوں کی ہمنوائی اور ان کی ذہنی کشاکش کی پُر اثر تصویر کشی کی ہے (بجھے ہوئے چراغ کا اجالا) انسانی رشتوں کی تقدیس پر اصرار کیا ہے۔ (معجزہ) نفسیاتی پیچیدگیوں کے اسرار و رموز منکشف کئے ہیں (احساس کی صلیب)، فساد کی ہولناکی (رات کا سورج) اور زندگی کی یکسانیت (اُڑان) اور فرقہ پرستی کے ننگے ناچ (بھوک) --------- اور اسی طرح متعدد ہم عصر موضوعات مسعود شمس کے یہاں اثر انگیز انداز میں سامنے آئے ہیں۔

سماجی موضوعات اور عصری مسائل تو عام طور پر ادبی فن پاروں کے موضوعات بنتے رہے ہیں لیکن جو بات کسی فن کار کو منفرد اور ممتاز بناتی ہے وہ اس کا لہجہ ہوتا ہے۔ مسعود شمس اپنے مخصوص اسلوب کی وجہ سے آسانی کے ساتھ پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے استعارات اور علائم کے استعمال میں تخیل اور تصور کی کار فرمائیوں سے خصوصی کام لیا ہے۔ ان کے افسانوں میں تحیر، تنہائی میں اپنے آپ سے محو گفتگو ہونا، ایک لامعلوم سے خوف، واہمے، بسا اوقات شدید احساس زیاں اور نفسیاتی پیچیدگیوں سے پیدا شدہ صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں جنس کا ایک معصوم سا جذبہ ہلکے پھلکے تلذذ سے آشنا تو کرتا ہے لیکن جسمانی اتصال کی کثافت سے بچائے رکھتا ہے۔ انسانی اور اخلاقی انداز جن سے مشرقی ذہن کی تعمیر ہوتی ہے وہ بہر حال مسعود شمس کے یہاں Dominate کرتی ہیں۔ ان کے کرداروں میں کئی نفسیاتی مریض بھی نظر آتے ہیں لیکن جنسی Perversion کا ان کے یہاں شائبہ تک

نہیں ملتا۔ تاریکی اور روشنی یا خیر وشر کا محاربہ ہو یا نکسلی تحریک کے اثرات یہ سب کے سب مسعود شمس کا مکمل تخلیقی انہماک کے ساتھ منکشف ہوتے ہیں۔

مسعود شمس کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہے۔ ان کے اسلوب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ نہایت اختصار کے ساتھ اپنے موضوع کے بنیادی پہلو پر روشنی ڈال دیتے ہیں اور کہانی کے اختتام پر ایک تادیر رہنے والا تاثر چھوڑتے ہیں۔ میرے پیش نظر ان کے افسانوں کا جو مسودہ موجود ہے اس میں کل ۱۷ افسانے ہیں۔ ''بجھے ہوئے چراغ کا اجالا'' ایک غریب طالب علم سے تعلق رکھتا ہے۔ دھنی رام کا باپ مرجاتا ہے، ساری جائیداد اس کے چچا کے قبضے میں آجاتی ہے، دھنی رام انجینئر بننے کا خواب رکھتا ہے۔ چچا شروع میں تو ملتفت رہتا ہے لیکن بعد میں یہ کہہ کر ہاتھ کھینچ لیتا ہے کہ مکان اور جائیداد کی جو رقم بنتی تھی وہ سب بھائی کے علاج اور بھتیجے کی پڑھائی میں پوری ہو چکی ہے۔ اب وہ مزید رقم نہیں دے سکتا۔ استحصال کی اس کہانی کے ساتھ رحمو گورکن کی بیٹی کی نوازشوں نے کہانی میں ایک نیا موڑ پیدا کر دیا ہے اور کہانی کار نے استحصال کے مقابلے میں احسان کا عنصر پیدا کر کے ایک رجائی صورت حال قائم کر دی ہے۔ 'اڑان' خاصی مختصر کہانی ہے۔ زندگی میں خوشیاں تلاش کرتے کرتے عام آدمی اپنے چہرے کی تابانی بھی کھو دیتا ہے۔ کہانی میں شکست خواب کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔ 'بھوک' میں دہشت گردی اور فرقہ پرستی کا کریہہ منظر پیش کیا گیا ہے۔ 'جھلسے ہوئے چہرے' میں علامتی انداز میں ناداری کی عکاسی ملتی ہے۔ 'بے جہت سفر' کی بنیاد ایک واہمے سے تعلق رکھتی ہے۔ 'اپنا درد' معاشرے کے اونچے طبقے کے دوسرے چہرے پر سے پردہ ہٹایا گیا ہے۔ 'راج کا سورج' میں استعاراتی نظام ہے اور فساد کا موضوع نئے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ''چاک، گردش اور تاج'' کا روایتی موضوع بھی علامتی انداز بیان کی وجہ سے نکھر جاتا ہے۔ ''تاریک کمرے کا المیہ'' فرسٹریشن کا ایک نقشہ پیش کرتا ہے۔ 'ایک تنکے کی حکایت' کی ابتدا تو کرب والم سے ہوتی ہے کہ یہ ایک رجائی انداز فکر پر ختم ہوتی ہے۔ اس طرح 'آئینہ، معافی، جھاگ''، ''تلخ دواؤں والا ہاسپٹل''، معجزہ''، احساس کی صلیب، اور 'فرض' وغیرہ کہانیوں میں سے بھی فن کار کے تجربات ومحسوسات کے تنوع کا انداز ہوتا ہے۔ مسعود شمس کے یہاں ذہنی فراغ وکشاد اور ایک

طرح کے کھلے پن کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ خارجی وقوعوں کو کسی خاص رنگ کی عینک کے بغیر راست مطالعے کے طور پر دیکھتے اور برتتے ہیں۔ وہ کسی نقطہ نظر یا فلسفہ حیات کے دریوزہ گر نہیں ہیں---------کوئی فلسفہ حیات ان کی کہانیوں سے ابھر کر سامنے آجائے تو اور بات ہے۔

مسعود شمس اب ہمارے بیچ نہیں رہے۔ انہوں نے اُردو افسانے میں اسلوب اور موضوعات دونوں اعتبار سے تجربے کئے ہیں۔ ادب وتنقید کی قدریں تو بدلتی ہی رہتی ہیں لیکن ادب پاروں کے ذریعہ عصری موضوعات پر مبنی جو نگارشات ہمارے ذخیرے کا حصہ بن جاتی ہیں اور سب تاریخ بن جاتی ہیں-------ایک ایسی تاریخ جس کے آئینے میں نہ صرف تخلیقی تفاعلی کی روداد نظر آتی ہے بلکہ سماجی، تہذیبی اور ثقافتی وعلمی تغیرات کے نقوش بھی محفوظ ہوجاتے ہیں۔ مسعود شمس کی فنکاری بھی اس امانت کا ایک حصہ ہے۔

(انتخاب۔۲۳صفحہ ۸۴ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

رفیق ہارون

نثری اصناف ادب میں ناول کو سب سے زیادہ اہم صنف تصور کیا جاتا ہے اور اس کی بنیادی وجہ اس کی جامعیت ہے۔ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ اپنے اندر زندگی کے پھیلاؤ کو سمیٹ لے، تاریخ کو محفوظ کرلے، اساطیر کو اپنے اندر سمولے، مختلف عہد اور ادوار کا ترجمان بن جائے، تحریکات کی تفصیل پیش کردے، سماجی، سیاسی، تہذیبی اور سائنسی جدوجہد کی روداد مرتب کردے اور تخیلات کی طنابیں کھینچ کر انسانی کاوشوں کے امکانات کا نقشہ سامنے لے آئے --------- یہ اور اس طرح کے عظیم کارنامے ناول ہی انجام دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنف ادب میں متواتر تجربات بھی ہوتے رہے ہیں۔ کہیں اسے خیر و شر کے محاربے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ کہیں جرائم کی سراغ رسانی کا کام لیا گیا ہے، کہیں انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں سے پیدا شدہ مسائل سامنے لائے گئے ہیں، کہیں انسانی ذہن کی قوت پرواز ثابت کرتے ہوئے طبیعات سے مابعد الطبیعات تک کا سفر اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ زندگی کے Wholeness کی عویداری کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ ہر ناول اپنے اندر ان تمام خوبیوں کا حامل بن جائے۔ اس سے ناول کی صنفی وسعتوں کا اندازہ ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ ناول کتنے سمندروں کا سفر کرسکتا ہے۔ کسی مفرد ناول میں تو بہرحال ان میں سے کسی ایک سمندر کی غواصی کا کمال نظر آنا چاہئے۔

ناول میں ضخامت کی روایت بھی اسی سمندر کی غواصی کی آئینہ دار ہے۔ اصل تخلیق تو مرکزے میں ہوتی ہے۔ اس nucleus کا تظاہر تفصیل کا متقاضی ہوتا ہے۔ ناول چونکہ وسیع

تر وقوعوں پر مبنی ہوتا ہے اس لئے تخلیق کا لفظ یہاں پھیلتا جاتا ہے۔ناول میں واقعاتی بسط Horizental (آفاقی) انداز میں ہوتا ہے اس کے بر خلاف غزل کا شعر Vertical (عمودی) خصوصیت کا حامل ہوتا ہے جس سے پھیلاؤ کی بجائے بلندی اور گہرائی کی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔غزل کے شعر کا ایجاز اس کا حسن ہے جب کہ ناول کا واقعاتی پھیلاؤ اس کی مجبوری ہے۔ناول کو صرف اس کے لغوی معنی تک محدود کر دینا غلط ہے بلکہ جب ایک نثری صنف کی حیثیت سے سمجھنا ہوتا ہے تو کسی نئے اور اجنبی نتیجے کی یافت اس کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ناول ایک نتیجے، ایک محاکے کی صورت میں سمٹتا ضرور ہے لیکن ناول نگار کو دوسرے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔اولاً وہ واقعاتی وسعت پیدا کرتا ہے جس سے اس کے wholeness کا اندازہ ہوتا ہے۔دوسری منزل میں ناول نگار اسے سمیٹتا ہے اور ایک فلسفیانہ نتیجہ تک پہنچتا ہے۔

جو لوگ ناول میں مکانی و زمانی وسعت کے خلاف اسے چند صفحات میں سمیٹنے کا تجربہ کرتے ہیں وہ گویا سمندر کو کوزے میں بند کرنا چاہتے ہیں وہ تخلیق سے زیادہ کرشمہ سازی یا جادوگری کی کوشش کرتے ہیں ادھر حال میں نجمہ محمود کی کتاب ''جنگل کی آواز'' شائع ہوئی ہے۔اس میں تین فن پارے ناول بتا کر شائع کئے گئے ہیں۔ان کا ناول (بقول مصنفہ) 'صوبر کے سایے تلے' مشکل سے ۲۴ صفحات پر محیط ہے۔ناول 'جنگل کی آواز' ۱۲ صفحات پر --------اور تو اور ناول 'مانجھی' صرف ڈیڑھ صفحات میں سمٹ آیا ہے۔اسے ایک تجربہ تو کہا جا سکتا ہے لیکن ناول کا فن جو زمانی و مکانی وسعت اور متعلقہ وقوعوں کے ذریعہ فلسفیانہ نتائج تک پہنچانے کا عمل ہے ایسے تجربوں سے سیریاب نہیں ہو سکتا۔

رفیق ہارون کا ناول 'خزاں کے بعد' بھی مختصر ہے۔بیانیہ کے حجم اور واقعات کی پیش کش کے اعتبار سے اسے اگر طویل مختصر افسانہ نہ بھی کہا جائے تو بہر حال اسے ناولٹ کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے۔قصہ اکہرا ہے مگر دلچسپ رومانی کشش کا حامل ہے اس لئے عام قاری کے لئے اہمیت کا حامل ہے۔یہ ان معنوں میں رومانی تو نہیں ہے جہاں فنکار فطرت سے اپنی دلچسپی ایک نئی دنیا کی تلاش میں مناظر ماحول، حیرت انگیزی ماورائی فضا کی تعمیر اور کسی حیرت سے بھرپور اجنبی صورت حال سے مسحور کرتا ہے اور جسے انگریزی میں Romance کہا

جاتا ہے مگر چونکہ یہ محبت کے نرم ونازک، بے لوث اور الوہی جذبے پر مبنی ہے اور عشق بے ریا کی کیفیات ومحسوسات کا ترجمان ہے اس لیے بجا طور پر رومانی ہے۔ یہاں عشق اور ہوس کے فرق کی وضاحت بھی ہے۔ ناولٹ اپنی ساخت اور اپنے موضوع کے اعتبار سے اُردو کی روایتی عشقیہ کے زمرے میں آتا ہے۔

'خزاں کے بعد' کا تجربہ اور اس کی درجہ بندی کرتے ہوئے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ تخلیق آج سے کم وبیش پچاس برس پہلے منظر عام پر آئی ہے۔ ان پانچ دہائیوں میں عالمی سطح پر اور خود ہندوستان میں بھی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں، تہذیب بدلی ہے تو اقدار حیات بھی بدل گئے ہیں اور اسی کے اثر سے انسانی جذبات و محسوسات کی نوعیت میں بھی خاصا فرق آیا ہے۔ کلچر کی تبدیلی خاموشی کے ساتھ ہمارے جذبوں کو بھی متاثر کرتی رہتی ہے۔ سعید جیسا کردار تو ممکن ہے کہ آج بھی مل جائے لیکن شاید آج کے صارفی نظام میں مارگریٹ جیسی شخصیت ناپید ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ آج کی تیز رفتار اور مسائل بردوش دنیا میں اسلم جیسے رفیق صادق کا ملنا بھی مشکل ہے۔

یہ ناول نما تخلیق کلکتے کے مقبول عام روزنامہ 'عصر جدید' میں بالاقساط شائع ہوئی ہے اور اخبار پڑھنے والے اور ہلکے پھلکے رومانی قصوں سے لطف حاصل کرنے نیز جذبات کو متاثر کرنے والے واقعات اس طبقے کے لئے پسندیدہ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں خزاں کے بعد کے اپنے وقت میں قبولیت عام ضرور حاصل لی ہوگی لیکن ناول اپنی فلسفیانہ نتیجہ خیزی کی بنیاد پر لمبی زندگی حاصل کرتا ہے۔ اس ناولٹ میں یہ مسئلہ ایک بار پھر سر اٹھاتا ہے کہ کیا واقعی بدن کے بغیر محبت نیم جاں یا مردہ ہو جاتی ہے۔ اس خالص رومانی اور الہیاتی جذبے کو زندہ وتوانا رہنے کے لئے جسم کی پناہ گاہ لازمی ہے۔ فن پارنے، روحانی جذبے اور مادے کی اس کشاکش کے موضوع پر سوچنے کی دعوت ضرور دی ہے۔ سعید جیسی دولت بے بہا (خواہ وہ بگڑی ہی شکل میں کیوں نہ ہو) کی بازیافت پر مارگریٹ کے جذبۂ بے اختیار شوق کا فقدان جس کا شائبہ اسلم کے اس جملے سے ہوتا ہے کہ ''آپ کے لئے یہ خود آگئے ہیں مس مارگریٹ -------لیکن کیا گھر چلنے کا ارادہ نہیں ہے''؟ ایک pause پیدا کرتا ہے اور تھوڑی دیر

کے لئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ محبت ایک توانا اور وجیہ جسم کے بغیر بیمار بیمار سی رہتی ہے۔ لیکن عشق کا سچا جذبہ بہر حال حاوی ہو جاتا ہے اور ''مارگریٹ نے سعید کے بازو میں اپنا ریشمی بازو حائل کردیا۔'' اسی صورت حال نے رفیق ہارون کے اس بنیادی فکر کی لاج رکھ لی کہ محبت کا بے ریا جذبہ جسمانی ضرورتوں کے بغیر بھی زندہ و تابندہ رہتا ہے۔ مگر میں اپنی بات کیوں کر سوچتا ہوں کیا واقعی یہ ایک سچائی ہے؟ افلاطونی تصور کی اس تقدیس کو سلام کرنے کے باوجود میں اپنے آپ سے اکثر یہ سوال کرتا ہوں کہ آخر محبت اپنا گھر کہاں بناتی ہے؟ رفیق ہارون کا ناولٹ 'خزاں کے بعد' اس تجسس اور خلش کا ایک جواب فراہم کرتا ہے۔ میں ذاتی طور پر اس سے مطمئن ہوسکوں یا نہیں لیکن فنون لطیفہ اس التہاب کے بغیر عالم وجود میں نہیں آسکتے، زندہ نہیں رہ سکتے۔

(انتخاب۔۲۳ صفحہ ۸۷ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

نزہت طارق ظہیری

اُردو افسانہ نگاری کے موجودہ منظرنامے میں نزہت طارق ظہیری ہنوز کوئی بڑا نام نہیں بن سکی ہیں اور ناقدین وقارئین بالعموم معروف ناموں سے قریب ہوتے ہیں۔ تلاش وجستجو ان کا شیوہ نہیں ہوتا ہے۔ سامنے کے مناظر سے مطمئن ہوتے ہیں، مانوس رنگوں کے شیدائی ہوتے ہیں، نئے رنگ و آہنگ کی تلاش کا دردسر مول نہیں لیتے۔ غالب کی تاکید 'چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا' پر اس سہل انگار دور میں کتنے لوگ ہیں جو عمل کرتے ہیں..... جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں نئے talents کی آمد کا استقبال نہیں ہوتا۔ اس تجاہل وتغافل کے ماحول میں کسی روشن ستارے پر نظر بھی پہنچتی ہے تو بہت دیر سے۔ اس صورت حال کا شکوہ عام قارئین سے اس قدر نہیں کیا جا سکتا جتنا ناقدین اور ادب کے پارکھوں سے اس لئے کہ بہتر فن پاروں کے لئے قرأت کا ماحول پیدا کرنے کی ذمہ داری انہیں اہل نظر حضرات کی ہے۔ مگر مسئلہ یہیں ختم نہیں ہوتا اس لئے کہ اس صورت حال کے لئے خود فن کار کو بھی بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تخلیقی سرگرمی ایک متوازن تواتر اور تسلسل کی متقاضی ہوتی ہے۔ تخلیقی میدان میں معیار اور مقدار دونوں پیمانوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ یہاں 'یک لحظہ غافل می شوم صد سالہ راہم دور شد' کا ماحول ہوتا ہے۔ فن کار کو اپنے معیار اور تسلسل دونوں طریقوں سے اپنی شناخت کرانی پڑتی ہے۔

نزہت صاحبہ کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی کچھ وجہیں اوپر بیان کی گئی ہیں۔ ان کی تخلیقی سُست رفتاری جہاں خود ان کے لئے خسارے کا سبب بنی ہے وہاں ہم جیسے

قارئین جو عصری محسوسات وموضوعات پر مبنی اچھی کہانیوں کے متلاشی ہونے کے لئے بھی محرومی کا سبب بن گئی ہے۔ان کی گیارہ کہانیوں کا اولین مجموعہ'ایک روٹی ،سات پہاڑ'ان کی اصیل تخلیقی جولانی کا بہترین ثبوت ہے۔ان کہانیوں کے مطالعہ کے بعد میرے تاثرات کچھ یوں ہیں:

۱۔نزہت صاحبہ کی کہانیاں نیم سرمایہ دارانہ،اعلیٰ متوسط طبقے ،متمول اور مہذب قدیم خانوادوں کے ان وقوعوں کی بازیافت کرتی ہیں جن کے مختلف shades اُردو افسانوں میں وقفہ وقفہ سے نظر آتے رہے ہیں۔تخلیق کار کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے وقوعوں کی ندرت پر اصرار کرنے کی بجائے ان محسوسات کی ترجمانی وترسیل کی کوشش کی ہے جو بنیادی طور پر فن کا اصل مدعا ہونا چاہئے۔فنون لطیفہ کا اصل وظیفہ داخلی کیفیات کی ترسیل ہے۔خارجی وقوعے اور contents تو فنون لطیفہ میں صرف ایک وسیلے کا کام کرتے ہیں۔آرٹ جتنا thinner ہوجاتا ہے مواد وموضوع اور content کی اہمیت اسی قدر گھٹتی جاتی ہے۔ایک جنوین فنکار کی طرح نزہت طارق بھی اپنی کہانیوں میں ان کیفیات واحساسات کی ترجمانی کی کوشش کرتی ہیں جو چھوٹے چھوٹے عام واقعات میں کرداروں کے اندر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔یہ انہیں کبھی مسرور بھی کرتے ہیں اور کبھی مغموم بھی اور کبھی المیہ لمحوں میں بھی بشاشیت کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ (کہانی:گھر کا چراغ)

۲۔نزہت طارق نسائی مصائب وسائل اور ان سے پیدا ہونے والی کیفیات کی پر اثر ترجمانی کرتی ہیں۔اگر چہ وہ اصلاح معاشرہ بالخصوص مرد اساس معاشرہ میں عورتوں کے تحفظ ذات کی کوشاں ہیں اور عملی طور پر بھی وہ بعض ایسی تنظیموں سے تعلق رکھتی ہیں جو خواتین کے حقوق کے لئے سرگرم ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں مغربی کلچر سے درآمد شدہ feminism کی وہ تلخی وتندی اور مردوں کے خلاف خشمگیں تیور کا منفی رجحان نہیں ملتا۔وہ مسائل کو ہمدردی،سنجیدگی اور حکیمانہ سطح پر سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔اسی لئے ان کی کہانیوں میں وہ مناظر بھی مل جاتے ہیں جہاں خود خواتین ہی خواتین پر مظالم کا سبب بن جاتی ہیں۔ہونہار، اعلیٰ عہدے کے حامل بیٹے کی شادی میں اونچے مطالبات بالعموم ماؤں کی طرف سے ہوتے

ہیں اور ان کی عدم تکمیل کی صورت میں بہوئیں زیادہ تر ساسوں کے ذریعہ نشانہ مظالم بنتی ہیں۔بیٹیوں کے مقابلہ میں بیٹوں کی پیدائش پر مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی زیادہ خوش ہوتی ہیں بلکہ بچوں کی پرورش و پرداخت میں اکثر و بیشتر ماؤں کی زیادہ تر توجہ ،محبت اور جانثاری اولاد نرینہ کے لئے وقف ہوتی ہے۔نزہت معاشرے کے اس پہلو سے اچھی طرح واقف ہیں چنانچہ'چوڑیوں کی کھنکھناہٹ' کو چھوڑ کر ان تمام کہانیوں میں جہاں عورتوں کے مسائل و کیفیات کی پیش کش کی گئی ہے وہاں ہر جگہ ایک حقیقت پسندانہ،مصلحانہ اور تعمیری تصورات پیش کئے گئے ہیں۔نزہت معاشرے کے مضر اور منفی پہلوؤں کے بیان میں کسی خاص طبقہ کی مخالفت یا جانب داری کا رویہ نہیں اپناتیں۔موضوعات کو سمیٹنے کا یہ انداز بہت کم تحریروں میں ملتا ہے۔

۳۔نزہت طارق ظہیری نہ صرف یہ کہ کہانی میں ایجاز و اختصار کے فن پر پوری دسترس رکھتی ہیں بلکہ ان کی لسانی شگفتگی ایک اضافی خصوصیت کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ان کا بیانیہ سلیس اور پُرکشش ہونے کے ساتھ ہی ایسا سادہ بھی نہیں ہے کہ سپاٹ پن کا احساس ہو۔محاورات،ضرب الامثال،کنایات اور علامت کے استعمال میں ان کی تحریر کی دلکشی اور بے ساختگی مجروح نہیں ہوتی۔جگہ جگہ نسائی لب ولہجہ کردار کو زیادہ روشن کر دیتا ہے۔

۴۔ترقی پسندی،ذہنی بیداری،تعلیم کے فروغ اور توہم کے انسداد کے حوالے سے ان کی کہانیاں 'گھر کا چراغ''' نئی مسکراہٹ''،اتفاق''،حرف حرف چراغ' اور چاندی کا کٹورا' جدید افسانہ نگاری کی قد و قامت کو بلند کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔انہیں منہا کر کے مابعد جدید اُردو افسانے کے مثبت نشانات تلاش نہیں کئے جا سکتے۔ان کہانیوں میں نزہت نے اپنی شخصیت کے involvement کا جو تناسب قائم کیا ہے وہ ان کی بھرپور تخلیقیت کا غماز ہے۔

نزہت طارق ظہیری سے بس اتنی شکایت ہے کہ وہ کم اور بہت کم لکھتی اور چھپتی ہیں۔

(انتخاب۔۲۳ صفحہ ۹۰ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

☆☆

نجمہ محمود

نجمہ محمود کا ایک تازہ شناخت نامہ 'جنگل کی آواز' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ صرف ان کی ادبی تخلیقات کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس میں نجمہ کی تخلیقات کے بارے میں اہل الرائے قلم کاروں کی مختصر رائیں بھی ہیں۔ بعض تحریریں طویل ہیں، جو مقالات کے ضمن میں شائع کی گئی ہیں، کم و بیش ۵۰ صفحات پر مشتمل ان رایوں اور کتاب کے ابتدائی صفحات پر مصنفہ کے ۱۸ صفحات پر پھیلے ہوئے پیش لفظ سے نجمہ کے فکر و فن اور ان کے اسلوب و لہجہ کی شناخت میں مدد ضرور ملتی ہے لیکن ایک آزاد مشاہد کے لئے یہ باتیں زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ متن کا راست مطالعہ سب سے بہتر ہوتا ہے۔ نجمہ محمود ان خوش نصیبوں میں ہیں جن کے فکر و فن کے سلسلے میں بڑے چھوٹے متعدد اہل قلم نے اپنے مطالعات پیش کئے ہیں۔ یہ اتنی تعداد میں ہیں کہ ان پر مشتمل ایک الگ کتاب 'نجمہ محمود: شخصیت اور فکر و فن' یا اسی طرح کے کسی نام سے مرتب ہو سکتی ہے -------اور یہ کام ہونا چاہئے۔

نجمہ محمود ایک ایسی تخلیق کار ہیں جنہیں اُردو تخلیق کی مروجہ اصناف شعر و نثر میں سے کسی ایک صنف کے لئے مختص و محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے یہاں جس طرح شاعری اور نثر کی تفریق بے معنی نظر آتی ہے اسی طرح ناول، افسانے اور اس نوع کی دوسری بیانیہ تحریروں کی علیحدہ پہچان کے کوئی معنی نہیں۔ ایک اصیل فن کار ہیئتوں کا غلام نہیں ہوتا۔ نجمہ کا غیر معمولی تخلیقی فشار بنے بنائے چوکھٹے میں مقید نہیں رہ سکتا۔ غالب نے بہت پہلے یہ بتا دیا کہ

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

نجمہ کا سیل فکر و احساس پابندیاں قبول نہیں کرتا، تخلیقی تحریروں کی جو تقسیم کہانی 'تذکرے' افسانے اور ناول کے عنوانات کے تحت کی گئی ہے اسے رسمی ہی کہا جا سکتا ہے۔ ایسا تو محض ان لوگوں کی تسلی کے لئے کیا گیا ہے جو خمار رسوم و قیود میں بتلا رہتے ہیں۔ کہانی اور افسانے کی الگ الگ صنفی تقسیم کا معاملہ بھی سمجھ میں نہیں آتا، نجمہ کی طرح کچھ اور لوگ بھی ہوں گے جو کہانی کو افسانے سے الگ کوئی صنف تصور کرتے ہوں گے۔ بات تو صرف یہ ہے کہ اُردو میں جس صنف کو افسانہ کہتے ہیں اسی کو ہندی میں کہانی کہا جاتا ہے۔ ویسے اس علیحدہ صنفی شناخت سے ہٹ کر دیکھا جائے تو کہانی دراصل واقعات کے اس تانے بانے کو کہتے ہیں جو افسانے، ڈرامے اور ناول جیسے تمام بیانیہ میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح موجود ہوتے ہیں۔ خواہ کسی نثری تحریر میں ہو وہ کہانی ہے۔ کہانی تو ایک Raw material story element ہے کہ اس کے بغیر کوئی نثری تخلیق وجود میں نہیں آسکتی۔ مجھے الجھن ہوتی ہے جب بعض اُردو والے افسانے کے ہم معنی ہندی کے لفظ 'کہانی' کو ایک الگ صنف ماننے پر اصرار کرتے ہیں۔ اس ضمن میں نجمہ محمود سے بھی گفتگو کی جا سکتی ہے۔

خیر یہ نکتہ تو جملہ معترضہ کے طور پر آگیا ہے۔ بات چل رہی تھی نجمہ کی تخلیقی یورش کی۔ ان کا تخلیقی ابال ہیئتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ان کے افسانوں میں ایک پُر سکوت فضا کا احساس ہوتا ہے جہاں کسی سماوی اور الوہی وجود کا شائبہ ہوتا ہے، جہاں پہنچ کر قاری اپنے وجود کی گہرائیوں سے ہمکنار ہونے لگتا ہے۔ نجمہ مابعد الطبیعیات اور ماورائی احساسات کی خوبصورت ترجمانی کرتی ہیں۔ اس مادی دنیا سے پرے ایک جہانِ بے گمان کی تلاش اور کسک ان کی تحریروں میں ایک ایسی سحر انگیز کیفیت پیدا کرتی ہے جو حجاب امتیاز علی کے اسلوب سے ادنیٰ مماثلت کے باوجود ایک منفرد تیور اور سماوی سرور پیدا کرتی ہے۔ نجمہ محمود نے ایک فن پارہ 'جنگل کی آواز' کے عنوان سے پیش کیا ہے، یہی نام انہوں نے اپنی کتاب کا بھی مقرر کر لیا ہے لیکن ان کی تخلیقات کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ ان کے یہاں وہ ماحول نہیں بنتا جہاں وحوش و طیور کی بے ہنگم آوازیں سنائی دیں۔ شور و شغب، خوف اور سراسیمگی کی بجائے نجمہ کے یہاں ایک پُر سکون ملکوتی وجود کا احساس ہوتا ہے جس کی وجہ سے روحانی

بشاشت واہتزاز کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی پا لینے کا ماحول ملتا ہے۔ ان کے کردار بولتے کم ہیں لیکن احساسات کو پیہم جگاتے رہتے ہیں۔ ان کہانیوں میں واقعات سے زیادہ محسوسات کا عمل دخل ہے۔ Story element کی کمی نجمہ کے یہاں خود کلامی کی خصوصیت کے ذریعہ پوری ہوتی ہے۔ اصیل تخلیق کا جوہر مرکزے میں رہتا ہے۔ وہیں سے اپنے وجود کا اثبات کراتا ہے۔ ان کے یہاں روحانی شیفتگی آدمی کو انسان بنانے کے لئے ایک ایسا نسخہ کیمیا عطا کرتی ہے جس پر مذہب سے زیادہ Theosophical concept کا احساس ہوتا ہے۔ سماجی واخلاقی موضوعات اور ان کی قدروں کی یافت نجمہ کے یہاں وقوعوں کے تنوع یا وسعت سے مرتب نہیں ہوتی بلکہ یہ کردار کے In-born ethical value کی زائیدہ ہوتی ہے۔ نجمہ کا فن اکتساب کا رہین منت نہیں فیضان کا مظہر ہے۔ وہ نا قابل تقلید بھی ہیں اور غیر مقلد بھی۔

(انتخاب۔۲۳ صفحہ ۹۲ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

☆☆
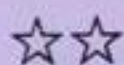
ڈاکٹر اشرف جہاں

بہار کی خواتین قلم کاروں میں ڈاکٹر اشرف جہاں کے نام اور کام کو ہنوز وہ استحکام حاصل نہیں ہوسکا جس کی وہ مستحق ہیں حالانکہ وہ تسلسل کے ساتھ لکھتی رہی ہیں۔تنقید، تحقیق اور تخلیق تینوں شعبوں سے ان کی دلچسپی قائم رہی ہے۔انہوں نے شاد عظیم آبادی کے ناولٹ 'صورۃ الخیال' (ولایتی کی آپ بیتی) کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ان کے افسانوی مجموعے 'شناخت' اور 'اکیسویں صدی کی نرملا' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ان کی طنزیہ تحریر پر مبنی ان کی کتاب 'ہم اُردو کے ٹیچر ہوئے' شائع ہو چکی ہے۔ان کی خالص تنقیدی تحریروں میں ایک تفصیلی مقالے، ''تاریخ اُردو ادب اٹھارہویں صدی سے بیسویں صدی تک' کے علاوہ 'اُردو افسانے کا بدلتا مزاج، کے عنوان سے ایک مستقل کتاب ارباب علم کے مطالعے سے گزر چکی ہے۔اپنی تدریسی مصروفیات، شعبۂ اُردو پٹنہ یونیورسٹی کی صدارت اور دوسری گھریلو ذمہ داریوں کے باوجود وہ ہنوز لکھنے لکھانے اور چھپنے چھپانے کے سلسلے میں سنجیدہ ہیں۔ان تمام باتوں کے باوجود، ہم عصر قلم کاروں میں ان کی عدم شہرت ومقبولیت کے اسباب پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اُردو ادب کی وسیع وعریض دنیا میں انہوں نے اپنی کارگزاریوں کی پیش کش کے لئے محدود خطوں کا انتخاب کیا ہے۔ان کی تحریریں عام طور پر روزنامہ، قومی تنظیم، دھنک رنگ، ماہنامہ 'بہار' ماہنامہ، زبان وادب، 'شاعر، ماہنامہ شہپر، ماہنامہ 'حریم' وغیرہ میں شائع ہوتی رہی ہیں اور اس طرح ایک محدود ومخصوص حلقہ ٔ قارئین کے ذوق کی آبیاری کرتی رہی ہیں۔افتخار امام صدیقی مدیر شاعر کے اس رجحان کا لوگ اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے اُردو ادب کے

فروغ میں خواتین کی خدمات نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طبقے کو main stream میں لانے کی مسلسل جدوجہد کی ہے۔ ڈاکٹر اشرف جہاں کی بیشتر تخلیقی تحریریں بھی اسی وسیلے سے روشناس خلق ہو سکی ہیں۔ اشرف جہاں کے مزاج کے استغنا، کسر نفسی اور کسی حد تک بے نیازی نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ قارئین کے دیگر حلقوں سے خراج تحسین حاصل کریں۔

ڈاکٹر اشرف جہاں کی تحقیقی، تجزیاتی اور تنقیدی تحریریں ان کی وسعت مطالعہ کا ثبوت فراہم کرتی ہیں اُردو ادب کے ارتقا کی تاریخ اور اس کی مبادیاتی اطلاعات مرتب کرنے کا کام انہوں نے بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ اس سے ادب کے طلبا تو کیا اساتذہ اکرام کو بھی استفادے کا موقع ملتا ہے۔ اپنی کتاب 'اُردو افسانے کا بدلتا مزاج' میں انہوں نے اُردو افسانے کے صد سالہ سفر کو اس اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس میں اس عرصے کے تمام رجحانات ومیلانات کا تعارف ہو جاتا ہے۔ اس جائزے میں اُردو افسانے کے آغاز، اس کی روایتوں کی تشکیل، سیاسی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کے ساتھ رویے کی تبدیلی، موضوعات واسالیب کے تنوع، ترقی پسند تحریک، اس کی خصوصیات جدیدیت اور اس کے امتیازات، نیز مابعد جدیدیت ----غرض نہایت اختصار کے ساتھ تمام پہلوؤں کو روشن کر دیا ہے۔ قارئین کے لئے جملہ اطلاعات کی منتقلی کا یہ انداز اس لئے بھی پسندیدہ ہو سکتا ہے کہ اپنے نجی تاثرات سے ہٹ کر اشرف جہاں نے ان نکات پر توجہ دی ہے جن کے حصول کے لئے قاری کو متعدد ضخیم کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے ادب کے اعلیٰ درجات کے طالب علموں کے لئے یہ کتاب خاصی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اشرف جہاں نے اس کتاب کی تسوید وترتیب پر بہت محنت کی ہے۔ تحریکات اور رجحانات کے تاریخی مطالعے کے علاوہ انہوں نے کئی اہم موضوعات پر لکھے گئے افسانوں اور ان کے خالقین کے تخلیقی رویوں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ دہشت گردی، ہجرت، نسائی تحریک کے بدلتے تیور، ریپ، عورتوں کی نفسیات، دور حاضر کے نئے سماجی سروکار پر بھی اشرف جہاں نے بنیادی اور ضروری نکات پیش کر دیئے ہیں۔ اُردو میں منی کہانی کی ایک مختصر تاریخ بھی موجود ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے یہ

کتاب لکھ کر اُردو افسانوں کی تاریخ اور اس کے تنوع کے شائقین کو بڑی مشقتوں سے بچالیا ہے۔کوزے میں سمندر سمونے کا یہی ہنر ان کے مقالے 'تاریخ اُردو زبان وادب اٹھارہویں صدی سے بیسویں صدی تک' میں بھی ملتا ہے۔ یہ مقالہ ان کی ایک دوسری کتاب 'ہم اُردو کے ٹیچر ہوئے' کے آخری حصے میں شریک کیا گیا ہے۔ حالانکہ مذکورہ بالا کتاب اُردو تدریس وتعلیم کے موجودہ انحطاط پر طنزیہ وفکاہیہ تحریر کی حیثیت رکھتی ہے۔اس میں سنجیدہ مقالے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

ڈاکٹر اشرف جہاں کی ادبی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کی افسانہ نگاری بھی ہے۔ 'اکیسویں صدی کی نرملا' میں مجموعی طور پر ان کے سماجی شعور کی بالیدگی اور زوال اقدار کے سلسلے میں ان کی فکر مندی کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ بیشتر کہانیاں متوسط طبقے میں عورتوں کی بے بسی کی روداد پیش کرتی ہیں۔ روایتی انداز کی خامیوں کی نشاندہی بھی ہے۔جس کی وجہ سے عورتیں مظالم کو مقدر سمجھ لیتی ہیں۔ یہاں نسائی تحریک کی بھرتی لہر تو نہیں لیکن نئے تہذیبی ڈھانچے میں عورتوں کو اپنے مقام اور مرتبے کا بار بار احساس دلانے والی کہانیاں ایک انقلاب کی شائستہ ترغیب دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جب مریم فراز سے یہ کہتی ہے کہ ''خبردار مجھے ایسی جاہل گنوار عورتوں سے جو سماج کے بنائے ہوئے اصولوں کی چتا پر جل جاتی ہیں نفرت ہے مجھے نرملا کے کردار سے'' تو اندازہ ہوتا ہے کہ آج نسائیت کے باب میں عورتوں کی اجتماعی نفسیات میں کتنی تبدیلی آچکی ہے۔ (مجموعے کی ٹائٹل کہانی)

اشرف جہاں نے جدید دور کے صارفی نظام سے اپنی اکتاہٹ اور بیزاری کا اظہار بھی کیا ہے جہاں انسانی رشتے رفتہ رفتہ کمزور ہوتے جارہے ہیں۔شہناز کو اس کا کرب اس وقت محسوس ہوتا ہے جب اس کا بیٹا ارشاد اس سے دور رہتا ہے اور اسے اپنی محبت نہیں دے پاتا۔ یہاں تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہے۔ شہناز کا شوہر راغب بھی اپنی مصروفیت کی وجہ سے اپنی ماں کی ملاقات سے محروم رہتا تھا۔ ایک عورت اپنے ذاتی تجربے سے دوسری عورت کے دکھ کا اندازہ لگا سکتی ہے۔(افسانہ: احتساب) نئے ورلڈ آرڈر نے انسان کے جذبات و محسوسات پر جو کچوکے لگائے ہیں اشرف جہاں ان سے حد درجہ متاثر ہوتی ہیں۔اس صورت

حال نے ان کی کئی نسائی کرداروں پر ناسٹلجیا کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ دور ہوتے ہوئے ماضی کا کرب ان کے افسانے 'یہاں میں اجنبی ہوں' میں شدت کے ساتھ محسوس ہوتا ہے۔

اشرف جہاں کے بیشتر افسانے نسائی محسوسات کے ترجمان ہیں 'صحرا کا سفر' نائن الیون' تمام عمر مسافر سفر میں رہتا ہے، بدر کامل، کرن اور دوسری کہانیاں ان کے اس تخلیقی رویے کی پہچان ہیں۔

اشرف جہاں کے یہاں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ خود اپنے افسانوں کی کردار بن جاتی ہیں۔ انہیں ان کرداروں سے الگ کرنا آسان نہیں۔ فن کار جب خود کرداروں کے جذبات سے لت پت ہونے لگتا ہے تو کہانی سر گزشت بننے لگتی ہے۔ ہر فنکار قرۃ العین حیدر یا بیدی تو بن بھی نہیں سکتا جو یہ جانتا ہو کہ کہانی میں فن کار کے جذباتی involvement کا تناسب کیا ہونا چاہئے۔ اشرف جہاں یہ فاصلہ maintain نہیں کر سکتی ہیں۔ اس کی وجہ سے اکثر ان کے یہاں محسوسات کی سطح پر یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے وہ بات یاد آ رہی ہے کہ کسی نے علامہ اقبال سے کہا تھا کہ آپ کی شاعری اسلام، الٰہیات اور ملت کی ذہنی و روحانی رفعت کی اس قدر موثر ترجمان ہے لیکن آپ عملی طور پر ارکان فرائض کی ادائیگی سے اس درجہ شغف نہیں رکھتے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے۔ اقبال نے جواب دیا تھا کہ محفل سماع میں لوگ وجد وکیف اور جذب وحال میں آجاتے ہیں لیکن اگر یہی کیفیت قوال پر بھی طاری ہو جائے تو پھر محفل کیسی رہے گی۔ تخلیق کار کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو متاثر کرے نہ کہ خود جذبات سے مغلوب ہو جائے۔ اشرف جہاں کو اس مجاہدے سے گزرنا ہے۔

(انتخاب۔ ۲۴ صفحہ ۳۷ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆

پریم کرن

اُردو شاعری کی مملکت پر ہر دور میں غزل کا قبضہ رہا ہے۔اس کی صنفی خصوصیات کی وجہ سے زیادہ تر شعرا اس صنف کو پسند کرتے رہے ہیں۔ ماضی سے لے کر آج تک نہ صرف یہ کہ غزل گو شعرا کی کثرت رہی ہے بلکہ غزل سننے اور پسند کرنے والے سامعین وقارئین کی تعداد بھی ہمیشہ غالب رہی ہے۔غور کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ غزل کی ہر دلعزیزی کا راز یہ ہے کہ اس میں کم سے کم الفاظ کے ذریعہ انسانی محسوسات ومشاہدات کے کسی متحرک منظر کو پیش کیا جاسکتا ہے۔غزل اشارے اور کنائے اور دوسری شعری خوبیوں کی وجہ سے شاعروں کے لئے بھی محبوب رہی ہے اور پڑھنے والوں کے لئے بھی۔غزل تفصیل کی بجائے اجمال کا فن ہے یہاں ایجاز واختصار سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی جادوگری کا نام ہے جو سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مماثل ہے۔غزل نیم گفتنی کا آرٹ ہے یہاں نصف بات کہہ کر قاری یا سامع سے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان مشاہدات ومحسوسات کو اپنے طور پر مکمل کرلے گا جو فنکار کا مدعا ہے۔یہی وجہ ہے کہ غزل کے اشعار اکثر وبیشتر تشریح کے طالب ہوتے ہیں اور تشریح کے عمل میں شارح یا ذہین قاری متن سے نئے مفاہیم ومعانی بھی تلاش کرلیتا ہے۔گویا صنفی طور پر غزل ذہین قاری یا سامع سے اس کی اختراعی صلاحیت کے مظاہرے کی دعوت بھی دیتی ہے۔

آج غزل کے عاشقوں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ان میں ایسے بھی ہیں جو عاشق صادق کہے جانے کے حقدار ہیں اور ایسے بھی ہیں جن کے سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ:

ہر بو الہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

شاعروں کی اس بھیڑ بھاڑ میں اہل ہنر کی شناخت بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ اول تو یہ کہ غزلیہ شاعری پر مشتمل اتنے سارے مجموعوں کی اشاعت ہو رہی ہے کہ ان سبھوں کا تفصیلی مطالعہ مشکل ہے پھر یہ ہے کہ ہزاروں ہزار غزلوں میں موضوعاتی تکرار کی بھی بھرمار ہے۔ تھوڑے سے لفظی تغیر کے ساتھ مختلف شعرا ایک ہی مضمون کو باندھتے چلے آرہے ہیں۔ یہ سلسلہ پہلے بھی تھا اور آج بھی قائم ہے۔ اس کی وجہ سے عام طور پر غزل پڑھنے میں اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے شعرا کے اچھے اور دلنشیں اشعار بھی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

میں نے پریم کرن کے مجموعۂ غزلیات 'زہراب' کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ نہایت کامیاب غزل گو ہیں اور آج کی ترقی یافتہ اُردو غزل کے معیار کے مطابق ان کی غزلیں عوام وخواص سے داد و تحسین حاصل کر سکتی ہیں۔ وہ غزل گوئی کے ہنر میں اوسط منزل میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ غزلیہ شاعری نئے نئے موضوعات کی پیش کش کی بنیاد پر اہمیت اختیار نہیں کر سکتی بلکہ غزل کو جو چیز مستحکم اور دلنشیں بناتی ہے وہ ہے فنکار کا اپنا منفرد لہجہ۔ جو فنکار جب اپنے اسلوب پر قادر ہو جاتا ہے اور ایک نئے لہجے پر دسترس حاصل کر لیتا ہے وہ یقیناً غزل گویوں کی بھیڑ میں پہچانا جاسکتا ہے۔ پریم کرن نے اس جادۂ دشوار پر قدم رکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس کے خدشات بلکہ خطرات سے بھی واقف ہوں گے۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ بعض فنی خامیوں کے باوجود پریم کرن کی شاعری ایک نئی آواز بننے کی کوشاں ہے۔ آج کی اُردو غزل لسانی اعتبار سے بہت بدل چکی ہے۔ خاص طور پر ہندوستان میں کہی جانے والی غزلیں لفظیات کے اعتبار سے نئے تشکیلی نظام کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ نیا نظام اپنے ساتھ کچھ خامیاں بھی لاتا ہے اور کچھ خوبیاں بھی۔ ہنرمند فنکار نئے لہجے اور ڈکشن کی یافت میں اس کے خوشگوار پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ پریم کرن کے مجموعۂ کلام،

زہراب' کے مندرجہ ذیل اشعار کے ذریعہ ان کے لہجے کی پہچان کی جا سکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

سب کی اپنی الجھنیں ہیں سب کے اپنے مسئلے ہیں
آدمی کی بھیڑ میں ہر آدمی تنہا ملا
بلاتے ہیں کرن پیڑوں کے سائے
مگر ذوق سفر جاگا ہوا ہے
کہیں ساحل کہیں کشتی کہیں دریا ہو جاؤں
مجھ کو جس روپ میں تو چاہے میں ویسا ہو جاؤں
پستی اور بلندی میں ہے کتنا نمایاں فرق
جھانک رہا ہے میرے گھر میں ہمسائے کا گھر
کبھی دامن جھٹکتے تھے جنہیں ہم دیکھ کر اکثر
وہ جگنو اب اندھیرے میں ہمیں رستے دکھاتے ہیں
ایک پرندے کا لہو طوفان لے کر آئے گا
آگ بن جائیں گے یہ کاٹے ہوئے شہپر کبھی
مجھ سے اور میری انا سے صلح ممکن ہی نہیں
قد کبھی لمبا ہوا، چھوٹی ہوئی چادر کبھی
اک پتھر ہی سمجھتا ہے زبان تیشہ
کل جو گونگا تھا وہی بول پڑا ہے مجھ سے
ہم غور سے دشمن کی طرف دیکھ رہے ہیں
احباب کا پھینکا ہوا پتھر نہیں دیکھا
سچائی کو خوابوں کے برابر نہیں رکھا
شیشے کے مکان میں کبھی پتھر نہیں رکھا
اگتا ہوا سورج تو مصور نے دکھایا
تصویر میں جلتا ہوا منظر نہیں رکھا

یہ سچ ہے کہ مجھے رسم غلامی نہیں آتی
دہلیز کسی کی ہو کبھی سر نہیں رکھا
کیوں آپ ہنر اپنا نمایاں نہیں کرتے
پھولوں نے تو خوشبو کو چھپا کر نہیں رکھا
اپنی تہذیب کو ہم کیسے بچائیں آخر
کوئی رستہ تو ملے گاؤں کو جانے والا

پریم کرن کے ان اشعار سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہمہ جہت تجربات کی پیش کش پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔اقبالؔ نے ایک جگہ کہا ہے کہ:

چشم دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے نقاب

پریم کرن خارجی حقائق کو'چشم دل' سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس پر قدرت حاصل کرنے کے لئے جس طویل تخلیقی سفر کی ضرورت ہے پریم کرن کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

(انتخاب۔۲۴صفحہ ۶۷ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆
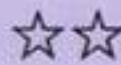
ابھئے کمار بیباکؔ

اگر میں یہ کہوں کہ کوئی شاعر غزل کے اشعار اپنے طور پر نہیں کہتا بلکہ یہ خود اپنے آپ کو کہلوائے لیتے ہیں تو یہ بات بظاہر کچھ عجیب سی لگتی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اس میں ایک بنیادی سچائی دکھائی دیتی ہے۔ دراصل غزل کے اچھے اشعار الفاظ کے وسیلے سے عالم وجود میں تو آتے ہیں لیکن سچے اور اچھے اشعار الفاظ کے معنوی حدود کو توڑ کر بے ساختگی اور حددرجہ روانی کی ساتھ نئی معنوی فضا پیدا کرتے ہوئے خود بہ خود وارد ہو جاتے ہیں۔ یہ بے ساختگی اور والہانہ پن اکثر وبیشتر فنکار کی مشقت اور مجاہدے سے باہر کی چیز ہوتی ہے۔ یہ نکتہ اکثر وبیشتر مجھے جناب ابھئے کمار بیتابؔ کے شعری مجموعے 'خمار خواب' کے مطالعے کے دوران ابھرتا رہا ہے۔ ان کے یہاں غزل گوئی کا ایک حیرت انگیز غیر صناعانہ منظر نامہ دکھائی دیتا ہے اوران کی یہی خصوصیت انہیں اپنے معاصرین میں ایک منفرد شناخت دلاتی ہے۔

جہاں تک جناب بیباک کے شعری موضوعات کا مسئلہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس مجموعۂ کلام میں وہ سارے مسائل وموضوعات پیش ہوئے ہیں جن سے ایک باشعور اور باخبر فنکار متاثر ہوتا ہے لیکن میں پھر یہی بات کہوں گا کہ شاعری بالخصوص غزل میں موضوعات کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی فنکار کے انفرادی اسلوب کی۔ فنکار کے پاس اپنا لہجہ ہو تو پھر معمولی موضوعات بھی وجہ کشش بن جاتے ہیں اور فنکار کی بے ہنری موضوعات کی اہمیت کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ جناب بیباکؔ نے عصری موضوعات کو اپنے جس اصیل تخلیقی لہجے کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی وجہ سے ان میں ایک خاص چمک اور کشش پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی شاعری میں

عہد حاضر کے وہ تمام اندیشے اور تردد اور اس کی وجہ سے فکر مندی اور غمزدگی کے تیور موجود ہیں جن سے ایک صاحب فکر فنکار کو واسطہ پڑتا ہے۔ احتجاج، دنیا کو بدلنے کا خواب، انسانی معاشرے کی تخریب پر آزردگی، سیاسی اور سماجی سروکار، خود غرضی، احسان فراموشی، نیکی اور بدی کا مجادلہ، روشنی اور تیرگی کی جنگ، منفی رجحان کے خلاف ایک مستحکم آواز، اہل سیاست کی دراز دستیاں اور مقہور و مجبور افراد کا کرب یہ سب ابھئے کمار بیباکؔ کی تخلیقی بساط کے وہ موضوعات ہیں جو اگرچہ کئی دیگر فنکاروں کے یہاں مل جاتے ہیں لیکن جو بات بیباکؔ کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان مسائل و موضوعات کو انہوں نے صرف موضوعاتی سطح پر نہیں برتا ہے بلکہ انہیں اپنے احساسات کی گہرائیوں میں لے جا کر ایک مخصوص اشاراتی نظام کے ذریعہ فنی پیکر عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ خارجی موضوعات ان کے فکر و شعور کی سطح سے ان کے اندرون میں داخل ہو کر احساسات کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے مختصر 'پیش لفظ' میں اپنی شاعری کی موضوعاتی بنیاد پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ لکھا ہے:

> ''عہد حاضر میں مٹھی میں مقید ہوتی دنیا، درکتے انسانی رشتے، پامال ہوتیں اعلیٰ قدریں، معاشرتی و سیاسی حالات میں تیز تر ہوتیں تبدیلیاں، معاشی فکر و تردد، تکنیک کا اعجاز جس کے توسط سے قدرت کو چونکا دینے والی انسانی تدبیریں، تعمیرات کی بلند ترین ترکیبیں، انٹرنیٹ کے آسمان پر جگمگاتے اطلاعات کے ستارے اور ان سب کے ساتھ ساتھ جڑیں جماعتی فرقہ واریت، لسانی اور علاقائی تشدد، ذات کی مستحکم ہوتیں دیواریں، دہشت گردی کے ایجاد ہوتے نئے نئے روپ، حکام و خدام کی رگوں میں دوڑتی بدعنوانی، بین الاقوامی سطح پر سرحدوں کی بے حرمتی، عالمی دائرے میں تاریکی کی طرف مسلسل پھیلتی مایوسی اور اجنبیت، دبی سہمی سی امیدیں، اخلاق و مروت اور انسانیت کے جذبوں کا انحطاط۔''

یہ سارے امور بیباکؔ کے یہاں تخلیقی جمال آرائیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ لیکن ہر جگہ موضوعات کی پیش کش میں ان کی انفرادیت نظر آتی ہے۔ احتجاج اور نفرت و بیزاری کے

جذبات کو انہوں نے عام طور پر ایسے دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے جس سے موضوع کی درشتگی اور سختی کی بجائے نرمی اور حلاوت کا احساس ہوتا ہے لیکن موضوع قاری کے ذہن و دل میں تادیر قائم رہ جاتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:

امیر شہر کی نیندیں نہ اڑ جائیں تو کہنا
تمہارا ایک بھی سپنا اگر بیدار ہو جائے

یا

مرا دیا ہے مقابل چراغ شاہی کے
میں جانتا ہوں کہ آثار ہیں تباہی کے

یا

میں خواب دیکھ رہا ہوں اس احتیاط کے ساتھ
عتاب صبح سے سپنا لہو لہان نہ ہو

بیباکؔ نے زندگی کی تلخیوں کو عام طور پر تبسم ریز لہجے کے ساتھ بیان کیا ہے اس سے ان کی اس فطری ہنر مندی کا اندازہ ہوتا ہے کہ بالعموم انہوں نے اپنی درد انگیزیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

مسکرانا ہماری عادت ہے
غم تو دل میں کہیں پہ رکھتے ہیں

انہوں نے ہجرت کا ایک ایسا تصور پیش کیا ہے جس کی تصدیق و تائید اہل دل حضرات ہی کر سکتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

یادوں کے سوا چھوڑ کے جانا ہے سبھی کچھ
گھر بار لئے پھرنے سے ہجرت نہیں ہوتی

بیباکؔ نے گھر کی عظمت اور روحانی آسودگی کو ایک زاویہ فکر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا شعر:

گھروں سے اگر گھر کے معنی نکلتے
تو ہم چھوڑ دیتے بیاباں میں رہنا

انہوں نے منفی صورت حال میں کچھ مثبت نقوش پیدا کر کے زہراب کو بھی خوشگوار بنانا چاہا ہے اور یوں شاعری کے ذریعہ زندگی کی صعوبتوں کو آسان تر بنا دیا ہے۔ان کا یہ شعر دیکھئے:

صحرا، سراب تشنہ لبی، دھوپ کی تپش
کیا کچھ نہ تھا شریکِ سفر، یاد کیجئے

اس طرح 'خمار خواب' کا مطالعہ کیا جائے تو بالکل انوکھے اور دلنشیں لہجے کی شاعری سامنے آتی ہے۔بیباکؔ نے نہایت خوشگوار طریقے سے الفاظ کے نظام بدل کر ایک نئے تخلیقی لہجے کی بازیافت کر لی ہے۔ان کے مندرجہ ذیل اشعار میرے تجزیے اور محاکمے کو آسان بنا دیں گے،اس کا مجھے یقین ہے۔

محبت دل کی گلیوں میں اتر کر
خرد کے سب دریچے کھولتی ہے

آئینہ تم نے دکھایا ہے ہمیشہ ہم کو
کوئی موقع بھی دیا ہوتا سنورنے کے لئے

داستاں اپنی سنائی آپ نے
میرا قصہ کیوں بیاں ہونے لگا

بات بڑھے گی کیسے آخر
لفظوں کو مبہم ہونے دے

پتھروں پر ہمیشہ لکھے گئے
آئینوں کے نصیب دنیا میں

ہو نہ جاؤں میں بے حسی کا شکار
تجھ سے ملتا رہوں جدا بھی رہوں

دکھ تو بیباکؔ دل کے پنچھی ہیں
لب پہ آئے تو چہچہانے لگے

اس معیار کے حامل اور ایسے تازگی بردوش اشعار ابھئے کمار بیباکؔ کے یہاں بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔عام طور پر کسی فن پارے کے نقائص بیان کرنا تو سہل ہوتا ہے لیکن اس کے حسن کا تجزیہ دشوار ہو جاتا ہے۔کچھ لوگ تو بازعم خویش تنقید کے کام کو غلط یہ لفظ، یہ بندش بری، یہ مضمون سست، بتا کر آسان بنا لیتے ہیں۔ابھئے کمار بیباکؔ کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے میں اسی کیفیت سے دوچار ہو رہا ہوں اور یہ کہہ کر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ

دامانِ نگہہ تنگ و گل حسنِ تو بسیار

(انتخاب۔۲۴صفحہ ۸۰سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆

خالد جاوید

خالد جاوید کئی تخلیقات و مطبوعات کے مصنف ہیں۔ 'برے موسم میں'، 'تفریح کی ایک دوپہر'، 'آخری دعوت' اور 'نیند کے خلاف ایک بیانیہ' کے علاوہ مصنف کی ایک تازہ کتاب 'موت کی کتاب' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اسے 'ناول' کہا گیا ہے۔ ابھی اس کتاب نے سنجیدہ قارئین، ناقدین اور دانشوروں کی توجہ اپنی طرف نہیں کھینچی ہے لیکن تعجب نہیں کہ یہ کتاب جلد ہی ادب میں بحث کا موضوع بن جائے۔ اس پر اب تک چند حضرات کے تاثرات سامنے آئے ہیں۔ ان میں مثبت اور منفی رائے پیش کی گئی ہیں۔

قرأت کی تمام تر دشواریوں کے باوجود میں نے 'موت کی کتاب' کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی کارنامے پر کسی بڑی شخصیت کے بے پناہ تحسینی کلمات سامنے آجاتے ہیں اور میں اپنے کو ان خیالات سے متفق محسوس نہیں کرتا تو مجھے اپنی علمی بے بضاعتی اور بدذوقی کا احتمال ہونے لگتا ہے۔ میں نے اس کتاب کا مطالعہ دوبار کیا ہے۔ پہلی قرأت میں تو میں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس کے content اور فنکار کے تخلیقی رویے سے لطف حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ دوسری قرأت میں اس کی تفہیم و تجزیے کے سلسلے میں سر کھپاتا رہا۔ چلیے یہ مان کر چلتے ہیں کہ یہ ایک ناول ہے لیکن یہ مان لینا اس لحاظ سے کافی نہیں کہ اس کے معائبات کئی سوالات ابھرتے ہیں۔ ناول کیا ہے اس میں انفرادی یا اجتماعی زندگی کی سچائیوں کو کس نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ ناول ہمیں دانش و آگہی کے کن پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ ناول انفرادی یا اجتماعی زندگی کے صد جہت

پہلوؤں میں سے ایک آدھ پہلوؤں کو روشن کرنے کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہے۔ یہ کسی ایک کردار کو نمایاں بھی کر سکتا ہے، کبھی سوانحی حالات پر مشتمل بھی ہو سکتا ہے، کبھی یہ سیاسی سماجی منظر نامہ پیش کرتے ہوئے طبقاتی کشاکش کی صورت حال بیان کر سکتا ہے، کبھی نفسیات کی گہرائیوں میں لے جا کر زندگی کی بعض سچائیوں سے روشناس کر سکتا ہے، کبھی فلسفے کی گتھیوں کے درمیان، ہمیں فکر کا کوئی ضابطہ عطا کر سکتا ہے۔ غرض ناول میں کوئی بھی موضوع پیش ہو سکتا ہے لیکن بہر حال یہ ضروری ہے کہ ناول ہمیں کسی نہ کسی نتیجہ تک پہنچائے۔

اس تمہید کو سامنے رکھتے ہوئے 'موت کی کتاب' کا مطالعہ کیا جائے تو کسی نتیجہ تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ مصنف کی تخلیقی جدت طرازی کا ایک قدرے خوشگوار اور انوکھا رویہ تو یہ نظر آتا ہے کہ انہوں نے اسے ابواب میں تقسیم کرنے کی بجائے نہایت مختصر تحریروں کے چھوٹے چھوٹے حصوں کو 'ورق' کا نا دیا ہے۔ اس طرح پوری کتاب انیس اوراق پر مشتمل ہے۔ بیسواں اور آخری ورق، سادہ رکھا گیا ہے۔ ان پورے اوراق یا ابواب میں قاری کہانی کے سرے تلاش کرنے اور بے ربط بیانات کو جوڑنے کی کوشش میں ہلکان ہو جاتا ہے۔ اکثر مرکزی کردار اکڑو بیٹھا رہتا ہے۔ پہلے ورق میں کردار کی ماں کا ڈھول اس کے مریاشن ہونے کا اشارہ کرتا ہے لیکن 'سفید نکیلی ہڈی' جس کا ذکر مختلف اوراق میں بار بار آتا ہے ایک نکتہ 'لا ینحل' ہی رہ جاتا ہے۔ پہلا ورق ہی حیرت استعجاب اور تھوڑی سراسیمگی کا احساس دلاتا ہے 'سفید نکیلی ہڈی' کے علاوہ خودکشی اور ٹھنڈے پسینے کا ذکر، دنیا کے خالی پن کا تذکرہ اور پوری فضا میں ایک عدمیت سے ہے۔ دوسرا ورق ایک ایسی عورت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو برابر Haunt کرتی رہتی ہے یہ پراسرار زرد، 'زرد ہاتھوں والی عورت' ایک معمہ ہے۔ اس ورق میں جنسی قربت کا شائبہ ہوتا ہے۔ یہاں پھر سفید نوکدار ہڈیاں قاری کو چبھتی ہیں۔ تیسرا ورق اس عورت سے جسمانی و ذہنی قربت پر مشتمل ہے، محبت کی بے چارگی اور ہوس کی بالادستی، جنسی عمل سے نامطمئن کردار، محبت کی خلش اور اس کا بوجھ، تعلقات کا عدم استحکام اور خودکشی کی خواہش یہ سارے محسوسات ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ بعض اشارے مثلاً 'نیلے دوپٹے کی کترن' قاری کے ذہن کو مزید بے ترتیب بنا دیتے ہیں۔

چوتھے ورق میں دو عورتوں کا ذکر ہے۔ بیوی جو محبت نہیں کرتی اور پھر وہی، زرد ہاتھوں والی عورت 'اس ورق میں ایک کردار نفسانی لذتوں میں شرابور ہو جاتا ہے جسمانی رابطہ، مکروہ بد فعلیوں اور متعدد عورتوں کی صحبت تک لے جاتے ہوئے کردار میں ایک طرح کا perversion پیدا ہوتا ہے۔ آگے کا بیان یہ اشارہ کرتا ہے کہ یہ باتیں حال کی نہیں ماضی کی ہیں۔ پانچویں ورق میں جسم کے بے دریغ صرفے پر ایک تاسف کا احساس ہوتا ہے۔ جسم کی بے وقعتی، ازدواجی رشتے کے کھوکھلے پن، تنہائی کا احساس اور گناہ کی یادیں پانچویں ورق کے خاص موضوعات ہیں۔ چھٹے ورق میں ہوس اور خواہش، سماجی زندگی کی بے معنویت، جسم اور جوانی کے مسلسل صرفے کی وجہ سے پورا ماحول افسردہ اور تھکا تھکا سا نظر آتا ہے۔ یکا یک ساتویں ورق میں باپ پر غصہ اترتا ہے۔ باپ بیٹے کے رشتے کی تلخیاں دونوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اندر اندر اور پکتی رہتی ہیں۔ ورق آٹھ میں والدین کی ناکام ازدواجی زندگی کے اثرات اور زن وشو کے رشتے کے مصنوعی پن کا بیان ہے۔ لڑائی کا منظر، باپ کی جنسی حرکتیں اور اس کی ہوسنا کیوں کی بنا پر ایک کتے سے اس کی مشابہت کی جاتی ہے۔ نویں ورق میں ماں باپ کا جھگڑا ہے اور مکالمے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ خاص کردار کی ماں کسی فوجی سے وابستہ تھی جو خود کسی دوسرے فوجی پولس کے ذریعہ مارا گیا تھا۔ غرض زندگی کی بے ترتیبی اور مرد ہو یا عورت ان دونوں کی جنسی بے راہ روی کے جو اشارے اس 'ورق' میں ملتے ہیں ان سے کہانی کی تھوڑی بنت سامنے آتی ہے۔ حیرت انگیز طور پر وہ ماں پر چھائیوں کی طرح غائب ہو جاتی ہے۔ بقول مصنف "وہ ٹیلے کی عقب کی زمین میں معدوم ہو گئی جہاں جنگی قیدیوں کی قبریں ہیں"۔ ایک ہلکا سا اشارہ اس طرف بھی ہوتا ہے کہ بالآخر ماں اسی فوجی کی قبر کی طرف چلی جاتی ہے جس سے اس کا جسمانی رشتہ تھا۔ گیارہویں ورق میں پھر باپ بیٹے کے تعلق کی کشاکش دکھائی دیتی ہے۔ بیٹا جوان ہو گیا ہے اور محلے کی کئی لڑکیوں سے اس کے جنسی تعلقات قائم ہو گئے ہیں۔ کمزور ہو کر وہ مرگی کا مریض ہو جاتا ہے۔ ان سارے وقوعوں کے درمیان باپ اپنی بیوی کو یاد کرتا ہے۔ بارہویں ورق میں لڑکے کی شادی ہو جاتی ہے پھر خوابوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک مفکرانہ لہجہ سامنے آتا ہے جس کے تحت یہ نتیجہ

اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نئے جسمانی رشتے اس صورت میں بے سود ہو جاتے ہیں جب پرانے رشتے کی یاد ایک روحانی تاثر بن کر انسان کی داخلی شخصیت پر دستک لگاتی رہتی ہے۔ تیرہواں ورق خوابوں کے ذکر کو آگے بڑھاتا ہے جسمانی عمل سے زیادہ ہوسنا کی لذیذ تر ہوتی ہے۔ چودہویں ورق میں نامردی، جنسی عمل سے اکتاہٹ اور جنسی صحبت کے تذکرے ہیں۔ خواب کا ذکر ہے خودکشی کی خواہش ہے، باپ سے نفرت، گندگی پھیلاتا ہوا بیمار کردار اپنے ماضی کو کھنگالتا ہے۔ سولہویں ورق میں مرض بڑھ جاتا ہے ذہنی انتشار عملی بے ربطگی اور پاگل پن کی سرحد تک لے جاتا ہے۔ یکا یک سترہویں ورق میں 'زرد ہاتھوں والی عورت' کا ذکر ایک بار پھر سامنے آجاتا ہے۔ یہاں بعض مبہم اشارے ملتے ہیں مگر یہ بھی قاری کو کسی نتیجے تک پہنچانے میں مانع ہوتے ہیں۔ ماں کا ماضی کا رابطہ ایک بار پھر مصنف کو پریشان کرتا ہے۔ اٹھارہویں ورق میں موت اور زندگی کی یکسانیت کا بیان ہے، انسان کی مجبوری اور مقدر کی تحریر کا رونا ہے، باپ کی ہوسنا کی اور جنسی شدت کا بیانیہ ہے۔ پاگل پن کچھ اور شدید ہو جاتا ہے۔ انیسویں ورق میں باپ کے مرنے کی خبر ملتی ہے اور خودکشی کا جذبہ غالب ہو جاتا ہے اور آخری ورق غالباً اس لئے سادہ ہے کہ کردار اپنے جنون کے عالم میں خودکشی کا ارتکاب کر لیتا ہے اور یوں موت کی کتاب مکمل ہو جاتی ہے۔

میں نے اس تخلیق کے مختلف حصوں میں بڑی مشکل سے جو ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مجھے نہیں معلوم کہ خود مصنف اور دوسرے قارئین اس سے کہاں تک متفق ہو سکیں گے۔ جگہ جگہ ڈرامائی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ اسٹیج کی سیٹنگ، روشنی اور پردے کے اٹھنے گرنے کی جھلکیاں، تھیئٹر کا ذکر background,song، بعض مناظر کو اسٹیج پر اتارنے کی ناکام سی کوشش بھی اس تخلیق کو نئے shades سے آشنا کرتی ہے۔ موت کی کتاب ناول نگاری کے باب میں ایک تجربہ تو بن سکتی ہے لیکن ہر تجربے پر ناز نہیں کیا جا سکتا۔

(انتخاب۔ ۲۴ صفحہ ۸۵ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆
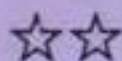
وقار قادری

یوں تو جناب وقار قادری کے ادبی کارناموں میں تنقید وصحافت سے ان کی وابستگی کی بھی خاص اہمیت ہے۔ان کے تنقیدی مقالات کئی اہم جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ رنگ (دھنباد) اور شہپر (دھنباد) کے بعض اہم شماروں میں ان کی انتقادی تحریریں سامنے آچکی ہیں۔انہوں نے کئی نئے اہل قلم کو ادبی دنیا میں متعارف کیا ہے۔ان کے تنقیدی جائزوں سے اس میدان میں ان کے اختصاص کا اندازہ ہوتا ہے۔تنقیدی نگارشات کے علاوہ ان کی صحافتی وابستگی خود ایک قابلِ قدر بات ہے۔انہوں نے اپنا شعر قلمی ماہنامہ تحریر سے شروع کیا تھا۔آگے چل کر روزنامہ ''سارا بہار'' سے وابستہ رہے۔پھر پندرہ روزہ ''گوہر مقصود'' کو نکھارنے میں لگے۔

ان سارے مشاغل ،مصروفیات اور خدمات کو فی الحال میں ان کی ادبی شخصیت کی اضافی خصوصیاتِ مان کر ان کی شعری تخلیقی شخصیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔یقیناً یہی پہلو زیادہ روشن اور تابناک ہے۔وہ ایک زمانے میں سہیل (گیا)،مریخ (پٹنہ)،اقدار (پٹنہ) حسن و صحت، پاسبان، پروازِ ادب، بیسویں صدی، مورچہ، آزاد ہند، تجلیات، امیر الہند، گوہر مقصود، رنگ، شہپر وغیرہ میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔اس لئے ان حلقوں کے قارئین ان کی شعری خدمات سے نہ صرف واقف ہوتے رہے ہیں بلکہ ان کے ذہنوں میں جناب وقار قادری کی تخلیقیت کے اچھے تاثرات بھی قائم رہے ہیں۔

لیکن ہم سب یہ جانتے ہیں کہ ادبی دنیا بہت بے وفا بھی ہوتی ہے۔تخلیقات کی

اشاعت اور اس کے تسلسل میں چند برسوں کا تعطل بہت جلد فنکار کے اثرات زائل کرنے لگتا ہے۔ جو لوگ اپنی سست خرامی کی وجہ سے پیچھے چھوٹ جاتے ہیں وہ کارواں سے بچھڑنے لگتے ہیں۔ کچھ یہی صورت حال جناب وقار قادری کے ساتھ بھی ہوئی۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ رفتہ رفتہ ان کے تخلیقی انہماک کا رخ عام ادبی و تخلیقی محور سے کھسکنے لگا۔ مذہب، عقیدت معتقدانہ محسوسات ان کی تخلیقی جودت پر حاوی ہونے لگے چنانچہ تجلیات طیبہ، مناقب غوث و خواجہ، مناقب امیر الہند اور مثنوی سید الہند وغیرہ جیسی مطبوعات کے ذریعہ انہوں نے اپنا قبلہ تو درست کر لیا مگر اقلیم سخن کی عام محفلوں میں قارئین اور اہل قلم حضرات دونوں کے لئے تھوڑی اجنبیت کے شکار ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ جناب وقار قادری نے روحانی انسلاک کے وسیلے سے اپنی شخصیت میں فراغ و فراز اور بشاشت و اعتماد کے جو گوہر نایاب سمیٹ لئے ہیں اور اس انجذاب سے جو سرشاری حاصل کر لی ہے ان کے مقابلے میں شعر و ادب کی عمومی فضا کی کوئی اہمیت نہیں بنتی۔ شاعری اولاً تو تسکین ذات کے لئے کی جاتی ہے دوسری منزل میں اس کا تعلق اظہارِ ذات سے ہوتا ہے اور یہی وہ منزل ہے جہاں تخلیقی جمالیات کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ قاری بھی محظوظ و مسرور ہو سکے۔ یہاں کیفیات سے زیادہ ہنر درکار ہوتا ہے۔ ایک باشعور فنکار ان دونوں مشقوں میں متوازن معیار کا حامل ہوتا ہے۔ بسا اوقات اندرونِ ذات کی محویت رسم و رہِ اظہار سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ جناب وقار قادری کی شاعری مجموعی طور پر اسی نوعیت کی عکاسی ہے۔ اس بات پر ایک طویل مکالمہ ہو سکتا ہے کہ سچی شاعری کا رہین قیدو بند ہونا کس حد تک ضروری ہے۔ بسا اوقات اغلاط سے پاک، کلام بھی تخلیقی جوہر سے عاری ہوتا ہے اور اس کے برخلاف سچے جذبات و محسوسات ہر حال میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ شوق تو ہر رنگ میں رقیب سروساماں ہوتا ہے اور قیس اپنے جذبۂ بے محابہ کی وجہ سے تصویر کے پردے میں بھی عریاں ہوتا ہے۔

بہر حال! وقار قادری کی تخلیقیت سب سے پہلے خود ان کی شخصیت کے لئے سامانِ انبساط پیدا کرتی ہے اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں ہے۔ مجھ جیسے قارئین جب اسے اپنے آپ میں سمیٹنا چاہتے ہیں تو ہمارا فنی شعور طب و یابس، خوب و ناخوب اور نقص و حسن کی ترازو استعمال

کرنے لگتا ہے۔ میں جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ جناب وقارؔ قادری کے درج ذیل اشعار مجھے اچھے لگتے ہیں:

منصف بھی تمہارا ہے عدالت بھی تمہاری
ہر حال میں ثابت ہوئی تقصیر ہماری
سچ کہے گا تو عدالت میں اگر اے قادریؔ
اپنا سر بھی اپنے شانوں پر نہیں پائے گا تو
نہیں مجھ کو ہی غم ہائے زندگی تنہا
ہے اس خرابۂ ہستی میں ہر کوئی تنہا
نہیں ہے وحشت تعزیر آج قائد کو
ہر ایک عیش کا ساماں ہے قید خانوں میں
یہ چرخ کے تاروں کو بھی چھو لیتا ہے بڑھ کر
انسان کا ہے کتنی بلندی پر اب ادراک
زباں بندی تری محفل کا جب دستور ٹھہرا ہے
حدیث غم یہاں کیسے کروں میں بے زباں ہوکر
وقارؔ عصر رواں کا یہ معجزہ دیکھو
ہجوم نوع بشر میں ہے آدمی تنہا
رہ ہستی کی تاریکی میں کیوں گمراہ ہو جاؤں؟
کہ وہ نورِ ازل پنہاں ہے میرے قلب روشن میں
جو بھی گزرے ہیں تیری یاد سے بچ کر اے دوست
زندگی کی وہی لمحات گراں سے گزرے
دیکھتی رہ گئی دنیا وہیں قدموں کے نشاں
اپنی دھن میں تیرے دیوانے جہاں سے گزرے
اگر مقصود ہے راز عدم سے آشنا ہونا

تو کر لے زندگانی میں فنا ہونے کی خو پہلے
کبھی جو رہتا نہیں ہے قید کے اندر
یہ کون شخص ہے میرے وجود کے اندر
وقار شہر کے لوہے نہ پگھل جائیں کہیں
موم کے شہر میں سورج سا چمکتا ہوں
کب سے بھٹک رہا ہوں میں اپنی تلاش میں
یہ جوش جستجو بھی تری ذات ہی سے ہے

اگر جناب وقار قادری اپنی فطری تخلیقی صلاحیت کو متعدد سمتوں میں منقسم ہونے سے بچا پائیں تو یقیناً زیادہ بہتر مظاہر سامنے آسکتے ہیں۔۔۔

(انتخاب۔۲۵ صفحہ ۲۷ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆

مظفر عالم ضیاؔ عظیم آبادی

ابھی کل ہی جناب نشاط احمد نے ڈاکٹر سید مظفر عالم ضیاؔ عظیم آبادی کا تازہ مجموعہ کلام 'گرد سفر' عنایت کیا ہے۔اس تحفے کے لئے میں فنکار اور کتاب کے مرسل دونوں کا ممنون ہوں۔سب لوگ یہ جانتے ہیں کہ ادھر کتابیں بڑی تعداد میں چھپ رہی ہیں،ان میں شعری ممنون کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔جس رفتار و تعداد سے کتابیں موصول ہوتی ہے حق یہ ہے کہ اس طرح ان کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔سب اوقات ان تمام موصولات پر اظہار رائے تو کجا ان سبھوں کا مطالعہ کرنے سے بھی انسان قاصر رہتا ہے۔

مگر نہ جانے کیوں جناب نشاط احمد کی واپسی کے بعد میں 'گرد سفر' کی ورق گردانی میں لگ گیا۔پھر از ابتدا تا انتہا اس کے مطالعے کی سعادت بھی حاصل کر لی۔جناب مظفر عالم ضیاؔ کے دو مجموعے 'کسک' اور 'رقص سیماب' اس کے بہت پہلے نظر سے گزر چکے ہیں۔اکثر یہ خیال آتا تھا کہ میں نے اپنے معاصرین پر اتنا کچھ لکھا ہے مگر آج تک ضیاؔ صاحب کے ان مجموعوں کے سلسلے میں اپنے تاثرات کا اظہار نہیں کر سکا ہوں۔یہ خلش بار بار اٹھتی تھی پھر مصروفیات کے ریلے اسے بہالے جاتے تھے۔

اپنی یہ مسلسل خاموشی میرے دل میں ایک تاسف کی کیفیت پیدا کر رہی تھی کہ معاً مجموعہ 'گرد سفر' مل گیا۔ضیاؔ صاحب کے سابقہ دونوں مجموعوں کے تاثرات تو اب نقش ونگار طاق نسیاں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں لیکن سجدہ سہو کا موقع اس تازہ کتاب 'گرد سفر' کے ذریعہ نکل آیا ہے۔ایں ہم غنیمت است۔

سید مظفر عالم ضیا عظیم آبادی کا رشتہ بنیادی طور پر ریاست بہار کی مستحکم اور توانا شعری روایات سے قائم ہوتا ہے جہاں اظہار کی صناعی اور بیان کی پیچیدگی کے بغیر سلاست، بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ جذبہ وفکر کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ صناعی اکثر وبیشتر تصنع کا روپ دھار لیتی ہے۔ بہار کی شعری روایت اس سے بچتی رہی ہے۔ غالب نے ایک جگہ معیار سخن متعین کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ''نکتۂ چندز پیچیدہ بیانی بمن آر''۔ بہار کی روایت نے اس مجاہدے کی ترغیب دی ہے کہ زندگی کے رموز واسرار اور نکتہ ہائے فکر ونظر کو بیان کی سادگی کے ساتھ سامنے لایا جائے۔ اس لئے کہ سادگی اظہار بذات خود اثر انگیزی کا ایک مضبوط وسیلہ ہے۔ فارسی میں سعدی اور ان کے متبعین نیز اُردو میں میر اور لہجہ میر کے حامل شعرا نے اس ہنر مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ بہار کی شعری روایت کے تانے بانے بھی اس سے ملتے جلتے ہیں۔ جناب ضیا کا امتیاز بھی یہی ہے۔

'گرد سفر' کی شاعری مظفر عالم ضیا کی تخلیقی شخصیت کا ایک کامیاب تعارف نامہ ہے۔ زندگی کے مسائل ومصائب کے باوجود فنکار کی حوصلہ مندی اور قوت حیات جناب ضیا کو شاعروں کی اس بھیڑ سے الگ کرتی ہے جس سے انفعال، محزونیت، شکست خوردگی اور گزیدگی کے منفی رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی کی نبرد آزمائیوں کا انہوں نے sportsman spirit کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اس لئے ان کی شاعری میں کہیں محزونیت اور تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔ ذیل کے اشعار مظفر عالم ضیا کے رجائی فکر واحساس کی گواہی دیتے ہیں:

منزل ملے، ملے نہ ملے یہ الگ ہے بات
لیکن ہمارے جسم پہ گرد سفر تو ہے

ضروری تو نہیں ہر شام ہو پیغام تاریکی
نمودِ شام ہی کو ہم اندھیری رات کیوں کہہ دیں

چھٹ ہی جائے گی یہ تاریکیٔ ماحول ضیا
اک ذرا شمع یقیں دل میں جلا لیں پہلے

گرد سفر کو تھکن اور ہزیمت کا استعارہ سمجھنے والی اُردو کی روایتی شاعری کے سامنے

جناب ضیاؔ عظیم آبادی کا پر امید اور مثبت فکر یہ خوشگوار مثال ہے۔

غزل کے متفرق اشعار میں موضوعات کا تکرار تو اُردو شعری روایات میں عام سی بات ہے۔ شاعر کبھی اپنے متقدمین یا معاصرین کے موضوعات میں نئی شاخِ خیال پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر شاعر کی کامیابی کی ضمانت اس کے لہجے کی انفرادیت ہوتی ہے۔ موضوعات کی یکسانیت پر لہجے کی انفرادیت کا حاوی ہو جانا تخلیقی اصول کے اس رمز کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاعری بالخصوص غزل کی شاعری میں لہجے اور اسلوب سے موضوعات کی تخلیق اور نشو ونما ہوتی ہے۔ فنکار کے لہجے کی انفرادیت اور اس کے اظہار کی خوش سلیقگی موضوع میں تازگی، شگفتگی اور جدت پیدا کرتی ہے۔ میرؔ کا مشہور زمانہ شعر ہے:

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

عرفان ذات اور پھر عرفان الٰہی کے اس تصور کو منظر عالم ضیاؔ یوں بیان کرتے ہیں:

مجھ میں تھا وہ، میں ڈھونڈ رہا تھا اسے کہاں
افسوس کہ میں دور رہا اپنے آپ سے

جناب ضیاؔ نے راست اسلوب سے نہ صرف موضوع کی تفہیم آسان بنادی ہے بلکہ ایک معصومانہ سادگی کے ذریعہ عام موضوعات کو ضرب المثل بنادیا ہے، اسے ایک ایسی روانی سے ہم کنار کیا ہے جو سریع الاثر بھی ہوتی ہے۔ ایک عام موضوع میں ضیا کے لہجے کا اختصاص دیکھئے:

اک ترا دل جہاں نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں
اک مرا دل کہ محبت سے بسا رہتا ہے

مظفر ضیاؔ عظیم آبادی نے کئی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ حمد، نعت، مناجات اور منقبت وسلام جیسی عرفانی اور وجدانی شاعری کے بعد ان کی غزل گوئی کے ذریعہ ان کی شاعرانہ ہنر مندی کا زیادہ بہتر احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اس کے ثبوت میں پیش کئے جاسکتے ہیں:

رات آئی تو کھل گئیں دیکھو
کتنی یادوں کی کھڑکیاں یارو

نہ جھٹکو دامن دل سے غبار تنہائی
غموں کے دشت کی کچھ یادگار رہنے دو

لئے پھرتا ہے ہر اک شخص اپنی لاش کاندھے پر
بھٹکتی پھر رہی ہے جنگلوں میں روح انساں کی

جو ہو نہ پائے طاقتِ گفتار سے ضیا
کر جاتی ہے وہ کام فقط ایک خامشی

اے میرے احساس کے پنچھی میں یہ سوچ کے حیراں ہوں
تیرا آخر درد سے رشتہ کیسا ہے معلوم نہیں

ہر اہتمام ترک تعلق کے باوجود
گزرا کئے ہیں بارہا ان کی گلی سے ہم

(انتخاب۔۲۵ صفحہ ۷۶ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆

علیم الدین علیم

جناب علیم الدین علیم کا پہلا شعری مجموعہ 'ہوا کی یورش' ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔اس میں حمد، نعتِ اور رباعیات جیسی اصناف کے ساتھ ساتھ غزلیہ شاعری نے ان کی ایک اچھی شناخت کرائی ہے۔حمد و نعت اور دوسری مذہبی و معتقدانہ شاعری کے کچھ حصے کا تعلق تو بقول غالب مے وانگبیں کی لاگ سے ہے اور کچھ اس تہذیب و معاشرت سے جو پشت در پشت بزرگوں کے طفیل انہیں حاصل ہوتی رہی ہے۔انسان اپنے ماضی اور ان کی قدروں سے وابستہ نہ رہے تو کٹی ہوئی پتنگ کی طرح بے سمتی کا شکار ہو جاتا ہے۔الغرض جناب علیم نے 'ہوا کی یورش' کے ذریعہ جس طرز سخن سے اپنے آپ کو متعارف کرایا ہے اس سے ان کی روایت پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔اس ذہنی تہذیب و ترتیب کا پتہ چلتا ہے جس کے ذریعہ یہ اشعار عالم وجود میں آسکے ہیں:

میراث تو اجداد کی کھو بیٹھے ہو لیکن
حیرت ہے علیم اب بھی سدھر کیوں نہیں جاتے

چہرے پر چڑھاتے رہو تم رنگِ تقدس
سنتا ہوں ریا کار کی بخشش نہیں ہوتی

وہ اپنے چہرے پر رکھتا تھا دوسرا چہرہ
فریب کھا کے مجھے انکشاف کرنا پڑا

کیا بتاؤں میں تجھے مصحف رخ کا منظر
روح میں تازگی آتی تھی زیارت کر کے

جناب علیم کا تازہ مجموعہ کلام 'پھول ہتھیلی پر' ان کے ماہیوں کا مجموعہ ہے۔اس سے ان کے سابقہ مزاج سخن کی تائید و توسیع نہیں ہوتی بلکہ اس سے نئی شعری جہتوں کی تلاش اور رغبت کا رنگ غالب ہے۔ میں مانتا ہوں کہ شاعری میں ہیئتی تجربہ کاری نئے امکانات روشن کرتی ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہر زبان (جو اجتماعی تفہیم ،ذوق و وجدان ،صوتی آہنگ اور شعری جمالیات کی ترجمان بنتی ہے) کسی خاص لسانی گروہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ ہیئتی تجربات کبھی رکتے نہیں ،انہیں رکنا بھی نہیں چاہئے۔غور کیجئے کہ خود ہماری زبان میں نظم نگاری کے حوالے سے پرانی ہیئتوں میں کتنے تجربات ہوتے رہے ہیں، یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔اسی وسیلے سے شعری آہنگ کو ضرب لگائے بغیر نئے اوزان واطوار متعارف ہوگئے ہیں۔نئی ہیئتیں بنیادی شعری جمالیات کو کبھی مجروح نہیں کرتیں ،وہ ہمیشہ نغمگی و آہنگ کے نئے پہلو تلاش کرتی ہیں۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تین مصرعوں میں سے ایک مصرع سے ایک سبب خفیف نکال دینے سے کیا لطف خاص پیدا ہوتا ہے؟نغمگی کی کون سی فضا بنتی ہے؟ جو تاجر حضرات اکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار کرتے ہیں وہ بھی یہ جانتے ہیں کہ باہر سے کیا چیز منگوائی جائے جو ہمارے لئے مفید اور قابل قبول ہو سکتی ہے۔جب ہمارے پاس خود ایک پر اثر صوتی آہنگ موجود ہے تو ہم چین، جاپان ،افریقہ اور دوسرے خطوں کے نظام نغمگی کا لبادہ کیوں اوڑھنا چاہتے ہیں۔سانٹ انگریزی شاعری کا ایک فارم ہے۔ہم نے اُردو میں اسے خوب رائج کیا ہے مگر غور کیجئے کہ ہم نے ہیئت کہ انہیں اجزا کو قبول کیا ہے جن سے اوزان و بحور کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا،شعری آہنگ جیوں کا تیوں قائم رہا۔

بہرحال !میں اس بحث وجدال میں پڑنا نہیں چاہتا۔اتنا بھی نہیں لکھتا لیکن چونکہ جناب علیم الدین علیم اظہار و بیان پر قدرت رکھتے ہیں، شعری تخلیق کی بنیادی ودیعت سے فراز ہیں ،اُردو شاعری کی مضبوط مستحکم اور خوشگوار روایات کے امین ہیں اور اُردو شاعری کے نئے آفاق کے متلاشی ہیں اس لئے میں نے مختصر طور پر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔اس لئے بھی کہ میں ایسے ہنر مند فنکار کو کھونا نہیں چاہتا۔

(انتخاب۔۲۵ صفحہ ۷۹ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

پروفیسر شاہ غلام سلطان

پروفیسر شاہ غلام سلطان کی کتاب 'تصوف کی نیرنگیاں' اگرچہ ثمرہ ہے ان مطبوعات کے مطالعے کا جو اس شعبۂ خاص کے سلسلے میں مصنف نے برسوں تک کیا ہے۔ ان کتابوں میں رسالہ **قشیریہ**، کشف المحجوب، فوائد الفواد، قول الجمیل، تاریخ مشائخ چشت، نفحات الانس، تصوف اور شریعت، تجدید و احیائے دین، تذکرۃ الاولیا، مکتوبات صدی، اور حضراتِ صوفیا اور علم حدیث کے نام بطور خاص لئے جاسکتے ہیں۔ یہ تو چند نام ہیں، زیر بحث کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر صاحب نے اپنے موضوع سے متعلق دوسری متعدد نگارشات سے رابطہ رکھ کر اپنے مطالعات کو استناد بخشنے کی کوشش کی ہے۔

یہ تو خیر موضوع زیر بحث سے متعلق علمی نکات کے حصول اور ان کے استعمال کا معاملہ ہے۔ دراصل تصوف جیسے موضوع پر ہر طرح کی مثبت اور منفی آرا سے دامن بچا کر متوازن انداز میں وہی آدمی لکھ سکتا ہے جو فطری طور پر تصوف سے تعلق بھی رکھتا ہو اور اسے اس راہ کے خدشات کا شعور بھی ہو۔ تصوف سے عملی شغف اور رجحان کے ساتھ ساتھ نشان انتباہ پر گہری نظر رکھنے والا ہی اس بحر بیکراں سے اپنا سفینہ نکال سکتا ہے۔ شاہ غلام سلطان نے اپنے ذوق وجذبے کو تربیت وتہذیب سے ہم آمیز کرتے ہوئے ایک ایسا طریق کار اپنایا ہے جو اہل علم ودانش کے لئے تصوف کے رجحان کی معنویت اور اس کی افادیت کی صراحت وتائید کرتا ہے۔

مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مصنف نے جس گہرے شغف اور عمیق مطالعے کے نتیجے میں یہ کتاب تصنیف کی ہے اس کے بعد اس کا نام (تصوف کی نیرنگیاں) کچھ زیب نہیں

دیتا ہے۔لفظ 'نیرنگیاں' نہ صرف منشائے مصنف کو کمزور کرتا ہے بلکہ تصوف سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے دلوں میں ایک خلش پیدا کر سکتا ہے۔اس سے اس نقصان کا اندیشہ بھی ہے کہ قارئین اس گراں قدر کارنامے سے جو فیض حاصل کر سکتے ہیں اس میں کوئی رخنہ نہ پڑ جائے۔ظاہر ہے میری ان معروضات کی تائید و تردید اسی وقت ممکن ہے جب صاحبان ذوق غیر مشروط ذہن سے اس کا مطالعہ کریں۔

(انتخاب۔۲۵ صفحہ ۸۱ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆

صبؔا نقوی

صبا نقوی غزل کے عاشق ہیں------یہ بیان کافی نہیں ہے اس لئے کہ بسا اوقات عشق کا سیل بیکراں آداب وقیود سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔شدت شوق رقیب سروساماں بن جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں ہو جاتا ہے۔غزل سے صبا نقوی کی محبت اندھی نہیں ہے،ان کے یہاں اس جذبے کو اعتماد وآگہی کہ تقویت بھی حاصل ہے۔کہتے ہیں:

نظر والو! سر محفل، ذرا ہوشیار رہیو
صبؔا کی بے خودی میں آگہی کا رنگ بھی ہے

صبا نقوی نے اگر چہ یہ بتایا ہے:

''غزل گوئی اور نظم نگاری سے والہانہ لگاؤ رکھنے کے باوجود میں حمدیہ رشحات،نعتیہ نگارشات،عقیدت مندانہ تخلیقات اور رثائی ادب کو غزلوں اور نظموں پر ترجیح دیتا ہوں''

لیکن ان کے تخلیقی رویے سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی۔غزلیہ شاعری سے ان کا ذہنی لگاؤ اور غزلوں کی مخصوص متغزلانہ کیفیت سے ان کے رنگ سخن کا اندازہ ہو جاتا ہے۔انہوں نے اپنی تحریر'عرض حال' کے تحت غزل سے اپنی غیر معمولی دلچسپی کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ غزل ان کی محبوب ترین صنف ہے۔لکھتے ہیں:

''میں بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہوں----میری نظر میں غزل

اُردو شاعری کی محبوب ترین اور مقبول ترین صنف سخن ہے۔ بالفظ دیگر غزل
اُردو شاعری کی آبرو ہے------غزل نام ہے عالم دیوانگی میں پیغام آگہی
کی نشر واشاعت کا۔غزل کی ریزہ خیالی مجھے پسند ہے‘‘------وغیرہ وغیرہ

اب اس کے بعد یہ سوال ہی نہیں اٹھتا کہ غزل کا یہ عاشقِ صادق کسی اور کا شیدائی ہو۔
پیش نظر مجموعہ 'جمال فن' صؔبا کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے لیکن انہوں نے اطلاع دی ہے کہ اس سے پہلے غزلیہ شاعری کے تین مجموعے 'ذوق سخن'، 'نزول شعر'، اور 'نگار فکر' باقاعدہ مرتب کئے جا چکے ہیں۔ گویا چوتھا مجموعہ 'جمال فن' ہے جو بلا فصل سب سے پہلے زیور طبع سے آراستہ ہوا ہے۔

صبا نقوی کی شاعری غزل کی روایت سے پیوستہ اور آراستہ ہے۔ اسی بنیاد پر وہ نئے برگ وشاخ پیدا کرتی ہے، توسیع کرتی ہے، تھوڑے تھوڑے انحراف واختلافات سے جدت کے نقوش پیدا کر لیتی ہے۔ غزل کی مستحکم اور مہتم بالشان روایت ایک ایسا خزینہ ہے جہاں سے ہنر والے اپنے ذوق وتوفیق سے بے پناہ گوہر گراں بہا حاصل کر سکتے ہیں۔ صؔبا نقوی نے بھی اس سے خوب خوب فیض اٹھایا ہے۔ غزل کی حرمت وعفت روایت کی چہار دیواری میں محفوظ رہ سکتی ہے۔ یہاں سے نکل کر غزل بازاری ہو جاتی ہے۔ صؔبا نقوی کو ایسی جدت منظور نہیں، کہتے ہیں:

میں بدلتے موسموں کے رنگ سے بیزار ہوں
ہر نئی رت سے، چمن میں برسر پیکار ہوں

ایک دوسری جگہ تبدیلیوں سے یوں گھبرائے ہیں:

نہ اب خلوص کی گرمی تعلقات میں ہے
نہ اب وہ لطف سفر جادہ حیات میں ہے
پرانی قدریں لب گور ہو رہی ہیں صبا
نیا نظام جہان تصورات میں ہے

صؔبا نقوی کے موضوعات میں وسعت ہے۔ اجتماعی شعور، عصری حالات، تزکیہ نفس

کے مضامین، عہد گزشتہ کی بازیافت اور تسلسل عصر کے علاوہ متعدد مسائل و موضوعات ہیں جو صبا نقوی کی غزلوں میں جا بجا پھیلے ہوئے ہیں۔ متعدد اشعار میں اپنے مخصوص انداز میں انہوں نے اجتماعی شعور کی ترجمانی بھی کی ہے مثلاً:

نہ بھولے عہدِ حاضر کے تقاضے
غزل جب فکر کی محمل میں اترے
اس آئینے میں جھلکتا ہے وقت کا چہرہ
یہ عکس عکس غزل صرف شاعری تو نہیں
جو اپنی بات زمانے سے کہہ نہیں سکتا
تمام خلق کا وہ ترجمان کیسا ہے

صبا نقوی نے اپنے ایک شعر میں عصری تسلسل کے سلسلے میں ایک خوبصورت اور فکر انگیز نکتہ یوں بیان کیا ہے:

جو عرصہ ماضی ہے مورخ کی نظر میں
شاعر کی نگاہوں میں وہ گزرا ہوا پل ہے

مجموعی اعتبار سے صبا کی شاعری روایت کی عکاسی کرتے ہوئے نئے فکری ابعاد کی متلاشی ہے۔ اظہار و بیان کی روانی نے متعدد اشعار کو ضرب الامثال کی خصوصیت بخش دی ہے۔ ان کے محسوسات کہیں برملا ظاہر ہوتے ہیں کہیں ایک ایسے Inwardness کا اندازہ ہوتا ہے جو ہر معیار کے قاری کی گرفت میں آسکتا ہے۔

غزل کی روایتی شاعری کا بھرم رکھنے اور آپ بیتی کو فکر بیتی بنانے والے اس شاعر کے امکانات وسیع تر ہو سکتے ہیں۔ غزل کے قارئین کو ان کے مرتب شدہ مجموعوں کا انتظار رہے گا۔ (انتخاب۔۲۵ صفحہ ۸۲ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆

فریدہ عالم

فریدہ عالم کی کچھ کہانیاں میں نے بعض رسائل وجرائد میں پڑھی تھیں تو مجھے یہ متاثر نہ کرسکیں لیکن اب کہ انہوں نے بیک وقت اپنی کم وبیش ۲۵ کہانیاں مجھے دی ہیں اور میں نے انہیں باقاعدہ طور پر پڑھا ہے تو ان کی فن کاری کے سلسلے میں میرے خیالات بدل رہے ہیں۔

جو بات مجھے برابر کھٹکتی رہی ہے وہ یہ ہے کہ فریدہ عالم کی زبان بہت کمزور ہے۔ وہ بالعموم اپنی کہانیوں میں بھی وہی زبان استعمال کرتی رہی ہیں جو اوسط درجے کے قدیم شرفا کے گھرانوں میں عورتیں بول چال کے انداز میں استعمال کرتی ہیں۔ ادبی تخلیق کے لئے جس مرتب، باوقار، صناعانہ اور Acquired لب ولہجہ اور اسلوب اظہار کے ہم عام طور پر عادی ہو چکے ہیں مجھے فریدہ عالم میں اس کی کمی کھٹکتی رہی ہے لیکن اب جب میں نے ان کی بہت ساری کہانیوں کا مطالعہ کیا ہے تو ان سے مجھے ان کے ایک مخصوص بے تکلفانہ اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔ زبان کی صناعی اکثر وبیشتر تصنع، بناوٹ اور دکھاوے کا پتہ دیتی ہے۔ یہ بسا اوقات غیر فطری ہو جاتی ہے اور تکلف کا شائبہ دیتی ہے۔ فریدہ عالم نے اس سے اجتناب کیا ہے اور زبان کی آرائش و زیبائش اور نام نہاد ادبیت کا سہارا لئے بغیر اپنے اردگرد جو کچھ دیکھا ہے اور اس سے جس طرح متاثر ہوئی ہیں اسے انہوں نے بے کم وکاست بیان کر دیا ہے۔ یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہئے کہ فریدہ عالم گھر آنگن اور خانگی زندگی میں ہونے والے واقعات نیز ان کرداروں کا مشاہدہ پیش کرتی ہیں جن سے انہیں برابر کا واسطہ رہا ہے۔ اس صورت حال میں اظہار و بیان کا جو فطری انداز ان کی کہانیوں میں نظر آتا ہے وہ یقیناً ان کی کہانیوں اور کرداروں کی عکاسی کے

لئے زیادہ مناسب ہے۔ اب رہا معاملہ لسانی تسامح کا، تو مجھے یقین ہے کہ کہانیوں کی پہلی تسوید کے بعد منزل بہ منزل ان میں کمی آتی گئی ہے اور جب کتاب چھپ کر آئے گی تو بہر صورت قابل قبول بن جائے گی۔

فریدہ عالم تخیل کے تانے بانے نہیں بُنتیں۔ گاؤں گاؤں اور شہر بہ شہر گھوم کر مرکزی خیال مستعار نہیں لیتیں بلکہ بقول شاعر

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

فریدہ عالم اپنے دائرۂ مشاہدہ کی سچی، سادہ اور سیدھی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کی کہانیاں کرداروں پر گزرنے والے واقعات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ Character Based انہوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے:

"میری کہانیوں کے کردار میرے چاروں طرف گھومتے ہیں اور یہ کردار میرا پیچھا کرتے ہیں کہ مجھ پر لکھو، مجھ پر لکھو، ایسا لگتا ہے گویا کردار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مجھے سماج میں جگہ دلواؤ، میری اہمیت بتاؤ۔"

(میرے کردار)

واجدہ اور چھیدی میاں (ایک نیا آشیانہ) چکنی (سونے کا پنجرہ)، شرفو (ارب پتی) شبھم کی بیوی (امپورٹیڈ بہو)، سبحان میاں کی بیٹیاں (اڑنا کھلی فضا میں اے بے زبان سکھادے)، نموباجی (اپنا خون پرایا خون) اور دوسرے مختلف معاشرے کے کردار اپنی بپتا خود بیان کرتے ہیں، فریدہ عالم کردار وضع نہیں کرتیں صرف ان کی ترجمانی کرتی ہیں۔ کرداروں کے محسوسات کو انہوں نے اپنے احساسات وجذبات میں ڈھال دیا ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنے فن کے ذریعہ ایک امانت کو بغیر کسی خیانت کے ہم تک پہنچا دیا ہے۔

جس طرح ادب کے قارئین کا ان کے ذوق وفہم اور پسند وناپسند کے لحاظ سے الگ الگ طبقہ قائم ہوتا ہے اسی طرح ادبی نگارشات بھی بیک وقت تمام حلقۂ قارئین کے لئے یکساں نہیں ہوتیں ظاہر ہے فریدہ عالم کے قارئین کا طبقہ عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، منٹو

اور بیدیؔ وغیرہ فن کاروں کے قارئین سے مختلف ہوگا۔ بڑے سے بڑا صنعت کار بھی صارفین کی الگ الگ جماعت اور ان کے ذوق و معیار کا خیال رکھتا ہے۔ فریدہ عالمؔ کی پر اثر کہانیاں بھی اپنے حلقۂ قارئین میں پسندِ خاطر ہوں گی۔ اس کا مجھے یقین ہے۔ مجھے امید ہے کہ فریدہ عالمؔ کا تخلیقی انہماک ان کے فن کو اور بلندی تک لے جائے گا کہ -------- یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید۔ مستقبل کی مزید کامرانیاں ان کا انتظار کر رہی ہیں۔

(انتخاب۔ ۲۵ صفحہ ۸۵ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

مرغوب آثر فاطمی

اُردو زبان تخلیقی تحرک کا ایک موثر ذریعہ ہے۔اس زبان کے اعلیٰ رمز شناس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی جو اسے عام استعمال کے لئے سیکھتے ہیں یا جن کی خاندانی جڑوں میں اُردو کا بیج داخل ہے وہ اپنے تخلیقی تعمل کا ثبوت فراہم کرتے رہتے ہیں۔اُردو کے علاوہ شاید کسی زبان کو یہ سعادت حاصل نہیں ہے کہ اس سے واقفیت رکھنے والے ہر فرد میں اپنے داخلی جذبوں کے اظہار کی بے تابی پیدا ہو جائے۔عام کاروباری اور روزمرہ کے استعمال سے آگے بڑھ کر اُردو زبان اپنے جاننے والوں کو اپنی حدیث دل کے بیان کرنے پر اکساتی رہتی ہے ---اور زبان کی یہ ایک ایسی طاقت ہے جو ایک طرف اسے تادیر زندہ رکھ سکتی ہے اور دوسری طرف اس کے جاننے والوں کو فراغ و بشاشت عطا کر سکتی ہے۔جذبات و کیفیات کا اظہار شخصیت کی تعمیر کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

جناب مرغوب اثر فاطمی محکمہ پولس میں اپنی معیاد ملازمت پوری کر کے ڈی ایس پی کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے ہیں اور سال بھر کے اندر ان کا شعری مجموعہ 'منزل دشوار' اُردو کے ہم عصر شعری اثاثے میں ایک اضافے کی حیثیت سے سامنے آگیا ہے۔جناب اثر فاطمی نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ کچھ وراثت اور کچھ اہل سخن کی صحبتوں نے انہیں پولس کی ملازمت کے باوجود شعر گوئی پر مائل کیا ہے اور یوں یہ منزل دشوار ان کے لئے آسان ہوگئی ہے۔'منزل دشوار' کے ابتدائی صفحات میں خود فنکار نے نہایت مختصر انداز میں اپنے احوال بیان کئے ہیں۔اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے تخلیقی مزاج کی پرداخت میں کن نمایاں ادبی

شخصیتوں کا تعاون رہا ہے۔ 'دیباچہ' کے عنوان سے پروفیسر محمد منصور عالم (جو بقول مصنف شاعری میں ان کے استاد ہیں) کی تحریر ہے۔ اس کے بعد مناجات، منظومات اور پھر غزلیات کا سلسلہ ہے۔ مجموعے کے آخری حصے میں رباعیات ہیں اور چند موضوعاتی اور تقریباتی منظوم تاثرات ہیں۔

اپنی تمام تر لسانی اور فنی خامیوں کے باوجود جناب مرغوب اثر فاطمی کے شعری اظہارات کی ان معنوں میں اہمیت برقرار رہتی ہے کہ ان کی شاعری ایک فطری تخلیقی ابال کا نتیجہ ہے۔ یہ صناعانہ کاوشوں سے پاک ہے۔ اسی لئے تصنع سے دور ہے۔ یہاں وادیٔ کوہ و دمن میں پھیلے ہوئے خودرد پھولوں کا حسن ہے:

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

جناب اثرؔ تخلیقی جودت سے سرفراز ہیں۔ 'زندگی کی چاہ' اور 'شاعری کیوں؟' جیسی نظموں سے ان کی فکری توانائی اور اظہار کی برجستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے ان کے تخلیقی امکانات کا پتہ چلتا ہے اور ان کی شعری شخصیت سے آشنائی ہوتی ہے۔

صد شکر کامیاب ہوئی زندگی مری
وقت اخیر لب پہ ترا نام آگیا

دریائے زندگی میں تلاطم جب آگیا
کرنی پڑی ہمیں وہیں عزمِ جواں کی بات

کالی گھٹا کی چھاؤں میں ہے رقص جام و مے
پھر توبہ ٹوٹنے کے ہیں آثار کیا کروں

تمہارا فرض ہے حالات حاضرہ پہ اثرؔ
غزل کے شعروں میں اک تبصرہ سنا دینا

کبھی تو دشمنوں میں بھی جھلک ملتی تھی الفت کی
مگر اب دوستوں میں بھی خلوصِ دل نہیں ملتا

محبت میں ہے رنج وغم سے ہر دل کو شناسائی

ہمیں ناآشنائے غم کوئی بھی دل نہیں ملتا
ہم جو صحرا سے کبھی آبلہ پا گزرے ہیں
پھول کھلتے ہوئے پائے ہیں بیابانوں میں

جناب آثر کا توانا تخلیقی Out burst استاد کامل کی رہنمائی میں زیادہ پُر اثر ہوسکتا ہے اس لئے کہ اس میں بھرپور امکانات ہیں مگر یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید۔

(انتخاب۔۲۵ صفحہ ۸۷ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆
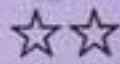
کرشن بیتابؔ

کرشن بیتابؔ کی تخلیقی شخصیت کا عرفان مجھے کچھ دیر سے ہوا یعنی اب جب اُردو میں ان کی کہانیوں کے تین مجموعے 'لمحوں کی داستان'، 'درد کی فصیل'، اور 'شعلوں پر برف باری' شائع ہو چکے ہیں تو ان کے مطالعے کے دوران مجھے یہ اندازہ ہوا کہ عصر حاضر میں اُردو افسانہ نگاری کے معیار کی پیش رفت کے سلسلے میں کرشن بیتابؔ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

بیتابؔ کئی دہائیوں سے پنجابی زبان کے علاوہ اُردو زبان میں بھی صنف افسانہ کی آبیاری کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طویل عرصے میں اُردو افسانے کے کئی ادوار کے نشیب و فراز کا منظر نامہ ان کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ متعدد عالمی وقوعے جن سے شعر و ادب کی دنیا متاثر ہوتی ہے بیتابؔ کے تجربات سے گزر چکے ہیں۔ خود غیر منقسم ہندوستان کے بہت سے واقعات و واردات ان کے یہاں تخلیقی تحرک کا کام کرتے ہیں۔ مختلف سماجی سیاسی، ثقافتی، تہذیبی اور معاشرتی تحریکات کے تموج سے گزرتے ہوئے کرشن بیتابؔ کی افسانہ نگاری کچھ ایسے امتیازات کی حامل ہو چکی ہے۔ جس کی وجہ سے آج اُردو افسانہ متموّل نظر آتا ہے۔

کرشن بیتابؔ کی کہانیوں میں جو خصوصیت ہمیں سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اردگرد کے معاشرے میں ایسے کرداروں کو تلاش کیا ہے جو ادھورے پن کے شکار ہیں۔ زندگی کی نا تکمیلیت ایک ایسا سانحہ ہے جو مختلف معاشرتی طبقوں میں رہنے والے افراد کے لئے ایک درد لا دوا بن کر رہ گیا ہے۔ ادھورا پن یا نا تکمیلیت کا احساس زندگی کا ایک ایسا Phenomenon ہے جس سے انسانی آبادی کا ایک بڑا حصہ دو چار بھی ہے اور جس کی

وجہ سے مختلف حالات میں اکثر و بیشتر اخلاقی قدریں متزلزل بھی ہو جاتی ہیں۔ کہانی 'ادھوری پوری' کی ارونا ہے جو لاولد رہنے کی وجہ سے مختلف طرح کی ذہنی صعوبت سے گزرتی ہے۔ زندگی کی ساری نعمتیں اس کے لئے بے مزہ ہو جاتی ہیں۔ وہ اس حد تک بے کیفی کا شکار ہو جاتی ہے کہ گھر میں بچے کی کلکاری سننے کے لئے اپنے شوہر اویناش کی بے پناہ محبت بھی اس کے درد کا مداوا نہیں کر سکتی لیکن جب اویناش گھر میں اسکول کھولتا ہے اور بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے آجاتے ہیں تو ارونا کی تنہائی، بے زاری اور بے کیفی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بیتاب کے یہاں ہمیں فریدہ کا ایک کردار ملتا ہے جو عام طور پر مردوں سے گریز کرتی ہے۔ اس کا غیر معمولی حسن دیکھنے والوں کو بے چین کیے رہتا ہے۔ سوجتن کے بعد جب رمیش اس سے قربت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے یکا یک یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عورت جو کپڑوں میں اتنی حسین لگتی ہے وہ کسی حادثے میں جسم کے اندرونی حصے میں جگہ جگہ سے جلی ہوئی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر محبت کا دعویٰ کرنے والا رمیش بھی فرار اختیار کر لیتا ہے۔ (کہانی: عورت مچھلی اور سمندر) مینا کا عاشق پارس ناتھ اپنی ناتکمیلیت سے گھبرا کر ایک جوگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ (کہانی: جوگی)۔ کرشن بیتاب کی دوسری کہانیوں میں بھی کردار کا ادھوراپن بنیادی موضوع بنتا ہے۔ اس مرکزے سے بیتاب نئے موضوعاتی تناظر پیش کر کے اپنی منفرد تخلیقیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

تمام تر درد آگیں صورت حال کی پیشکش کے بعد کرشن بیتاب اپنی کہانیوں کے ذریعہ ہمارے سامنے مثبت اور رجائی فکر لے کر سامنے آتے ہیں۔ انسانی معاشرے کے متعدد حادثات کے باوجود انسانی اور اخلاقی اقدار ہمارے لئے نجات کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ زندگی کی بنیادی احتیاجات اور مادی تقاضوں سے پیدا ہونے والی الجھنوں کے سد باب کے لئے کرشن بیتاب کے یہاں روحانی وسیلے کی صورت حال بھی روشن ہوتی ہے اور کہیں نہ کہیں سے یہ احساس ہوتا ہے کہ آج کے انسانی معاشرے پر چھائے ہوئے خوف کا علاج روحانی اور اخلاقی ذرائع سے ممکن ہو سکتا ہے۔

اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کرشن بیتاب کی نظر گزرے ہوئے سیاسی

اور سماجی طوفانوں کے ساتھ ساتھ کچھ غیر واضح خدشات کے گرد بھی گھومتی ہے۔ عہد حاضر یا مستقبل میں انسانی معاشرے پر عذاب بن کر نازل ہونے والے خدشات کرشن بیتاب کے یہاں تشویش کا باعث بن جاتے ہیں۔ سماجی اور سیاسی غیر محفوظیت کا ایک خوف ہے جو بیتاب کی متعدد کہانیوں میں کابوس بن کر جھانکتا نظر آتا ہے۔ 'بھگوڑا'، 'لمحوں کی داستان' جیسی کہانیوں میں یہ ہراس کچھ زیادہ ہی واضح ہے۔

تجربات کی کثرت اور فکر کی گہرائی کرشن بیتاب کے یہاں افسانے کی صنف کے مزید امکانات روشن کر رہی ہے۔ گورمیر مڈاہر بیتاب کو پنجابی کہانیوں سے باندھ کر رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ایک اصیل فنکار زبانوں میں مقید ہو کر رہنا پسند نہیں کرتا۔ بیتاب کی تخلیقی ہنر مندی پنجابی کی طرح اُردو میں بھی ان کی شخصیت کو منور کرتی رہے گی۔ مجھے اس کا یقین ہے۔

(انتخاب۔۲۶ صفحہ ۵۳ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆
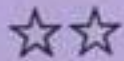
نور السلام ندوی

ابھی چند دنوں قبل جناب نور السلام ندوی نے اپنی کتاب 'رہنمائے صحافت' دیتے ہوئے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ میں اس کے سلسلے میں اپنے تاثرات قلم بند کروں۔ اپنی غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے پہلے تو میں نے معذوری ظاہر کی لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ کتاب کے ابتدائی صفحات میں حضرت مولانا سید ولی رحمانی، حضرت محمد خالد سیف اللہ رحمانی، ڈاکٹر عزیز برنی اور جناب راشد احمد جیسے معزز اور معتبر حضرات کے تاثرات موجود ہیں تو یکایک کتاب کی قدر وقیمت میری نظر میں بہت بڑھ گئی اور جب میں نے یہ تحریریں پڑھیں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کی وجہ سے جناب نور السلام ندوی کی کتاب میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ بسا اوقات منافع کی یافت اصل سرمایہ سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے متن کتاب کا نقص مقصود نہیں ہے۔ بلکہ ان تمام صحافی اور مشاہیر علماء نے کتاب کی جو قدر وقیمت بڑھائی ہے اس کا قرار واقعی اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تمام تحریریں الگ الگ اپنے طور پر تہذیب ومعاشرت اور تاریخ وصحافت سے متعلق گراں قدر اطلاعات فراہم کرتی ہیں۔ جناب راشد احمد نے اپنی تحریر میں صحافت کے بارے میں اپنے تجربے کے ساتھ ساتھ اپنی علمی واقفیت کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ میں نے دوران مطالعہ ان کی تحریر کے بعض حصوں کو خط کشیدہ کیا ہے اور وہ یہ ہیں:

(۱) روسی انقلاب کا پودا جس وقت نمو پذیر تھا تو اسی کے زیر سایہ ایک ادبی انقلاب کی کونپل بھی پھوٹ رہی تھی جس کو دنیا نے ترقی پسند تحریک کے نام سے جانا، جس نے پوری

دنیا کے ادب کے غیر معمولی طریقے سے متاثر کیا اور اس ادبی انقلاب نے بھی تمام نظام کہن اور فکر فرسودہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی۔

(۲) صحافت کی نمو کے لئے ٹھوس اقتصادی بنیاد ضروری ہوتی ہے۔ آزادی کے بعد اُردو صحافت اس سے یکسر محروم ہوگئی۔

(۳) آزادی کے بعد بھی ملک کی تعمیر اور ملی وقومی مفادات اور تحفظ کے معاملے میں اُردو صحافت نے اپنی بھرپور ذمہ داری ادا کی ہے اور اس کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ان اقتباسات کی توسیع وتفہیم کے سلسلے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ میں فی الوقت اس تفصیل سے صرفِ نظر کرتا ہوں۔ میں نے انہیں اس لئے نقل کیا ہے کہ ہمارے قاری حضرات ان سے دانش وآگہی حاصل کر کے ان خطوط پر غور کریں۔

اسی طرح مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور مولانا سید محمد ولی رحمانی صاحبان کی تحریروں سے بھی فکر ودانش کے جوار مغان حاصل ہوتے ہیں ان کی افادیت واہمیت نہ صرف عصر حاضر تک محدود رہے گی بلکہ ان کے ارشادات عالیہ آنے والی نسلوں کے افراد ملت کے کام آتے رہیں گے۔ ان دونوں گرانقدر شخصیتوں کے مندرجہ ذیل فرمودات ہمیں فکر وانبساط کی دوچند نعمتیں عطا کرتی رہیں گی:

(۱) تحریر کے ذریعہ جو پیغام انسان تک پہنچتا ہے اگرچہ فوری طور پر انسان کے جذبات کو مہمیز نہیں کر پاتا ہے لیکن وہ دل ودماغ کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ دنیا میں میں جتنے انقلابات آئے ہیں ان میں تقریر سے زیادہ تحریر نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ (مولانا خالد سیف اللہ)

(۲) یہ ضروری ہے کہ انسان ہمیشہ سچ ہی بولے لیکن یہ ضروری نہیں کہ انسان ہر سچ کو بول دے (مولانا خالد سیف اللہ)

(۳) اہم بات یہ ہے کہ (صحافی) تنقید وتنقیص اور پیچھے پڑ جانے کے فرق وفاصلہ کو نہ صرف سمجھتا ہو بلکہ برتنے کا مزاج بھی ہو۔ (وہ) حق گو نہ سہی بد گو نہ ہو اور حق شناسی کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ سلیقۂ اظہار کے ساتھ جرأت اظہار کی نعمت سے بہرہ ور ہو تو سبحان اللہ۔ (مولانا ولی رحمانی)

اب تفصیل میں جانے کی کوئی گنجائش نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ متذکرہ بالا تحریروں سے جناب نورالسلام ندوی کی اس کتاب کا وزن خاصا بڑھ گیا ہے۔

اُردو میں صحافت کے حوالے سے متعدد مقالات شائع ہوئے ہیں۔ بہت سی کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں سے بیشتر میں اُردو صحافت کی تاریخ پیش کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اخبارات ورسائل کب کہاں سے نکلے اور ان کے مدیران کے بارے میں جگہ جگہ اطلاعات ملتی ہیں۔ جناب نورالسلام ندوی کی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اُردو صحافت کی مختصر تاریخ کے ساتھ صحافت سے متعلق تکنیکی امور پر بطور خاص توجہ دی ہے۔ انہوں نے وضاحت اور قطعیت کے ساتھ اخبار کے Lay out اور اس کی ترتیب وتزئین کے سلسلے میں متعدد نکات پیش کیے ہیں۔ یہ ارباب صحافت کے علم میں اضافے کا کام کرسکتے ہیں۔ انہوں نے اخبار کے ابتدائیہ، اس کی سرخیاں جمانے کی باریکیاں، موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے سرخیوں میں ترتیب، کالم نویسی اور انٹرویو وغیرہ کی نزاکتوں کو جس طرح پیش کیا ہے اس سے ان کے فکر، مطالعہ اور تجربے کا اندازہ ہوتا ہے۔ عہد حاضر میں ذرائع ابلاغ میں جو غیر معمولی وسعت اور جہتیں پیدا ہوئی ہیں اور میڈیا کے نئے وسائل سامنے آئے ہیں ان کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب پرنٹ میڈیا صحافت کا ایک اوسط شعبہ بن کر رہ گیا ہے۔ نورالسلام ندوی کی یہ کتاب تحریری صحافت کے سلسلے میں ایک اہم ڈکومنٹ ہے۔ اس نوع کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں اس کا امتیاز بہر حال قائم رہتا ہے۔ کتاب کا نام 'رہنمائے صحافت' البتہ خاصا روایتی اور رسمی معلوم ہوتا ہے۔ اس نام پر 'رہنمائے صحت' یا 'رہنمائے حج و عمرہ' جیسی مطبوعات کی طرف ذہن چلا جاتا ہے۔ کتاب کے پر وقار مواد کے لحاظ سے اس کا نام بھی معیاری ہوتا تو اچھا تھا۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ

میں اس قیمتی پیش کش کے سلسلے میں مصنف کو مبارکباد کہتا ہوں۔

(انتخاب۔ ۲۶ صفحہ ۵۷ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆

رخسانہ صدیقی

مجھے رخسانہ صدیقی کے افسانوی مجموعے 'وجود' کے سلسلے میں اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ افسانے غیر رسمی انداز میں لکھے ہوئے ہیں اور یہ قصے کے وسیلے تک ہمیں فوراً احساسات تک پہنچا دیتے ہیں۔ اصیل تخلیق فن پارے کا اصل منصب بھی یہی ہونا چاہئے کہ وہ ہمیں دانش کی ان سرحدوں تک پہنچادے جہاں احساسات اور آگہی شیر و شکر ہوتے ہیں۔

رخسانہ صدیقی شاعرہ بھی ہیں۔ ان کی غزلوں کے اشعار اور ان کی مختصر منظومات کا مطالعہ تفصیل کے ساتھ ابھی سامنے نہیں آیا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کی شاعری انسانی مدرکات و محسوسات کی لطیف تر ترجمانی پر قادر ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ رخسانہ صدیقی اُردو کی لسانی تہذیب کی پروا کئے بغیر تخلیقی سرشاری کی حامل ہیں یہ تو سامنے کی بات ہے کہ لسانی شعور اور اظہار و بیان میں زبان کے معیار و اہتمام کا معاملہ الگ ہے اور تخلیقی ابال کے بے تابانہ فشار کا مسئلہ الگ ہے۔ زبان و بیان تخلیق کا ذریعہ اظہار ضرور ہے مگر جنوین حسن کار محسوسات کے اظہار کو لسانی چستی اور رضاعی کا اسیر نہیں ہونے دیا۔ بسا اوقات اظہار میں لسانی رکاوٹ اور تامل فن کار کو اپنی ذات میں اترنے اور اپنی رضا و رغبت سے اپنی بات پہنچانے کی قوت عطا کرتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جب تخلیق میں ترضع پیدا ہوتا ہے اور فنکار کی انفرادیت سامنے آتی ہے۔ غالب نے اس نکتے کو کچھ یوں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں:

"پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے رکتی ہے مری طبع تو

ہوتی ہے رواں اور تخلیق کی اس کرشمہ سازی رخسانہ صدیقی کے یہاں بھی
دیکھی جاسکتی ہے"۔

رخسانہ صدیقی کے افسانوں میں سماجی سروکار کے بعض اہم اور نہایت سنجیدہ پچویشن ہمیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ وہ عہد حاضر کی اخلاقی پستی، استحصال، مرد اور عورت کے تعلقات میں آنے والی پیچیدگیوں، کردار کی نفسیاتی گرہوں سے پیدا ہونے والے حیرت انگیز ردعمل، مقدس رشتوں کی پامالی، معاشی وسائل کے انحطاط سے انسانی رشتوں کی بدلتی ہوئی صورت حال کے ساتھ ساتھ علامات واشارات میں فرد اور معاشرے کے متعدد حقائق کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے فن میں سمیٹ لیتی ہیں۔

رخسانہ صدیقی کی تخلیقیت شاعری اور نثر کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے پر راضی نہیں ہوتی۔ ان کی بیشتر بیانیہ افسانوں کی تان بھی ان نقطوں پر ٹوٹتی ہے جہاں شعری کیف کا احساس ہوتا ہے۔ خاص علامتی انداز کی کہانیوں مثلاً 'سفر ایک عکس کا'، 'چوراہا'، 'نئی فصل'، 'روٹی کا درخت'، 'باچھیکی'، وغیرہ کے علاوہ کئی دوسری کہانیوں کا اختتامیہ حصہ کہانی کے عام متعارف منصب کو وسیع کرتا ہوا نظر آتا ہے اور انہیں بالآخر شعری تخلیقی فضا سے قریب کر دیتا ہے۔ ایسی جگہوں پر رخسانہ کی تخلیقی سرجوشی قاری کو ایک نئے عالم خیال تک پہنچا دیتی ہے۔ ایک جگہ رقص میں کمال حاصل کر لینے کے لئے ایک مضطرب لڑکی اپنی محویت میں اس مقام تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ استاد کی تحصیل پر رقص کرنے کا مجاہدہ اپنا لیتی ہے۔ کہانی کار کہتی ہے:

"پھر کیا تھا، وہ اچھل کر اس کی ہتھیلی پر چڑھ گئی اور بے اختیار ناچنے لگی۔ ناچتے ناچتے وہ تھکنے لگی کیونکہ ان ہتھیلیوں کی گری بوند بوند اس کے اندر اتر گئی اور پھر وہ وہیں پسر گئی۔ ٹھیک نو مہینے بعد اس نے ایک سورج جنا۔"

(کہانی: ہتھیلیوں پر رقص)

اس طرح اپاہج باپ اور سیٹھ مرل منوہر کے مل میں مزدوری کرنے والی ماں کو چھوٹی سی بچی ماں کو سیٹھ کے شکنجے میں دیکھتی ہے تو یوں محسوس کرتی ہے:

"چیخیں بلند ہوتی گئیں اور میرا قد گھٹتا گیا یہاں تک کہ میں ایک دم

بونی ہوگئی اور اپنی ماں کی کوکھ میں سماگئی"

(کہانی: وجود)

رخسانہ صدیقی کے افسانے ذہانت سے بھر پور ہیں ۔بیانیہ میں اتنے لطیف اشارات کا آمیزہ تیار کر کے انہوں نے افسانے کو تخلیق کے مرکزے سے قریب کرنے کی جو کوششیں کی ہیں ان سے آج جدید ترین اُردو افسانہ نگاری کو نئے آفاق مل سکتے ہیں۔

میں اس افسانوی مجموعے 'وجود' کا استقبال کرتا ہوں۔

(انتخاب۔۲۶ صفحہ ۶۰ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)
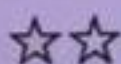
مسرت افزا روحیؔ

آج سے چند سال پہلے میں اکثر کراچی جاتا تھا وہاں کی ادبی محفلوں اور شعری نشستوں سے لطف بھی اٹھاتا تھا اور فیض بھی حاصل کرتا تھا۔ ادھر کم وبیش 9-8 برسوں سے یہ موقع حاصل نہیں ہو رہا ہے لیکن آج بھی ان صحبتوں کی یاد اکثر و بیشتر روشن ہو جاتی ہے۔ وہاں کی ادبی نشستوں اور شعری محفلوں میں جن فن کاروں سے ذہن ودل پر گہرے تاثرات قائم کئے ہیں ان میں چند نام آج بھی درخشاں ہیں۔ بلاشبہ ان میں ایک نام مسرت افزا روحی کا بھی ہے۔ کراچی کی متعدد شعری محفلوں میں ان کا کلام سننے کا موقع ملا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ خود ان کے دولت کدے پر بھی ایک بار بڑی پر تکلف اور سنجیدہ محفل منعقد ہوئی تھی۔

اب اتنے برسوں میں یادوں کے ان جلتے بجھتے چراغوں کو میں اس طرح تابناک بنا کر تو نہیں رکھ سکتا تھا لیکن خوش قسمتی سے روحیؔ کے زیر طبع شعری مجموعے کے کچھ حصے کے مطالعے کا شرف حاصل ہو گیا۔ اس کے ذریعہ مجھے ان کی منفرد تخلیقیت کے خدوخال دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع میسر ہو گئے ہیں۔ اس نعمت غیر مترقبہ کے لئے میں اپنے دوست جناب نصرت مرزا کا ممنون ہوں۔

مسرت افزا روحیؔ کی شاعری کا بڑا حصہ غزلیات اور منظومات پر محیط ہے۔ آج اُردو غزل نئے تجربات اور جدت کی راہوں پر بے تحاشہ بھاگ رہی ہے۔ اس رمِ برق آسا کے کچھ منفی نتائج بھی سامنے آرہے ہیں لیکن مجموعی طور سے غزل جذبوں کی گرفت اور موضوعات کی پیشکش کے اعتبار سے نئے طور اور نئی برق تجلی سے ہمکنار ہو رہی ہے۔ ایک منفی نتیجہ یہ

سامنے آرہا ہے کہ غزل اپنی بنیاد سے کھسکنے لگی ہے۔ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اُردو کی تمام اصناف سخن میں غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جو ہیئت ہی نہیں بلکہ موضوعات ومحسوسات، اشارات وکنایات اور الفاظ وتراکیب کے لحاظ سے روایت سے گہرے طور پر وابستہ رہ کر ہی اپنا حسن قائم رکھ سکتی ہے۔میں یہ مانتا ہوں کہ غزل محض روایت میں زندہ نہیں رہ سکتی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ غزل روایت کے بغیر بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔غزل کو جب روایت سے قطعاً منحرف کیا جاتا ہے تو یہ بازاری ہو جاتی ہے۔آج ہندوپاک کی شاعری کے منظرنامے میں اس کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں جہاں غزل کے ناغزل بننے کے آثار نظر آتے ہیں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ مسرت افزا روحی کی غزلیہ شاعری مستحکم اور توانا روایت کے ساتھ انفرادیت کی راہوں پر گامزن ہے جہاں تک نئے مسائل حیات کی پیشکش کا مسئلہ ہے تو غزل کی صنف اس بات کی شاہد ہے کہ سیکڑوں برسوں کی ریاضت سے غزل نے ہنرمندی سکھادی ہے کہ اس میں عصری مسائل اور ہنگامی حالات کی ترجمانی بھی اسی طرح ہو سکتی ہے جیسے ہجر ووصل اور معاملات عشق کے دیرینہ موضوعات بیان ہو سکتے ہیں۔

بنیادی طور پر غزل کے اشعار موضوعات ومسائل کی پیشکش سے زیادہ خارجی واقعات یا معاشرے کے عام سروکار سے پیدا ہونے والی بے کلی، انتشار، محزونیت اور اضطراب کی کیفیات ومحسوسات کو پیش کرتے ہیں۔غزل کے اشعار بیانیہ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔یہ وقوعوں کے نتائج میں پیدا ہونے والے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مسرت افزا روحی صنف غزل کی لطافت ونزاکت کو اچھی طرح سمجھتی ہیں۔اس لئے ان کے اشعار میں عام طور پر تہہ داری اور معنوی جہات کا احساس ہوتا ہے۔

مسرت افزا روحی کی غزلوں میں دانش وآگہی کی تہیں اس طرح نمایاں ہوتی ہیں کہ اکثر وبیشتر ان کی آواز شخصیت کے اندرون سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔الفاظ وبیان کے مروجہ اور فرسودہ طور طریقوں سے گریز کر کے روحی اظہار کو تہہ نشیں کیفیات سے ہم رشتہ کر لینے کا ہنر جانتی ہیں۔تخلیقیت کی ادا میں بیان کے عام منطقی ربط سے ہٹ کر ایک غیر منضبط، انوکھی اور نیم گفتہ وضع کا احساس ہوتا ہے، کہ یہی سچی تخلیقیت کی شناخت ہے۔ان اشعار پر غور کیجئے:۔

عمر بھر چلے لیکن گھر تلک نہیں پہنچے
اک مکاں بنانے میں دیر کتنی لگتی ہے
روحی بند مٹھی میں ریت جیسے لمحوں کی
گرد کو اڑانے میں دیر کتنی لگتی ہے
آرزو تھی تری رفاقت کی
سو دیئے کو جلا کے رکھا تھا
ستارہ مانگ لاتے ہم مقدر سے مگر روحی
طلب کی راہ میں یہ رہنمائی کچھ نہیں دیتا

روحی کے یہاں نجی احساسات وکیفیات ان کے معاشرتی سروکار کے اشارہ نما ہیں وہ جانتی ہیں کہ غزل برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است کا آرٹ ہے۔اس صنف لطیف میں خارجی وقوعوں کے کھردرے پن کی کوئی جگہ نہیں بنتی۔ یہاں فنکار کا اولین منصب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی حاصل کرنے کی کوشش کرے اور یوں ذات سے کائنات تک کا ایک ماورائی سفر طے کرلے۔دل کے تموجات کے وسیلے سے دنیا کے انقلابات تک رسائی کی توانائی غزل اور صرف غزل کے حصہ میں آتی ہے۔روحی کی شاعری میں اکثر وبیشتر یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ اپنے نجی محسوسات میں سرگرداں اور اپنی ذات کے محور میں رقصاں ہیں لیکن اپنی شخصیت کی یہ مرکزیت انہیں دنیا سے غافل نہیں کرتی بلکہ اردگرد اور دور دراز میں خارجی طور پر جو کچھ رونما ہو رہا ہے وہ بھی بہ انداز دگر روحی کے ذہن ودل پر دستکیں دیتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک سچے غزل گو کا پہلا رشتہ اس کی اپنی ذات کے نہاں خانے سے ہوتا ہے مگر فنکار کی باشعور اور حساس شخصیت بار بار اندرون سے بیرون کی طرف جست کرتی رہتی ہے۔مندرجہ ذیل اشعار اس معاملے کے ضمن میں پیش کئے جاسکتے ہیں:

ہجرت کے توسط سے رہی آبلہ پائی
اب سوزش وحشت سے پگھل جاتے ہیں ہم لوگ
لکھیں کیا شہر کے حالات اب ہم

مورخ ہی لہو لکھتا رہا ہے
وہ جس کے سر پہ ہے دستار عظمت شاہی
میں کج کلاہی کا عہد شباب کیا لکھوں
نہ جانے کون سی رت کا عذاب باقی ہے
فضا میں حبس کا رقص عتاب باقی ہے

مسرت افزا روحیؔ کی نظمیں 'محنت کش'، 'کیا بیٹا واپس آئے گا'، 'امید' اور ان سے بڑھ کر ان کے غزلیہ اشعار 'ایک عہد آشوب کا' منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار کی طرح بہت سے اشعار روحیؔ کے یہاں ان کی شخصیت کا ناگزیر جزو بن کر فنی جمالیات کے ساتھ ظہور میں آتے ہیں۔ انہوں نے افسانہ عالم کو اپنی ذات سے کبھی الگ نہیں ہونے دیا ہے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ شاعری فنکار کی نجی زندگی، اس کی فتح مندی، نامرادی، عدم تکمیلیت، مشاہدات اور اس کی دانش افروزی ---- سبھوں کی روداد ہوتی ہے۔ روحیؔ کے یہاں یہ ترجمانی کا حق بھی ادا کرتی ہے اور شخصیت کے لئے مداوا بھی ہے اور تکملہ بھی۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں فنکار پوری طرح منعکس ہی نہیں منور بھی ہے۔

می بینمت عیاں ودعامی فرستمت

(انتخاب۔ ۲۶ صفحہ ۶۲ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

جواں سال تنقید نگار ڈاکٹر ہمایوں اشرف تا حال متعدد کتابوں کے مصنف اور مولف ہو چکے ہیں۔تصنیف وتالیف کی کثرت اولاً تو ایک مثبت تاثر یہ قائم کرتی ہے کہ قلم کار کا مطالعہ وسیع بھی ہے اور وہ اپنے مطالعات کے اظہار کی قدرت کے ساتھ ساتھ بیان واظہار کی بے تابی اور بے چینی کا حامل بھی ہے۔لیکن اس بسیار نویسی کے کچھ منفی مظاہر بھی سامنے آسکتے ہیں۔دعا ہے کہ ہمایوں اشرف اپنی تنقید میں تکرار اور کم عیار نگارشات سے بچے رہیں۔ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'متن اور مفہوم' اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں تجزیاتی تنقید کے علاوہ تنقید کے اصول ونظریات پر بھی بحث کی گئی ہے۔ہمایوں اشرف کی سابقہ بیس مطبوعات میں مختلف فنکاروں کے تخلیقی اثاثے کے تجزیات ہیں۔اس کتاب میں بھی تجزیاتی تنقید پر مبنی مقالات ہیں۔ان مقالات میں بھی جگہ جگہ ہمایوں اشرف نے تنقیدی اصولوں کے حوالے دیئے ہیں۔پیش نظر کتاب میں 'ہیئت اور مواد کا باہمی ربط،متن اور مفہوم،سیاست اور شاعری،مارکسیت اور نئی مارکسیت،جدیدیت ایک محاکمہ،مابعد جدیدیت،تفہیم وتعبیر افسانے کا فن اور افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ جیسے مقالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نہ صرف کثرت مطالعہ سے مزین ہیں بلکہ وہ تخلیق شعر وادب کے عوامل کے رمز شناس بھی ہیں۔وہ ادبی تخلیق کے مسائل اور شرائط دونوں سے کماحقہ،واقف ہیں،ان مسائل پر وہ غور وفکر کے ذریعہ نتائج تک پہنچنے کی استعداد بھی رکھتے ہیں۔

ان کا مقالہ،ہیئت اور مواد کا باہمی رشتہ،کالرج کے اس قول پر مبنی ہے کہ:

The form of a successful work of art is shaped form within,not imposed form without.

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ ہمایوں اشرف بھی بے چون وچرا یہ مانتے ہیں کہ یہ جان لینا چاہئے کہ تخلیق ہمیشہ اپنی شکل اور ہیئت لے کر ظہور پذیر ہوتی ہے۔(۲۵) اس قول فیصل کے کچھ ضمنی پہلو بھی آتے ہیں، صاحب تصنیف نے ان جھمیلوں میں پڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ کالرج نے successful work کی شرط لگائی ہے، اس پر بھی غور کرنا چاہئے اور فکر کے خطوط پر چلتے ہوئے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ کامیاب فن پارہ کس حد تک اضطراری ہوتا ہے اور کہاں تک اس کی پیش کش میں فن کار کی ہنر مندی اور مشقت کا ہاتھ ہے۔

متن اور مفہوم کے ضمن میں ہمایوں اشرف کا مرکزۂ فکر یہ ہے کہ خود لکھنے والے اپنی تحریر میں پورے خیالات کی توضیح نہیں کر پاتے، کچھ ذہن میں رہ جاتے ہیں کچھ صفحات پر بکھرتے ہیں۔ gaps کو پُر کرنا قاری کا کام ہوتا ہے۔"(۲۸) یہ کہہ دینے سے تفہیم کے سلسلے میں فن کار پورے طور پر آزاد نہیں ہوسکتا۔ ناقد وقاری کو معنی ومفہوم کا شگاف عبور کرنا ہی چاہئے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ خلیج قابل عبور بھی ہو۔ فن کار تفہیم کے معاملے میں ان معنوں میں آزاد ضرور ہوتا ہے کہ خود تفہیم یا معنی آفرینی ایک غیر مستقل شئے ہے۔ ایک ہی فن پارہ الگ الگ مواقع پر مختلف مفاہیم دینے لگتا ہے۔ ایک شعر کسی ایک ماحول یا موڈ میں کچھ مفہوم دیتا ہے اور دوسرے ماحول اور موڈ میں اس کا مفہوم بدلنے لگتا ہے۔ مفہوم کی سیماب صفتی فنکار کی ذمہ داریاں کم کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے اپنے مقالے 'سیاست اور شاعری' میں بھی کئی فکر انگیز نکات پیش کئے ہیں۔ ان کا کہنا درست ہے کہ 'سیاسی طرز فکر کی اشاعت کے لئے ادب کو صدیوں سے استعمال کیا جا رہا ہے۔(۳۴) دراصل ادب اور سیاست کو یکسر ایک دوسرے سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری کی دسترس میں تو دوسرے شعبہائے حیات کی طرح سیاست بھی سما سکتی ہے لیکن اس کے لئے سیاست اور انفرادی طور پر اقتدار کی حصولی اور پھر عوام کو exploit کرنے کی حکمت عملی میں فرق کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ایسی خودغرض ذہنیت تو

انسانی اقدار، مذہب اور کلچر غرض تمام شعبوں کو آلودہ بناتی رہی ہے۔

ہمایوں اشرف کے کئی مقالات میں فکر و دانش کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔انہوں نے اس بات کی کوشش بھی کی ہے کہ ان نکات کو من وعن پیش کرنے کی بجائے ان پر تنقید کی جائے، ان کا علمی اور آزادانہ تجزیہ کیا جائے۔امکانات سے پُر نئی نسل کے اس نقاد کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ (انتخاب۔۲۶ صفحہ ۶۵ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆

نازؔ قادری

نازؔ قادری کی شناخت بیک وقت دو اصناف شعروادب یعنی شاعری اور افسانے سے متعین ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تنقید و تحقیق کے میدان میں بھی ان کی خدمات کا اعتراف ہوتا ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ ادب بالخصوص تخلیقی ادب سے سروکار رکھنے والوں سے یک در گیر و محکم گیر کا تقاضا نہیں کیا جا سکتا۔ سچے تخلیق کار کو کسی صنف یا ہیئت میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ تخلیقی فشار محسوسات کے اظہار و بیان کو ترجیح دیتے ہوئے فکر و دانش کی پیشکش کو اپنی منزل سمجھتا ہے۔ شاعری میں لفظوں کی غنائیت اور افسانے میں کرداروں کے پیچویشن فن کار کو کامیابی کے قریب لاتے ہیں۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تخلیقی شخصیت کے تعداد اور کثیر الجہت ہونے کے باوجود کوئی ایک شعبۂ تخلیق ایسا ضرور ہوتا ہے جس سے فن کار کی بھرپور پہچان بنتی ہے۔ نازؔ قادری کو ہم ان کی شاعری کے ذریعہ زیادہ بہتر طور پر پہچان سکتے ہیں۔ لیکن افسانے اور شاعری دونوں اصناف میں ان کی مطابقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عظیم اقبالؔ نے نازؔ قادری کے افسانوی مجموعے 'وہ ایک بات' کے ابتدائیہ میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''نازؔ نے اس دور میں افسانے لکھے جب ہم عصر افسانہ روبہ زوال تھا اور افسانے کے تار و پود بکھرنے لگے تھے۔ نازؔ کا کمال یہ ہے کہ ان کے اس دور کے افسانوں پر بھی عصری رنگ نہیں چڑھا۔ انہوں نے فیشن کی پیروی میں افسانے نہیں لکھے۔ اس لئے ان کے افسانوں پر وقت کی گرد بھی نہیں چڑھی۔''

کم وبیش یہی بات نازؔ کی شاعری کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے یعنی یہ کہ نازؔ قادری نے شاعری میں repulsive جدیدیت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے اسے مضبوط، مستحکم اور توانا شعری روایات سے وابستہ رکھا ہے۔ انہوں نے ہیئت واسلوب کے انتخاب میں بھی اس سنجیدگی، متانت اور خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے، جس کا تعلق ہماری خوشگوار شعری جمالیات سے ہے۔ ہیئتی، فکری اور موضوعاتی اعتبار سے جو عہد تجربات کی یورش کے نام سے پہچانا جاتا ہے وہاں نازؔ فکر اور لہجے دونوں جہتوں سے ثابتہ اقدار فن کے امین ثابت ہوتے ہیں۔ ان کا پر وقار اور مہذب ومؤدب تیور ان کے طوفان حیات کو سنبھل سنبھل کر بے نقاب کرتا ہے۔ انہیں انائے ذات کے حوالے سے یارائے ضبط عطا کرتا ہے، انہیں اضطراب پیہم میں بھی تہذیب غم کے آداب سے ہم رشتہ رکھتا ہے، انائے ذات کے حوالے سے یارائے ضبط عطا کرتا ہے۔ اپنے عہد کی فنکارانہ کرتب بازیوں اور بیان کی کرشمہ سازیوں سے ہٹ کر نازؔ کی تخلیقی سنجیدگی ان کی متانت ظاہر کرتی ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ جدید معجز نمائی سے ہٹ کر لہجے میں روایتی پائیداری کی حفاظت کرتے ہوئے تخلیقی منظرنامے پر اپنے اختصاص کی مہر ثبت کرنا نسبتاً دشوار عمل ہے۔ اس کے لئے ایک غیر معمولی تخلیقی اپج اور انہماک کی ضرورت ہوتی ہے۔ نازؔ قادری اس خصوصیت سے متصف ہیں۔ شاعری ان کے یہاں ایک مظاہرہ نہیں بلکہ ایک مکاشفہ ہے۔ یہ ان کے اندرون کی آواز ہے، ان کے یہاں داخلی جذبے الفاظ کا روپ اختیار کرتے ہیں، موضوعات ومسائل ان کے فکر کی راہوں سے ہویدا نہیں ہوتے بلکہ ان کے جذب وکیف کے ارتعاش سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے علم ودانش اور فکر ونظر کا حوالہ نہیں بنتی بلکہ ان کی مضطرب وملتہب شخصیت کا تعارف نامہ بن جاتی ہے۔ اس اضطراب والتہاب کی چند صورتیں دیکھئے:

دکھ مرا سمجھے کوئی درد آشنا ایسا نہیں
کیا کسی کو میرے حالِ دل کا اندازہ نہیں

نہ راس آئے کبھی نازؔ دن کے ہنگامے
ہر ایک رات رلاتا ہے آسماں مجھ کو

تاریک جسم وجاں کا سمندر دکھائی دے
ہر لمحہ مجھ کو خوف کا منظر دکھائی دے
ایک گرتے ہوئے گھر کی صورت
اٹھتے شعلوں کا دھواں ہے مجھ میں

وہ اپنے التہاب واضطراب کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن مظاہرہ نہیں کرتے۔ اپنے اندرون کی تہ نشیں کیفیات میں وہ کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے ہیں، خود ہی رقص بسمل کرتے ہوئے جذبوں سے سرشار ہوتے ہیں۔

کوئی شکوہ نہیں کسی سے مجھے
آئینہ خود کو اب دکھاتا ہوں
دل میں ہے نازؔ عہد گزشتہ کی بازگشت
ہونٹوں پہ داستاں ہے نئے حادثات کی
جہانِ فکر کی قدریں بدلنے والی ہیں
نئی حیات کی تصویر روبرو ہوگی
روشن تھی اس پہ حسن تدبر کی شاہراہ
وہ آدمی کہ جس کے مقدر میں کچھ نہ تھا

نازؔ قادری کے مجموعہ غزل 'صحرا میں ایک بوند' کے ابتدائی صفحات میں معتبر ناقدین کی رایوں سے بھی اس امر کا اثبات ہوتا ہے کہ فن کار عہد حاضر کے عذابوں کے سلسلے میں حد درجہ حساس ہے، اور اس کے اظہار کے لئے اس نے خود اپنا وسیلہ اظہار تلاش کر لیا ہے۔ اس کے خیال میں 'ساری ترقی بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ اقدار و معیار کا قلع قمع ہو چکا ہے۔ نئی زندگی کے ارتقائی کیف کو شاعر تنقیدی نگاہ سے دیکھ رہا ہے اور اس کی تنقید بہت وزنی ہے۔
''نازؔ قادری نے اپنی شاعری میں خلوص کے ساتھ سطحی اور سستے مذاق و انداز سے حتی الوسع گریز کیا ہے۔ 'تقریظ یا پیش لفظ جیسی تحریریں یا تو بالعموم تنقید سے عاری ہوتی ہیں، یا ان کی انتقادی حیثیت یہ ہوتی ہے کہ مصنف کے کارنامے کو promote کیا جائے۔ اس لئے ایسی تحسینی تنقید

اہل نظر کے نزدیک باوقار نہیں بنتی لیکن مقام شکر ہے کہ نازؔ قادری کے اس مجموعے میں ان کے کلام کے سلسلے میں ایسی رائیں موجود ہیں جو استناد کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن سے شاعر کے فن کی تفہیم کے سلسلہ میں کئی نکتے حاصل ہو جاتے ہیں۔ان تحریروں کا ماحصل بھی یہی ہے کہ نازؔ اپنے عہد میں آگے کی طرف سرپٹ بھاگنے والے تخلیقی رویے کے برخلاف ایک سنجیدہ اور معتبر لہجے کے ذریعہ اپنی منفرد پہچان کراتے ہیں۔ان کے یہاں غزل کی مضبوط روایت منفرد داخلی محسوسات سے ہم آمیز ہو کر جہانِ احساس کی آفرینش کرتی ہیں۔اقدارِ فن کو نئی پہنائیاں عطا کرتی ہوئی نازؔ قادری کی شاعری اپنی طویل العمری کی ضمانت دے رہی ہے۔

(انتخاب۔۲۶ صفحہ ۶۷ سن اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆

پروفیسر راحت حسین بزمؔی

پروفیسر بزمی کی پہلی کتاب 'مضامین رنگ رنگ' کے نام سے ۲۰۰۹ میں شائع ہوئی ہے۔ یہ ہلکے پھلکے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں ان کی ایسی تحریریں بھی شریک اشاعت ہیں جنہیں کہیں 'ادب لطیف' اور کہیں 'انشائیے' کا عنوان دیا گیا ہے۔ کتاب کے مشتملات کو اکابر سیاست، اکابر ادب، ادب لطیف، ادبی انشائیے، سماجی انشائیے اور تاثراتی انشائیے کے عنوان سے الگ الگ خانوں میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ تقسیم کہاں تک حسب حال ہے اس بحث میں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ ان تمام تحریروں کی بنیاد پر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پروفیسر راحت حسین بزمؔی ایک مخصوص انشا کے حامل رہے ہیں۔ انہوں نے سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع کو اپنی مخصوص انشاء کے ذریعہ اس طرح پیش کیا ہے کہ موضوعات پر طرز تحریر حاوی ہو جاتا ہے ورنہ یوں دیکھئے تو اس مجموعے کی تحریروں میں سیاست، ثقافت، اقدار حیات، علم و ادب، فنون لطیفہ، معاشرت، ادبی تنقید، افراد و اشخاص اور آثار و احوال کے ہشت پہل پہلو نظر آتے ہیں۔ یہ تحریریں عام طور پر مختصر ہیں ان میں مزاح و ظرافت کا رنگ غالب ہے۔ ان میں زبان و بیان، حروف و الفاظ اور تخلیقی نکات کے متعدد پہلو نظر آجاتے ہیں۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پروفیسر بزمؔی کی ان تحریروں سے جہاں ایک طرف سماجی، سیاسی اور معاشرتی اقدار کی آگہی ہوتی ہے وہیں اپنے اسلوب کی وجہ سے یہ قاری کو فرح مندی اور بشاشت کی کیفیات سے سرور و مطمئن کرتی ہیں۔

پروفیسر بزمؔی نے کتاب کے ابتدائی صفحات میں 'آئینہ' کے عنوان سے جو تحریر لکھی

رہے اس میں انہوں نے ازراہِ محبت میرا بھی ذکر کیا ہے۔ اس تحریر میں بعض باتیں ایسی ہیں جن کی وضاحت اور تصحیح ضروری ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ میرے نام میں حالیؔ کا تخلص وفا صاحب مرحوم کا عطا کردہ ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ بلکہ میرا نام مع تخلص میرے دادا جان حافظ مشکی پوری کا عطا کردہ ہے۔ انہوں نے پیدائش کے وقت ہی یہ تخلص جوڑ کر ایک طرح سے یہ پیشن گوئی فرمادی تھی کہ میں آگے چل کر شعروادب کے ریگ زار میں بادیہ پیمائی کروں گا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ صبح نو کبھی قلمی نسخہ کے طور پر منظر عام پر نہیں آیا۔ جناب وفا ملک پوری مرحوم نے اولاً اسے پورنیہ سے شائع کیا تھا اور بعد میں اسے پٹنہ سے شائع کرنے لگے۔ آج میرے استاد پروفیسر راحت حسین بزمیؔ اس دنیا میں نہیں رہے۔ ابتدائی دور کی یادیں آج تک میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ انہوں نے مختلف تحریروں میں جس محبت کے ساتھ میرا ذکر کیا اس کی بنیاد پر میں غیر معمولی فخر وانبساط محسوس کرتا ہوں۔

پروفیسر بزمیؔ کی دوسری کتاب ان کی خودنوشت سوانح ہے جو ''سمٹتی زندگی کے پھیلتے افسانے'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں پروفیسر بزمیؔ نے اپنے خاندانی حالات، آباواجداد، گاؤں کے ماحول، ابتدائی تعلیمی زندگی اور پھر زندگی کے متعدد چھوٹے بڑے واقعات قلم بند کئے ہیں۔ اسی ضمن میں میرا بھی ذکر ہے بعض دوسرے لوگوں کا تذکرہ بھی ہے۔ اپنے خاندان کے بزرگوں، ہم عصروں کے علاوہ بچوں کا ذکر اور احوال بھی ہیں۔ کہنے کو تو کتاب ان کی اپنی آپ بیتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں ۷۰۔۸۰ برسوں کی معاشرتی تہذیبی، سیاسی اور ثقافتی زندگی منعکس ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے پردادا اور دادا جان وغیرہ کے جو تفصیلی حالات بیان کئے ہیں ان کی بنیاد پر کتاب کم وبیش ڈیڑھ سو برسوں کی ایک مستند دستاویز بن جاتی ہے۔

پروفیسر بزمیؔ نے مختلف چھوٹے بڑے ایسے واقعات بھی قلم بند کئے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں کچھ ایسے تجربات بھی ہوئے ہیں جو مافوق الفطرت عناصر سے تعلق رکھتے ہیں کہیں کہیں بعض واہمے کا بیان بھی ہے۔ ان کی زندگی میں کئی حیرت انگیز واقعات رونما ہوئے تھے جن کی وجہ سے انہیں مافوق الفطرت عناصر سے دلچسپی ہی نہیں بلکہ ان پر انہیں

اعتبار و اعتماد بھی قائم ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنی اس آپ بیتی میں بعض خوابوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے قاری کو ایک طرح کا Thrill پیدا ہوتا ہے۔ بھاگلپور کے واقعات بیان کرتے ہوئے انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے۔

> ''ایک رات میں نے خواب میں محسوس کیا کہ کوئی میرے بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن چاندنی رات میں بھی کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے صرف یہ محسوس کیا کہ کوئی نازک نازک انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ لاکھ کوشش کے باوجود میں اپنی آنکھیں نہیں کھول سکا۔ چھ سات دن کے بعد پھر ایک رات ایسا ہی محسوس ہوا۔ میں نے جاگ کر دیکھا کوئی دس بارہ سال کی نہایت ہی خوبصورت سی بچی میرے بستر پر بیٹھی ہے۔ پہلے میں نے سمجھا کہ غلام گروش میں جو نوکرانیاں رہتی ہیں انہیں میں سے کسی دائی نوکر کی بچی ہوگی۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولی ''میں ہر جمعرات کو آپ کے پاس آؤں گی آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں''۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگئی۔ میں نے صبح سے اس کی تفتیش شروع کی کہ کہیں نوکرانیوں کے ساتھ اس طرح کی کوئی لڑکی تو نہیں لیکن کوئی ایسی لڑکی نظر نہیں آئی۔ وہ اسی طرح پھر رات گئے جمعرات کو آئی اور ایک آدھ گھنٹہ میرے ساتھ رہ کر چلی گئی۔''

پروفیسر بزمی کا کہنا ہے کہ وہ شخصیت کافی دنوں تک ہر جمعرات کو اسی طرح آتی رہی اس کے ساتھ ان کی صحت گرتی گئی۔ کسی مولانا سے تعویز لیا گیا۔ اس کے اثر سے آئندہ جمعرات کو وہ آئی تو ضرور لیکن ان کے بلانے پر بھی وہ بستر تک نہیں گئی اور یہ کہہ کر واپس ہوگئی ''چاروں طرف آگ لگا کر بیٹھے ہیں اور مجھے آنے کو کہتے ہو مجھ سے اتنی نفرت ہے تو اب میں نہیں آؤں گی''۔ ------- اور یوں اس کا آنا ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ اسی طرح کے کئی دوسرے حیرت انگیز واقعات قاری کی دلچسپی کا باعث بن جاتے ہیں۔ پروفیسر بزمی نے اپنی اس آپ بیتی میں بعض مقامات پر کچھ پرکشش ادبی اشاروں سے بھی کام لیا ہے۔

ایک جگہ مچھلی کے شکار کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح ایک بڑی سی مچھلی بنسی میں آکر چھوٹ گئی۔ اسی ضمن میں وہ اپنی زندگی کی محرومی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"آنے والی زندگی میں بھی اسی طرح ہاتھ میں آئی ہوئی مچھلی کئی بار پھسل کر پانی میں گرتی رہی ہے اور میں بے بس کھڑا دیکھتا رہ گیا ہوں۔"

غرض پروفیسر راحت حسین بزمیؔ کی کہ خودنوشت سوانح عمری مختلف خوبیوں کی حامل ہے۔ تحریر کی روانی اور واقعات کی ترتیب نے اس آپ بیتی میں غیر معمولی Readablity پیدا کر دی ہے۔

تیسری کتاب "نظر نظر کی بات" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ پروفیسر بزمیؔ کے شعری سرمائے کا مجموعہ ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ بنیادی طور پر ایک نثر نگار تھے۔ ان کی نثر میں سادگی اور شگفتگی کے بہت سے زاویے ہیں۔ جو قاری کے لئے دلچسپی کا باعث بن جاتے ہیں۔ شعری اظہار کے موقع پر یہ بات محسوس کی جا سکتی ہے کہ پروفیسر بزمیؔ شعر گوئی کے میدان میں روایتی یا مروج اقدارِ سخن کے قائل نہیں رہے ہیں۔ انہوں نے بحر و وزن اور ہیئت و پیکر کی حفاظت سے زیادہ موضوعات و محسوسات کی غیر صناعانہ روش اپنائی ہے۔ شاعری کا عام قاری اس مجاہدانہ روش سے کہاں تک مانوس ہو سکتا ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کم و بیش سو صفحات کے اس مجموعے میں غزلیں اور نظمیں دونوں شریک اشاعت ہیں۔ مجھے ان تخلیقی نگارشات میں نظم 'تم وہ نہیں ہو'، 'انتظار' اور 'ایک کے نہیں ہونے سے' جیسی پر اثر دوسری تخلیقات نظر نہیں آئیں۔ نثر نگاری کی مملکت پر مکمل دسترس رکھنے والے اس فرماں روا نے اقلیم سخن میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ یہی بہت ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ پروفیسر راحت حسین بزمیؔ کے ناولٹ 'اداس آنکھیں' کا مسودہ میرے پیش نظر ہے۔ پروفیسر بزمیؔ کی کئی مطبوعات سامنے آ چکی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناول، افسانہ، شاعری اور تنقید مختلف اصناف شعر و ادب پر ان کی دسترس رہی ہے۔ ان کی ہر تصنیف و تالیف سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تخلیق و تنقید کے کارِ مقدس میں وہ ہمیشہ

اس بات کا ثبوت پہنچاتے رہے ہیں کہ ان کی شخصیت بھیڑ سے الگ انفرادیت کے ساتھ سامنے آسکے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہنوز ان کے کارناموں کا مکمل جائزہ سامنے نہیں آسکا ہے۔ ان کی تحریریں صاحبانِ نقد و بصر کی توجہ کی منتظر ہیں۔

ناولٹ 'اداس آنکھیں' ایک جذباتی اور رومانی تخلیق ہے۔ اس کا قصہ سیدھا سادہ اور روایتی انداز کا ہے لیکن ناولٹ کے آخر میں فنکار نے قصے کو جس اختتام تک پہنچایا ہے اس سے قاری کے جذبات و محسوسات میں ایک غیر معمولی ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ پورے ناولٹ کو ۱۹، مختصر ابواب میں سجایا گیا ہے۔ قصہ بنیادی طور پر پرویز اور حمیدہ کے گرد رقص کرتا ہے۔ حمیدہ کے والد انور صاحب علاقے کے با اثر جج ہیں۔ حمیدہ کا بھائی سرور پرویز کا دوست ہے، جج صاحب اپنے بیٹے سرور اور بیٹی حمیدہ کے ساتھ 'سرور منزل' میں مقیم ہیں۔ گھر میں امیرانہ شان و شوکت ہے اور مختلف کاموں کے لئے ملازمین متعین ہیں لیکن حمیدہ فطری طور پر ذمہ دار لڑکی ہے وہ اس ماحول میں بھی اپنے زیادہ سے زیادہ کام خود ہی کرنا چاہتی ہے۔ اسے تعلیم حاصل کرنے کا بھی شوق ہے۔ جب سرور کا دوست پرویز 'سرور منزل' میں رہنے لگتا ہے تو حمیدہ کی شخصیت اسے اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے۔ سرور ایک جاں نثار اور وفادار دوست کی طرح پرویز کو 'سرور منزل' میں رہنے کو اصرار کرتا ہے۔ اپنے والد سے کہہ کر وہ اسے ایک کالج میں لکچرر کے عہدے پر بھی رکھوا دیتا ہے۔ حمیدہ پرویز سے قریب آتی رہتی ہے دونوں میں تدریجی طور پر محبت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، کالج کی چھٹیوں میں پرویز گھر پہنچتا ہے تو حمیدہ کی یاد اسے ستاتی ہے وہ اسے خواب میں بھی دیکھتا ہے۔ ادھر حمیدہ بھی پرویز کے لئے بے چین رہتی ہے۔

تخلیق کار نے اس سیدھے سادے اور عمومی قصے میں تہہ داری پیدا کرنے کے لئے سکینہ کے کردار کو وضع کیا ہے۔ یہ پرویز کی خالہ زاد بہن ہے، شروع میں ان دونوں میں ایک جذباتی تعلق تھا اور اگر حالات ساتھ دیتے تو سکینہ پرویز کی دلہن بن جاتی لیکن ایسا نہیں ہوسکا، حمیدہ کی قربت نے اس پرانے زخم کو مندمل کر دیا اب پرویز کی محبت کا مرکزہ صرف حمیدہ کی ذات تھی، گاؤں پہنچ کر پرویز اپنے دوست سرور اور حمیدہ سے مراسلت قائم رکھتا ہے، سرور اور حمیدہ کی والدہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ پرویز اس غم میں شریک رہتا ہے وقت آگے گزرتا ہے،

سرور اپنی ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہر میں چلا جاتا ہے اس کا باس ہربرٹ انگریز ہے۔ اس کی بیٹی مس میری سرور سے متاثر ہو جاتی ہے، انگریز باس اپنے اصول اور نظریات میں سخت ہے وہ دیر سے دفتر میں آنے کی سزا کے طور پر سرور کو سسپنڈ کرتے ہیں لیکن مس میری کی مداخلت سے سرور کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ ادھر حمیدہ اور پرویز کے تعلقات بھی مضبوط ہو جاتے ہیں اور سرور اور میری کی قربت بڑھتی جاتی ہے۔ مس میری سرور کا خیال رکھتی ہے اس کو ڈانس سکھاتی ہے اور اپنے باپ سے اس کی ترقی کی گزارش کرتی ہے۔ اس طرح سرور اس کمپنی کا جنرل منیجر ہو جاتا ہے۔ مس میری سرور کی محبت میں اپنی معاشرت بھی بدلنے لگتی ہے اور وہ انگریزی لباس چھوڑ کر ہندوستانی لباس پہننے لگتی ہے۔ اتفاقاً سرور کی ملاقات مس ڈیزی سے ہو جاتی ہے اور وہ اس کی طرف ڈھلنے لگتا ہے۔ مس میری کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے۔ تعلقات میں کچھ تلخی پیدا ہو جاتی ہے لیکن سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ پرویز پروفیسری کے ساتھ ملیٹری ٹریننگ بھی حاصل کر لیتا ہے اور این سی سی کا کیپٹن بن جاتا ہے۔ عین اسی وقت چین اور ہندوستان کی لڑائی شروع ہوتی ہے اس سے پہلے پرویز اور حمیدہ کی شادی انجام پاتی ہے کیپٹن پرویز اپنی بہنوں کی شادی کے موقع پر اپنے گاؤں جاتا ہے۔ حمیدہ بھی ساتھ رہتی ہے، کالج کھلنے پر پرویز واپس آتا ہے، حمیدہ سسرال میں رہ جاتی ہے۔ پرویز محاذ جنگ سے واپس آ جاتا ہے، سرور کے والد کا انتقال ہوتا ہے وہ اپنے گھر آتا ہے تو مسٹر ہربرٹ اور مس میری بھی ساتھ آتے ہیں۔ حمیدہ کی صحت گرتی جاتی ہے۔ وہ غیر معمولی طور پر جذباتی ہے، باپ کی موت نے اسے نڈھال کر دیا اس کے علاوہ وہ اپنے شوہر پرویز کے بچے کی ماں بننے والی ہے، صحت کی خرابی کی بنیاد پر مس میری یہ تجویز رکھتی ہے کہ حمیدہ کو اسپتال میں داخل کر دیا جائے لیکن حمیدہ اور پرویز اس تجویز کے لئے تیار نہیں ہوتے وہ اسے مشرقی تہذیب کے خلاف سمجھتے ہیں، حمیدہ کو ولادت ہوتی ہے لیکن بچہ مردہ پایا جاتا ہے۔ ادھر حمیدہ نقاہت اور بیماری کی وجہ سے نیم جاں ہو جاتی ہے اور بالآخر اس کا بھی انتقال ہو جاتا ہے۔

ناول یہیں پر ختم ہو جاتا ہے لیکن آخری حصے میں تخلیق کار نے جذباتی کیفیات کی پینٹنگ کی ہے۔ اس سے قاری متاثر ہو جاتا ہے۔ پرویز جب بھی اس مکان سے گزرتا ہے تو

اسے وہ کھڑکی یاد آتی ہے جہاں حمیدہ پرویز کا انتظار کرتی رہتی تھی وہ آج بھی کھلی ہوئی ہے لیکن اب سب کچھ بدل چکا ہے۔ پرویز کی سائیکل اس راستے سے گزرتے ہوئے اس مکان اور اس کھڑکی کے پاس خود بخود دست رو ہو جاتی ہے۔

میں مانتا ہوں کہ اس ناولٹ کے واقعات میں کوئی ندرت نہیں، قصہ روایتی انداز سے شروع ہو کر اسی طریقے پر ختم ہوتا ہے لیکن جو بات اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ناولٹ قاری کو ہمہ وقت اپنے آپ سے وابستہ رکھتا ہے۔ تمام واقعات میں جذباتی رشتوں کو اہمیت دی گئی ہے اور آخری حصے میں تو قلبی اور روحانی تعلق اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔

آج جب ناول کے نام پر نئے نئے تجربات ہو رہے ہیں اور بہت سے ناولوں کے تخلیق کار قاری کو تجربات کی پیچیدگیوں میں مبتلا رکھتے ہیں ایسے میں پروفیسر راحت حسین بزمی کی یہ تخلیق فن پارے سے قاری کو وابستہ رکھنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ موجودہ تجرباتی دور کی ذہنی ریاضت کے درمیان ناولٹ 'اداس آنکھیں' قاری کو فرحت بشاشت اور عافیت کا احساس دلاتا ہے۔

(انتخاب۔ ۲۷ صفحہ ۶۹ سن اشاعت ۲۰۱۳ء)

☆☆

معصوم شرقی

ڈاکٹر معصوم شرقی مغربی بنگال کے ہنر منداور فعال شاعروادیب کی حیثیت سے معروف ہیں۔آج کے ادبی منظرنامے میں اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ فن کار کو اپنی ادبی اور تخلیقی شخصیت کے اظہار کے دوران معاصرین کے ہمت شکن رویے کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔مغربی بنگال کا ادبی ماحول بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔معصوم شرقی بھی اس مذموم روایت کے شکار رہے ہیں۔اس لئے ادب وشعر کے تئیں اپنی تمام تر حوصلہ مندی کے باوجود ان کے انہماک اوران کی صلاحیتوں کا جو اعتراف ہونا چاہئے تھا وہ ہنوز نہیں ہو سکا ہے۔اس مسلسل ہمت شکنی کے باوجود ایک مشن کی طرح شعروادب سے وابستگی کو اپنی اولین ترجیح سمجھتے رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج مغربی بنگال کے اُردو معاشرے میں ان کی شخصیت اور کارنامے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ان سے میرا پہلا غائبانہ تعارف ان شعری تخلیقات کے ذریعہ ہوا جو کئی دہائیوں سے اُردو کے مقتدر رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔'عکس تاب' کے نام سے ان کی غزلوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔منظومات کا مجموعہ 'لمحوں کے قدم' زیر اشاعت ہے۔غزلیں ہوں یا نظمیں ان دونوں اصناف میں معصوم شرقی کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے کلام میں اظہار و بیان کی بے پناہ جولانی ہے۔

معصوم شرقی کا شعری مجموعہ 'عکس تاب' متعدد دانشوروں اور اہل قلم کی آرا سے مزین ہے۔علقمہ شبلی،ظہیر غازی پوری،ف س اعجاز،ڈاکٹر مولا بخش،اظہار اسعد،سلیم شہزاد اور رونق نعیم وغیرہ کی تحریروں سے معصوم شرقی کی غزل گوئی کی مختلف جہتیں روشن ہوتی ہیں۔یہ تحریریں

مجموعی طور سے نہ صرف جناب شرقی کی شاعری کا تعارف پیش کرتی ہیں بلکہ اس کی قدر و قیمت کا تعین بھی کرتی ہیں۔علقمہ شبلی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''معصوم شرقی ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے کھلی آنکھوں سے گرد و پیش کا مشاہدہ اور گہرائی سے زمینی حقیقتوں کا مطالعہ کیا ہے۔آج ہماری زندگی دوسروں کی شکست و ریخت ،اقدار کے انحطاط ،تہذیب کی پامالی ،معاشرتی انارکی ،چیرہ دستی اور سیاسی و اقتصادی بحران سے عبارت ہے---معصوم شرقی نے بھی اس کے اثرات قبول کئے ہیں۔''

اظہار اثر نے اپنی مختصر تحریر میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ:

''ڈاکٹر معصوم شرقی شہر نشاط کلکتہ کے مضافات (کانکی نارا) میں درس و تدریس کی مصروفیت کے ساتھ آج کی زندگی کے الجھنوں ،دشواریوں اور مسائل کو اشعار میں ڈھالتے رہتے ہیں۔فن شاعری کی کلاسکیت کے احترام کے باوجود ان کی شاعرانہ لہجے میں ایک ایسی کاٹ ہے جو ہر قاری کے دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے۔ان کی پوری شاعری آج کی سیاست زدہ زندگی کی آئینہ دار ہے اور نسل انسانی کی نئی زندگی اور نئے عہد کی چیرہ دستیوں پر بھرپور طنز بھی ہے۔''

معصوم شرقی نے اپنی ایک غزل میں شاعر کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے ان سبھوں کا اطلاق خود ان کی تخلیقی شخصیت پر پورے طور پر ہوتا ہے۔اس غزل کا ایک شعر یوں ہے:

جذبات کے شاداب جزیرے کا مسافر
اور شاہد معنیٰ کا طلبگار ہے شاعر

اور میں معصوم شرقی کی شاعری میں ان دو خصوصیات کو بطور خاص محسوس کرتا ہوں یعنی یہ کہ ان کی شاعری ایک طرف انسانی محسوسات و کیفیات کی بوقلموں منظر کشی کرتی ہے اور دوسری طرف ان کے کلام کی معنویت ہم عصر اُردو غزل کی موضوعاتی وسعت کے امکانات واضح کرتی ہے۔مجھے ڈاکٹر معصوم شرقی کے مندرجہ ذیل اشعار اچھے لگتے ہیں کہ ان سے اُردو

غزل کے موجودہ منظرنامے میں ان کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔

خالی نظر آنے لگے الفاظ کے کاسے
کیا گنج معنی کا پتہ بھول گیا ہوں

روشن ہمارے سینے میں ہے عزم کا ریاں
ہم تو چراغ راہ گزر مانگتے نہیں

مجھ کو چلنا ہے میں چلتا ہوں چلا جاتا ہوں
میں مسافر ہوں سرِ راہ ٹھہرنا کیسا

تھک گیا ہے چلتے چلتے کاروانِ ماہ و سال
وقت کی رفتار اب پہلے سے کچھ مدھم لگے

تمہارے شہر کی آغوش میں ہے دھوپ کی شدت
ہمارا گاؤں دامن میں ہرے اشجار رکھتا ہے

جوش بیان ایک فطری اور سچی شاعری کی پہچان ہے۔ہم عصر فن کاروں کی ایک جماعت تو وہ ہے جو چند مشہور شعرا کے لہجے کا اتباع کرنے اور اس میں نئے برگ وبار پیدا کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔معصوم شرقی اس اتباعی جماعت سے بالکل الگ ہیں۔ وہ شاعری کے Prevailing trend کا مطالعہ تو ضرور کرتے ہیں مگر تخلیقی سطح پر اس کے ساتھ انضمام نہیں کرتے۔ان کی بے ریا، راست اور بے حد توانا قوت اظہار نے صناعانہ آرائشوں کو کبھی خاطر میں نہیں لایا۔شاعری ان کے یہاں فکر واحساس کے Out burst کی طرح ظہور میں آتی ہے۔وہ اپنے لہجے کے خود خالق ہیں کہ یہی اصیل تخلیقیت کی پہچان ہے۔

ڈاکٹر معصوم شرقی نے اشک امرتسری کی شخصیت اور شاعری کے سلسلے میں گرانقدر تحقیقی مقالہ، نظیر ثانی: اشک امرتسری' کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔یہ وہ بے نظیر شاعر ہے جس نے عوامی موضوعاتی شاعری اور اپنے پُر جوش لب ولہجہ کی بنیاد پر مغربی بنگال کی تخلیقی فضا میں تازگی اور توانائی پیدا کی تھی۔لیکن آج کی سچائی یہ ہے کہ اشک امرتسری کو پہچاننے والے خال خال افراد ہیں اور ان کی طرح عوامی شاعری کو فروغ دینے والا کوئی شاعر موجود نہیں۔

نوبت بہ ایں جا رسید کہ ڈاکٹر معصوم شرقی کو نصابی تحقیقی مقالہ لکھ کر ان کی یاد تازہ کرنی پڑی۔ بنیادی طور پر میں اس بات کا مخالف ہوں کہ کسی فن کار کو ماقبل کے کسی دوسرے فن کار کا عکس قرار دیا جائے۔ وحشتؔ کو غالبؔ ثانی اور اشکؔ کو نظیر ثانی کے خطابات عطا کر کے ہم وحشتؔ یا اشکؔ کے تخلیقی مرتبے کو بلند نہیں کر سکتے۔ فن کار کی عظمت کبھی کسی مماثلت سے متعین نہیں ہو سکتی بلکہ سچی بات یہ ہے کہ فن کار اپنے متقدمین اور معاصرین سے مغائرت کی بنیاد پر منفرد ہو سکتا ہے۔ دوسروں کے پیچھے چلنے والا مقتدی ہو کر رہ جاتا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ آپ کا ممدوح فن کار ان افراد سے آگے نکلتا ہوا نظر آئے جن سے اس کی مماثلت قائم ہوتی ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ نظیر سے اتنی گہری مماثلت کے باوجود اشکؔ کس طرح نظیر سے الگ ہوتے ہیں اور اپنی منفرد راہ بناتے ہیں۔ بلاشبہ کچھ ایسے نکات موجود ہیں جہاں اشکؔ کو تقلیدی کی بجائے اجتہادی حیثیت کا حامل ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مقالے میں اس پہلو پر زور دینے کی ضرورت تھی۔

اس مسئلے پر بھی غور کرنا چاہئے کہ خود اُردو شاعری کی جمالیات میں نظیر اکبر آبادی کے رنگ سخن کا کیا مقام رہا ہے۔ نظیر پہلے بھی اجنبی تھے اور آج بھی اجنبی ہی ہیں یعنی یہ کہ عوامی موضوعات کے ساتھ عوامی لہجہ کل بھی اُردو کی شعری روایات کا حصہ نہیں رہا اور یہ آج اسے قبول کیا جا رہا ہے۔ نظیر کی دریافت نو ہوئی ان کے انفرادی کمالات کے تذکرے بھی ہوتے ہیں لیکن تخلیقی سطح پر اشکؔ امرتسری اور ان جیسے ایک آدھ فن کاروں کو چھوڑ کر کتنے لوگ ہیں جو اسے دل سے قبول کرتے ہیں اور نظیر کی بوطیقا برت رہے ہیں۔ اُردو کی شعری جمالیات جو پہلے تھی وہ آج بھی ہے۔ نظیر کا اجتہاد اور اشکؔ کا جذبہ ایثار اُردو کے شعری مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکا۔ آپ اسے ہماری تخلیقی جمالیات کی محرومی بھی کہہ سکتے ہیں۔

نظیر کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس تاریخ کا احترام بھی کرنا چاہئے لیکن یہ سکہ آج تک رائج الوقت نہیں بن سکا۔ خدا کرے نظیر کی روایت کے احیاء کار اشکؔ امرتسری کی قربانیاں رنگ لائیں اور ہماری تخلیقیت کا قبلہ درست ہو جائے۔ اس ضمن میں مجھے ڈاکٹر معصوم شرقی کے مجموعہ منظومات 'لمحوں کے قدم' کا بھی انتظار ہے۔

'نظیر ثانی: اشکؔ امرتسری' ایک گرانقدر تحقیقی و تنقیدی کارنامہ ہے۔ فلیپ اور

ابتدائی صفحات پر ظ انصاری، پرویز شاہدی، مظہر امام اور محمد حسن کی مختصر آراء اور بالخصوص ڈاکٹر کرامت علی کرامتؔ کی بسیط تعارفی تحریر نے اس کی رفعت میں اضافہ کر دیا ہے۔

(انتخاب۔ ۲۷ صفحہ ۵۷ سن اشاعت ۲۰۱۳ء)

☆☆
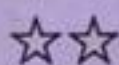
اویناشؔ امن

اُردو کی جدید تازہ کار نسل میں اویناش امن کی اصل شناخت ان کے ایک شعری مجموعے 'ابرِ رواں' اور انشائیوں کے ایک مجموعے 'ٹیوشن کے جھمیلے' سے قائم ہوتی ہے۔ یقیناً اس پہلو کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اویناش کا تعلق غیر اُردو داں خانوادے سے ہے۔ انہوں نے اُردو سے ذاتی اور نجی محبت کی بنیاد پر تعلق قائم کیا اور اپنی غیر معمولی استعداد اور ذوق وشوق کی وجہ سے اس میں مہارت حاصل کر لی ہے۔ نہ صرف اُردو بلکہ فارسی وعربی میں بھی اعلیٰ درجے کی علمی صلاحیت حاصل کر کے انہوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زبانیں کسی مخصوص مذہب وعقیدہ یا ملت و جماعت میں محصور نہیں ہوتیں۔ آج جب عام طور پر اُردو فارسی اور عربی سے بے اعتنائی برتی جا رہی ہے اور ہندوستان میں اس ثقافت کو بادِ مخالف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اویناش امن کا اس کلچر میں شامل ہونا ایک کرشمے سے کم نہیں۔ یہ بات جہاں ایک طرف اویناش کی شخصیت میں دلکشی اور دلاویزی پیدا کر رہی ہے وہیں اُردو زبان اور اس کی تہذیب وثقافت کی بقا کی بشارت بھی دیتی ہے۔

حیرت، مسرت اور موانست کے احساسات کے ساتھ میں نے اویناشؔ کی شاعری اور انشائیہ نگاری کا مطالعہ کیا تو ان دونوں اصناف میں ان کی طباعی اور انفرادیت کا اندازہ ہوا۔ نثر ہو یا شاعری ان دونوں کے لئے ایک پیمانہ اور معیار یہ بھی ہے کہ ان سے تخلیق کار کی شخصیت کا انکشاف ہو جائے۔ جب فن پارہ ایک جامِ جہاں نما بن کر فن کار کے اندرون کی سچائیاں ظاہر کرنے لگتا ہے تو اس میں صداقت اور بے ریائی کی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔

اوینا ش کی غزلیہ شاعری میں سادگی، بے ریائی اور اظہار و بیان کی غیر صناعانہ خصوصیت ملتی ہیں اور اس طرح وہ تمام Dimensions حاصل ہو جاتے ہیں جن سے فن کار کی شخصیت عرفانی ہو جاتا ہے۔ اُردو غزل نے ادھر چند دہائیوں میں اسلوب و لہجہ سے اعتبار کے مبدا افزا ترقی حاصل کی ہے۔ غزل کے آرٹ میں موضوعات کا تنوع اور تکرار اس قدر اہمیت کا حامل نہیں ہوتا جس قدر اس مخصوص لہجے کی یافت جس سے شاعر بھیڑ میں بھی آسانی سے پہچانا جا سکے۔ میں آجائیں بلاشبہ کامیاب و کامران سمجھا جاتا ہے۔ اوینا ش کی شاعری اس بات کا پتہ دے رہی ہے کہ وہ روش عام سے ہٹ کر جادۂ خاص پر چلنے کا آرٹ جانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس منفرد آواز کی مکمل شناخت مشق و ریاضت کے مسلسل مجاہدے پر منحصر ہے۔ اور اوینا ش کو اس راستے پر ابھی بہت دور جانا ہے۔

'ٹیوشن کے جھمیلے' اوینا ش امن کے فکاہیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں ڈاکٹر آصف سلیم نے اویناش کے انشائیوں کا نہایت وقیع مطالعہ و جائزہ پیش کیا ہے اور بلاشبہ اس تحریر سے خود کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اویناش کے ان انشائیوں کے مجموعے کو یک مصنوعی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، اس لئے کہ ان تمام انشائیوں میں ایک ماسٹر جی نظر آجاتے ہیں جو اصل میں نچلے اوسط درجے کے اقتصادی مسائل سے گھرے ہوئے افراد کا ایک استعارہ ہے۔ موجودہ صارفی نظام میں علم کی بے قدری اویناش کے فکر کا بنیادی محرک ہے۔ انہوں نے فرد کو سامنے لا کر معاشرے کے احوال بیان کئے ہیں۔ ان تحریروں میں بظاہر مزاح و ظرافت کا شائبہ ہوتا ہے مگر بنیادی محرک کی سنگینی کو سامنے رکھا جائے تو ان میں ایک Pathos کا احساس ہوتا ہے۔ اجتماعی ٹریجڈی (جسے عہد حاضر کی calamity بھی کہا جا سکتا ہے) کچھ اس انداز میں اویناش کے یہاں بیان ہوئی ہے کہ تفنن اور مزاح کے عناصر کے باوجود تلخی، حالات باقی رہ جاتی ہے۔ یہاں مزاح پر طنز حاوی ہو جاتا ہے اور یہی چیز ہے جو اویناش کے فکر کی سنجیدگی ثابت کرتی ہے۔ تحریر کا یہ deception اویناش کے لئے ایک مائیہ امتیاز بن سکتا ہے۔ شرط یہ ہے وہ انشائیہ نگاری کو اپنا خاص میدان کار سمجھیں اور اسی پر مرتکز ہوں۔ (انتخاب۔ ۲۷ صفحہ ۹۷ سن اشاعت ۲۰۱۳ء)

افسانہ خاتون

اُردو کے تخلیقی ادب کے حوالے سے ڈاکٹر افسانہ خاتون نے اپنی معتبر شناخت قائم کرلی ہے۔ ان کے متعدد افسانے اُردو کے معیاری جرائد میں شائع ہو کر سنجیدہ قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر چکے ہیں۔ خاص طور پر ان کے ناول نے موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے ہم عصر اُردو ناول نگاری کو ایک نیا ڈائمنشن دکھانے کی طرح نگاہ ڈالی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ناول اکابر ناقدین کی قرأت کو کس حد تک سمیٹ سکا ہے، مگر آج یا کل اس کا محاسبہ ہونا ہی ہے۔

فکشن کی جس نئی راہ پر ڈاکٹر افسانہ خاتون نے چلنے کی کوشش کی ہے میری خواہش تھی کہ وہ اسی سفر پر مرتکز ہوں لیکن یکا یک ان کا ایک انتقادی کارنامہ سامنے آگیا ہے۔ یہ ان معنوں میں غلط بھی نہیں ہے کہ تخلیق و تنقید کی شرکت اور یکتائی کو چیلنج بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خود مصنفہ نے اپنی اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں اس حقیقت پر اصرار کیا ہے کہ تنقید اور تخلیق دونوں ایک دوسری کے لئے معاون ہیں، ان میں باہمی مغائرت اور بعد کا جو تصور پیش کیا جاتا رہا ہے وہ ان دونوں کی صحت کے لئے مضر ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اچھا تخلیق پارہ تنقیدی شعور کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا اور اسی طرح ادبی تنقید کا تصور تخلیقات کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں اور کہیں نہ کہیں سے ایک دوسری کے لئے تکملہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تخلیق و تنقید کی یہی قریبی رشتہ داری ہے جس نے ڈاکٹر افسانہ خاتون کو نقد و بصر کے دشت خارزار میں آنے کے لئے محرک کا کام کیا ہے۔ اُردو تنقید میں خواتین کی شرکت گاہ

گاہ اس لئے بھی کھٹکتی ہے کہ تخلیقی سطح پر تو خواتین کی خدمات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا لیکن تنقید سے ان کی دلچسپی اور اس میدان میں ان کی خدمات جس حد تک ہیں ان کا بھی صحیح اعتراف نہیں ہوسکا ہے۔

ڈاکٹر افسانہ خاتون کا پیش نظر مطالعہ اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے اُردو ادب میں نسائی حصہ داری کے ایک باب کو آگے بڑھایا ہے۔اس مضبوط بنیاد پر تحقیق وتنقید کی مزید منزلیں طے کی جاسکتی ہیں۔

میں ڈاکٹر افسانہ خاتون کی اس کتاب کا استقبال کرتے ہوئے انہیں یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ اُردو فکشن کو بہر حال ان کا انتظار رہے گا۔

(انتخاب۔۲۷صفحہ ۸۱سن اشاعت ۲۰۱۳ء)

ایم نصر اللہ نصرؔ

جواں سال فن کار ایم نصر اللہ نصرؔ کی دو مطبوعات میرے پیش نظر ہیں۔ 'امکان سے آگے' ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے اور 'کلام مطرب' میں انہوں نے شباب مطرب بلیاوی کے مجموعے 'شجر درد کے پھول' کے ساتھ ان کے باقی ماندہ کلام کو شائع کر کے معیار سخن کے سلسلے میں اپنی خوش ذوقی کا ثبوت فراہم کیا ہے لیکن اس انتخاب اور پیش کش کے بارے میں انہوں نے کہیں اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا ہے۔ 'کلام مطرب' کے جس نسخے کی ترتیب ایم نصر اللہ نصر نے کی ہے اس پر تمہیدی اور تعارفی تحریر شمس افتخاری نے لکھی ہے۔ کتاب کے دوسرے اور آخری حصے میں مطرب بلیاوی کے مجموعہ کلام 'شجر درد کے پھول' (مطبوعہ ۱۹۸۸ء) کو شریک کر لیا گیا ہے۔ اس پر سالک لکھنوی کی تعارفی تحریر ہے۔ تعجب ہے کہ کتاب کے مرتب اپنے حق سے دست کش کیوں ہو گئے اور مطرب بلیاوی کے کلام کے تعارف و تنقید کا سارا کریڈٹ دوسروں کو کیوں کر دے دیا۔ بہر کیف اس پیش کش سے یہ اندازہ تو ضرور ہو جاتا ہے کہ نصر اللہ نصرؔ اپنے بزرگ معاصر کے تخلیقی مرتبے سے واقف ہی نہیں اس سے متاثر بھی ہیں۔ مطرب بلیاوی کے کلام سنے جاؤ اور ان کی منفرد تخلیقیت کی بنیاد پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ بسا اوقات شاعر کی انفرادیت اسے استعاری شاگردی کے حصار سے باہر کر دیتی ہے۔ فن کار کو بڑی نصرت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ استاد کے خم دست نوازش سے باہر نکل آئے۔ پھر کوئی نہیں پوچھتا کہ اقبالؔ کس کے شاگرد رہے ہیں اور مطربؔ بلیاوی نے کن حضرات کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا ہے۔

ایم نصر اللہ نصر کا اپنا تخلیقی کارنامہ 'امکان سے آگے' ہے۔اسی مجموعے کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ نصر کی غزل گوئی 'امکان سے آگے' ہو یا نہ ہو کم سے کم یہ توقع سے آگے ضرور ہے۔ یہ بات میں معاصر اُردو غزل گوئی بالخصوص مغربی بنگال میں اُردو، غزل گوئی کے معیار کی روشنی میں بڑے تیقن کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔نصر نے غزل کی فنی حرمت کو بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ان کے مندرجہ ذیل اشعار آج کی غزلیہ شاعری کی نئی جہات کی خوبصورت مثالیں ہیں:

دیر تک خوشبوؤں میں غرق رہا
جب اٹھا ان سا گفتگو کر کے
زندگی دھوپ میں گزاری ہے میں نے سائے کی آرزو کر کے
حال کیا ہوگا بچھڑ کر آپ سے مار کر شیشے پر پتھر دیکھئے
نہ مہربان سے الفت نہ جگنو ہم سفر میرا
میرے ظلمت کدے میں پھر ستارہ کون رکھتا ہے؟
کون گزرا ہے دل کے آنگن سے
صحن میں روشنی غائب کی ہے
سنتے ہیں کہکشاں ہے ستاروں کے رہ گزر
ہم سے ابھی وہ راہ گزر کتنی دور ہے؟
ولی سخن کی دور ہے یہ جانتا ہوں نصر
مجھ سے مگر وہ شہر ہنر کتنی دور ہے؟

میں نصر اللہ نصر کی غزلیں پڑھ کر خاصا محظوظ و مسرور ہوا ہوں اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نصر اپنی تمام جلوہ آرائیوں کے ساتھ اس شہر ہنر میں موجود ہیں بلکہ اس کے امکانات کی وسعت کی علامت بن رہے ہیں۔

ڈاکٹر معصوم شرقی، علامہ شبلی، ابراہیم اشک، سید شکیل دسنوی، ڈاکٹر جعفر عسکری، جناب قیصر شمیم، منظر حنفی اور ڈاکٹر احمد امتیاز نے نصر اللہ نصر کی غزل گوئی کے جلوہ صد رنگ کو

نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ اچھی اور سچی شاعری کی ہزاروں تشریحات وتعبیرات کی جائیں اس کے بعد بھی یہ احساس رہ جاتا ہے کہ 'حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا'۔ 'بسیار شیوا است بتاں راہ کے نام نیست' یہ مصداق نصر اللہ نصر کی شاعری کی بہت سی تہیں ہنوز پوشیدہ ہیں۔ اگر انہوں نے مشاعروں کی مقبولیت کو سمجھ کر اپنے اندرون میں اتر کر اور اپنے آپ کو مخاطب قرار دے کر وظیفۂ سخن کرتے رہے تو واقعی وہ امکان سے آگے ہو سکتے ہیں۔

(انتخاب۔ ۲۷ صفحہ ۸۲ سن اشاعت ۲۰۱۳ء)

شرجیل احمد خاں

شرجیل احمد خاں کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ فلسفے اور اساطیر کے سلسلے میں ان کی دلچسپی اور ان کے گہرے مطالعے کے نتیجے میں کئی ایسی مطبوعات سامنے آچکی ہیں جو اُردو ادب میں اضافے کا باعث ہیں۔ ان کے فکر ونظر اور مطالعے کا بنیادی منبع انگریزی ادب و فلسفہ کی کتابیں ہیں۔ انہوں نے ڈیکارٹ، برکلے، شوپن ہار، نتشے، فرائڈ، یونگ اور لیوی اسٹراس وغیرہ جیسے مغربی مفکرین سے دانش و آگہی کے حصول میں مدد لی ہے۔ ان کی دو کتابیں 'یونانی اساطیر کی ڈکشنری' اور 'تصدیق ادب کے مسائل' ابھی حال میں مطالعے سے گزری ہیں۔

اول الذکر کتاب کا افتتاحیہ ایک وقیع مقالہ ہے جس میں مصنف نے اساطیر اور دیومالا کی ابتدا اور اس کی بنیادی اہمیت سے بحث کی ہے۔ اسی ضمن میں حواس خمسہ کی کم رسائی، چھٹی حس کی اہمیت، دماغ وذہن کا رشتہ، شعور، تحت الشعور، لاشعور کے مسائل اور اس سلسلے میں مفکرین کے تصورات، ہندوستانی دیومالا، اساطیر ومذاہب کا باہمی تعلق اور تاریخ اساطیر وغیرہ متعدد مباحث ومسائل پر روشنی ڈالی گئی ہیں۔ اس افتتاحیہ نے ڈکشنری کی علمی حیثیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ مرتب لغت جناب شرجیل احمد خاں نے یونان وروم کے قدیم ترین شعری ونثری کارناموں سے ان کرداروں کا تعارف نامہ پیش کیا ہے جن سے اساطیر کی تشکیل ہوتی ہے اور جو قدیم ادبیات کی تخلیق میں اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ قدیم ادبیات عالم کی تفہیم میں ان کرداروں اور ان کے اعمال واقدام کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان قصص اور شعری تخلیقات میں کرداروں کے عمل دخل کی پیچیدگیاں عموماً قارئین کو بھی الجھن میں

ڈال دیتی ہیں۔شرجیل احمد خاں نے یہ مشکلیں آسان کرنے کی کوشش کی ہیں۔مصنف کی دوسری کتاب تصدیق ادب کے مسائل ایک نہایت کارآمد پیش کش اور اہم کارنامہ ہے۔ جناب شرجیل احمد نے اپنے متعدد مقالات کے ذریعہ ادب اور فلسفہ کے ناگزیر رشتے پر روشنی ڈالی ہے۔ان کی تحریروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تخلیقی فن پاروں کے معیار کی تصدیق وتوثیق اسی وقت ممکن ہے جب عالمی سطح پر مستند صاحبان فکر ونظر کے خیالات وتصورات سے روشنی حاصل کی جائے۔پیش نظر کتاب کے مقالات:۔تخلیق کار اور فنتاسی،تصدیق ادب کے مسائل اساطیری تنقیدی نظریہ،تفہیم ادب کے مسائل،شاعری کے حدود،فن اور اخلاقیات اور تصدیق جمال کا مسئلہ خصوصیت کے ساتھ اہمیت کے حامل ہیں۔شرجیل احمد خاں عصر حاضر کے ادبی معیار کی تلاش میں بعض دوسرے ناقدین اور مفکرین کی طرح مغربی فلسفیوں کی زنبیل فکر سے جو کچھ نکال پائے ہیں وہ عصری رجحانات فن اور تخلیقی جمالیات کے باب میں سکہ رائج الوقت تو ضرور ہیں لیکن جی چاہتا ہے کہ یہ جویائے فکر ونظر کبھی مشرقی جمالیات فن کو کھنگالنے پر آمادہ ہو جائے۔ تاکہ تصدیق ادب کے لئے ایک متوازن پیمانہ مقرر کیا جا سکے۔اس کی اہمیت یوں بھی ہے کہ فارسی واُردو ادبیات کو اپنی جمالیاتی روایات کے ساتھ ہی عالمی معیار عطا کیا جا سکتا ہے۔

(انتخاب۔۲۷صفحہ۸۴سن اشاعت ۲۰۱۳ء)

پروین شیر

پروین شیر کو اب اس کی تو ضرورت نہیں رہی کہ کوئی شعر وادب کا وابستہ اور اچھی شاعری کا وارفتہ ان کے سلسلے میں اپنے مطالعات رقم کرے اور پروین شیر کو متعارف کراتے ہوئے ان کے شعری کمالات کا تجزیہ کرے۔ اب اگر ہم پروین شیر کے بارے میں کچھ لکھتے ہیں تو اس کا صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ عہد حاضر میں اُردو شاعری اور دانشوری کے باب میں اس شہرت یافتہ فن کار کو ہم نے اپنے طور پر کیا سمجھا ہے اور اس کے فن سے ہم کس طرح کسب فیض کرتے ہیں۔

ہر عہد میں بڑا فن کار اپنے دور کی نمائندگی کرتا ہے۔ معاشرے کے نئے احوال و مسائل ہمارے فکر و احساس پر مرتسم ہوتے ہیں اور جیسے جیسے معاشرے کی صورت حال میں تغیرات پیدا ہوتے جاتے ہیں اسی طرح فن کے موضوعات و اسالیب میں تبدیلی پیدا ہوتی جاتی ہے، محسوسات و جذبات کی نوعیت بدلنے لگتی ہے اور اب فن پارہ نئی سچائیوں کا ترجمان بنتا جاتا ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جو فن کار اپنے فن پاروں میں اپنے عہد کی سماجیات، اخلاقیات اور اسالیب کو جس قدر منعکس کر سکتا ہے وہ اسی قدر جدید ہوتا ہے۔

پروین شیر کا اولین شعری مجموعہ ''کرچیاں'' اگر ایک طرف ان کے ان محسوسات سے لبریز ہے جن کا تعلق عوامی انسانی ہمدردی سے ہے تو دوسری طرف دوسرا مجموعہ ''نہال دل پر سحاب جیسے'' ماں سے متعلق ان کے خالص نجی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اول الذکر مجموعہ ذاتی مشاہدات، انسانی اور اخلاقی اقدار کے وسیع تر تناظر، استحصال کے خلاف بیزاری

، ناداروں اور مفلسوں نیز ان کی معاشرت کی زبوں حالی کے بھرپور تاثر کا عکاس ہے۔ یہاں پروین شیر نے غم کائنات کو غم ذات میں سمیٹ لیا ہے، یہاں موضوعاتی بسط وکشاد ہے۔ احساس کی شدت اور موضوع کے تخلیقی برتاؤ نے ''کرچیاں'' کی منظومات میں پروین کی شخصیت کے دانشورانہ پہلوؤں کو دل نشیں انداز میں ابھارا ہے۔ شاعری کے مکمل طور پر ذاتی اور نجی ہونے کا تعلق اس امر سے ہے کہ فن کار کے دائرہ احساس میں اپنے اور بیگانے کا امتیاز مٹ جائے۔ ''کرچیاں'' کے تخلیقی محرکات کی جو تفصیل پروین شیر نے بیان کی ہے اور جسے پروفیسر خالد محمود نے ''چہرۂ گل دھواں دھواں سا'' کی تمہیدی تحریر میں بطور خاص نمایاں کیا ہے اس بات کی مظہر ہے کہ پروین شیر کا تخلیقی مرتبہ ان مقامات پر زیادہ بلند ہو گیا ہے جہاں درد کا رشتہ تمام رشتوں پر مقدم ہو جاتا ہے۔ میں ''کرچیاں'' اور ''نہال دل پر سحاب جیسے'' کی تخلیقات کا موازنہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اس حقیقت کی طرف اشارہ ضرور کروں گا کہ ''کرچیاں'' میں پروین کی سماجی حسیت اور ان کا اجتماعی شعور نہایت بالیدہ اور پر اثر ہے۔ چہرۂ گل دھواں دھواں سا ہے پروین کی منتخب منظومات اور غزلیات کا مجموعہ ہے جس سے ان کی غیر معمولی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروین شیر نے غزلیہ اشعار اور نظموں کے ذریعہ مادی اور طبیعی تجربات سے روحانی اور اقداری تجسس کی ایک انوکھی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور یوں انہوں نے ایک نئے جہان سکون کی کھوج کی بنیاد ڈالی ہے۔ میں مثالوں کے ذریعہ تحریر کو طول دینا نہیں چاہتا۔ ناقدین فن اور شائقین سخن پروین کے تینوں مجموعے سے ان کے تخلیقی امتیاز کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ پروین کے یہاں سکون وسکوت کی تلاش، زندگی کی محرومیوں سے نجات، حرص وآز کی اس دنیا سے بیزاری اور فراغ وکشاد کی سبیل تلاش کرنے کا جذبہ ان کی فنا پسندی کی نفسیات کا مظہر بھی بن جاتا ہے۔ ایک جگہ کہتی ہیں:

خموش بستی کے رہنے والے
زمیں کی آغوش میں ہیں سمٹے
ادائے گیتی کو جاں پہ اوڑھے

جہانِ غل سے نجات پا کر
سکون کی نیند سو گئے ہیں
ابد کی دنیا میں کھو گئے ہیں
ہیں ختم سب وسوسے جنوں کے
نہ ڈر کوئی خواب ٹوٹنے کا
نہ درد کی کوئی ٹھیس ہے اب
کہ ہو گئے ختم سلسلے سب
مسافتوں کی تھکن نہ کوئی
نہ دشتِ غم کا عذاب باقی
نہ دردِ جاناں، نہ فکرِ دوراں

....

....

(نظم: شہرِ خموشاں)

پروینؔ کا یہ اندازِ احساس دوسری کئی نظموں میں بھی نظر آتا ہے۔ نظم ''جاوداں''، نظم 'اے میرے ساتھیو!'' کے مصرعے 'دکھ میں ڈوبے ہوئے، چاند سورج ستارو! مرے ساتھیو! آج بجھتے ہوئے اتنے لگتے ہو کیوں'' اور اس طرح کی متعدد مثالیں پروینؔ کی محزونیت، تھکاوٹ اور ان کے ذہن و فکر کی عدمیت کے غماز ہیں۔ غزلوں کے اشعار:

ہے آسیبوں کا سایہ میں جہاں ہوں
شب دشت بلا میں بے اماں ہوں
ہیں ردائے برف میں لپٹی ہوئی
مضمحل احساس کی سب وادیاں
یہ شہر دن میں بھی تاریکیوں میں ڈوبا ہے
ہجوم یاس میں گہنائے آفتاب ملے

بھی ایسے ہی محزن محسوسات کے آئینہ بردار ہیں۔ یہ یاسیت اور بہت حد تک فنائیت کی بظاہر منفی کیفیات ہی ہیں جو تخلیق میں تاثر پیدا کرتی ہیں۔ درد والم اور رنج وشیون سے بھرپور اظہار ہی بہترین شعری نغمے بن سکتے ہیں۔

پروین شیر نے اپنے نظام اظہار میں فنون لطیفہ کے مختلف مظاہر کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ فائین آرٹ کو اس وسیلۂ بیان کے لحاظ سے رنگ وصورت، نقش وصورت گری اور نغمہ وسرود کے خانوں میں منقسم کرنے کی بجائے پروین نے اس کے Wholeness میں دیکھنا چاہا ہے۔ ان کے یہاں پینٹنگ، مصوری، الفاظ اور نغمات یہ سب مل کر ایک کلی تاثر پیدا کرتے ہیں۔ گویا انہوں نے آرٹ کے مختلف Medium کو ایک دوسرے میں ضم کر کے نیا تخلیقی نظام پیدا کیا ہے۔ اُردو شاعری میں یہ ایک نیا تجربہ ہے اور فکری وفنی وسعتوں کے نئے امکانات کا اشاریہ ہے۔ تجربے کی اس امتزاجی صورت حال نے الفاظ، ایوان اور نقوش وسرود کو ایک دوسرے سے قریب کر کے انہیں باہمی طور پر معاون بنا دیا ہے۔ اُردو شاعری میں لہجے کی یہ ایجاد بہر حال پروین شیر کے حصے میں جاتی ہے۔ شاعری کو دیگر فنون لطیفہ سے الگ کر کے دیکھنے اور سمجھنے والے شائقین سخن کے لئے یہ ایک اجنبی آواز ہو سکتی ہے جو ہماری روایتی شعری جمالیات سے ذرا ہٹی ہٹی سی لگتی ہے۔ پروین کی شاعری تفہیم اور اخذ تائید کی اس ارتقاعی دانش کی طلب گار ہے جہاں الفاظ سے نغموں کے پھوٹنے کا احساس پیدا ہو سکے جہاں ان سے قوس قزح کے رنگوں کا شائبہ ہو۔ جہاں یہ متحرک پیکر کی صورت میں بصری طمانیت کا باعث بن جائیں۔

پروین شیر کے سامنے ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کے اسالیب وآداب کا ایک آفاقی منظر نامہ ہے جو یقیناً اُردو زبان وادب کی شعری جمالیات اور اس کے روایتی نظام سے الگ ہے لیکن پروین کا سلیقہ اظہار ایک اتصالی اور امتزاجی اسلوب پیدا کرتا ہوا مشرق ومغرب کی دوری سمیٹ رہا ہے۔

(انتخاب۔ ۲۸ صفحہ ۶۷ سن اشاعت ۲۰۱۳ء)

☆☆
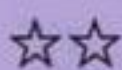
احمد الیاسؔ

احمد الیاسؔ کو میں ذاتی اور شخصی حیثیت سے کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ بس یہ معلوم ہے کہ وہ بنگلہ دیش میں رہتے ہیں۔ وہاں کے سیاسی، سماجی، لسانی اور تہذیبی انقلابات کے چشم دید اور معتبر شاہدوں میں ہیں اور اپنی آنکھوں سے تعمیر، تخریب اور پھر تعمیر نو کے مناظر کا حصہ بن چکے ہیں۔ ''آئینہ ریزے'' اور ''حرف دریدہ'' جیسے دو اہم شعری مجموعوں کے خالق ہیں اور اس کے علاوہ وہ یہ کہ وہ بنگلہ اور انگریزی زبانوں پر غیر معمولی دسترس بھی رکھتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ کسی کی شخصیت کے بارے میں اتنا کچھ جان لینا بھی کم نہیں ہے لیکن میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ شاعری کا اعلیٰ اور سچا تعارف اس کا کلام ہوتا ہے اور یہ بھی کہ کامیاب شاعر کا کلام ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں خارجی نقوش Static نہیں بلکہ متحرک اور متغیر عصری کوائف کے انداز سے منعکس ہوتے ہیں۔ یہ سارا عمل اس طرح ہوتا ہے کہ اس سے فن کار کی داخلی شخصیت بھی منکشف ہوتی ہے۔ انسان جتنا کچھ اپنے اندرون میں ہوتا ہے اس کا عشر عشیر بھی ظاہر میں نظر نہیں آتا۔ چنانچہ آج جب احمد الیاس کی چند تازہ تخلیقات سامنے آئی ہیں اور مجھے ان کے مطالعے کا موقع ملا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ میں صحیح معنوں میں ان سے مل رہا ہوں:

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

احمد الیاس کی تخلیقات کے جو حصے مجھے حاصل ہوئے ہیں ان میں مندرجہ ذیل اشعار نے مجھے اپنی طرف خاص طور سے متوجہ کیا ہے:

یہ ایک پل جس میں کھو رہی ہیں نہ جانے یادوں کی کتنی صدیاں
اس ایک پل میں جو آگیا تو خیال اس کا عجیب ہوگا
کوئی فرق ہجر و وصال میں، کوئی حسن فکر و خیال میں
تو نہ پاس ہو تو خبر رہے، تو قریب ہو تو خبر نہ ہو
یہ سفر میرا بھی اب اس کی طرح ہے الیاسؔ
وہ جو اڑتا ہوا اک برگ شجر آتا ہے
خود کو رسوا تو کر چکے الیاسؔ
آؤ اب اس کو سرخرو بھی کریں
آنکھوں سے وہ سمجھ نہ پائے
رونے میں بھی کمال رکھنا
ہم زمانے سے نہیں اتنے بھی مایوس الیاسؔ
اپنے خوابوں کو جو مٹی میں ملانا چاہیں
سوزش دل نے کچھ خبر دی تھی
کچھ اشارے دھواں سے بھی نکلے

میں سمجھتا ہوں کہ یہ چند اشعار احمد الیاس کے منفرد لہجے کی شناخت کے لئے کافی ہیں۔ان کی روشنی میں شاعر کے سلسلے میں کئی اہم باتیں سامنے آتی ہیں:

ا۔احمد الیاس کا تخلیقی سفر اُردو شاعری کی پختہ کار روایت سے شروع ہوتا ہے لیکن روایت ان کے یہاں صرف ایک Starting point کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے کہ وہ اس مرغ زار سے آگے نکل کر ایسی جگہ چلے آتے ہیں جہاں روایت پیچھے چھوٹ جاتی ہے اور جدت کی معروف عام فضا کا بھی نشان نہیں ملتا۔شاعر کا تخلیقی عمل ایک غیر اتباعی انداز سے روایت و جدت دونوں کا منت کش بننے کی بجائے اپنا ایک الگ جہان اظہار پیدا کرنا چاہتا ہے۔سیاق و سباق سے ہٹ کر تخلیق کا اپنا لہجہ حاصل کر لینا ایک مجاہدے سے زیادہ ودیعت کا فیض ہوتا ہے۔احمد الیاس ان خوش نصیب فن کاروں میں ہیں جنہیں منفرد پہچان کے لئے

کسی reference کا سہارا لینا نہیں پڑتا۔

۲۔ احمد الیاس تراکیب، علائم، استعارات اور تلمیحات و کنایات نیز دوسرے شعری محاسن سے قاری کو لبھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ انہیں اپنے ان احساسات پر مکمل اعتماد ہے جو ان کے سادہ اور عام استعمال کے الفاظ کے ذریعہ ادا ہوتے ہیں اور قاری کے ذہن پر اپنی پوری شدت کے ساتھ ندرت کا یقین دلاتے ہیں۔ احمد الیاس کے یہاں شاعری صناعی اور فن کار کو exhibit کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ انفرادی زیریں احساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس معاملے میں ان کا رشتہ کہیں نہ کہیں میرؔ سے استوار ہوتا ہے۔

۳۔ احمد الیاس کی شاعری کی قرأت ایک سکوت وسکون کی فضا پیدا کرتی ہے۔ انہوں نے ایک جگہ کہا ہے:

فکر بھی ضروری ہے، حسن فن بھی لازم ہے
صرف شعر کہنے کو شاعری نہیں کہتے

یہ تو اچھی شاعری کے لئے ایک عام اصول ہے لیکن احمد الیاسؔ نے اس اصول کو جس طرح برتا ہے وہ اپنی جگہ نہایت منفرد ہے یعنی یہ کہ ان کے یہاں مضمون تازہ باندھنے کی کوشش نہیں ملتی۔ انہوں نے کیفیات کو سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اظہار میں کوئی نکتہ آفرینی بھی نہیں ہے لیکن اشعار حدیث دل کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ ان معنوں میں احمد الیاسؔ کے اشعار سہل ممتنع کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ ''حسن فن'' کا معاملہ بھی ان کے یہاں جادہ عام سے ہٹ کر طے ہوتا ہے۔ شعری جمالیات بالخصوص مشرقی شعری جمالیات کے طمطراق کا احساس ہونے کی بجائے ایک بظاہر نثر آمیز لہجے میں اپنے اظہار و بیان میں تاثر و تاثیر کی خصوصیت احمد الیاسؔ کو معاصر فن کاروں سے الگ کرتی ہے۔

۴۔ احمد الیاسؔ کی اس خصوصیت سے بھی ان کا امتیاز قائم ہوتا ہے کہ انہوں نے شعر کے مصرعوں میں معنوی خلیج پیدا کر کے قاری سے یہ توقع کی ہے کہ وہ اسے پر کرے۔ اس طرح ان کے متعدد شعروں کی تفہیم ذہین قرأت کی متقاضی ہو جاتی ہے۔ شاعری کے مفہوم اور اس کے تاثر میں قاری کی شرکت کا مسئلہ آج تنقید میں بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ احمد الیاسؔ کے

کئی اشعار اس بحث کو فیصلے تک پہنچاتے ہیں۔ مثلاً جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

سوزشِ دل نے کچھ خبر دی تھی
کچھ اشارے دھواں سے بھی نکلے

یا یہ کہ:

خود کو رسوا تو کر چکے الیاسؔ
آؤ اب اس کو سرخرو بھی کریں

تو اشعار کے سلسلے میں قاری کا انہماک نئی معنوی جہتیں تلاش کرنے لگتا ہے۔

احمد الیاسؔ کا لہجہ اپنے اجنبی پن کی وجہ سے انفرادیت کا احساس دلاتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اس صنف میں ان کے اختصاص کے بعد اس کی ضرورت بھی نہیں رہتی کہ ان کی منظومات پر گفتگو کی جائے تاہم 'سڑک پر ایک گفتگو' اور 'خودکشی' جیسی نظمیں اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں کہ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔

(انتخاب۔ ۲۸ صفحہ ۱۷ سن اشاعت ۲۰۱۳ء)

☆☆
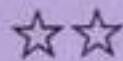
کے ایل نارنگ ساقی

نذیر فتح پوری کی کتاب ''میخانۂ اُردو کا پیر مغاں: نارنگ ساقی'' میرے پیش نظر ہے۔اس سے پہلے خود نارنگ ساقی کی مطبوعات ''ہمارے کنور صاحب''، ''یادوں کا جشن''، ''کلیات سحر''،مونوگراف: مہندر سنگھ بیدی سحر''، ''ادیبوں کے لطیفے''، ''خوش کلامیاں قلم کاروں کی''، ''سحر خیال''، اور''کلیات اکبرالہٰ آبادی'' سے نارنگ ساقی سے ملاقات کم کم ہوسکی ہے اس لئے کہ ان میں وہ خود کم نظر آتے ہیں، کہیں کنور مہندر سنگھ بیدی نظر آئے، کہیں ہنستے ہنساتے شعراء وادباء اپنی خوش کلامیوں سے لطف دیتے رہے، کہیں ساحر ہوشیار پوری اور اکبر الہٰ آبادی کی شخصیتیں سامنے آئیں لیکن یہ پہلی کتاب ہے جس میں نارنگ ساقی سے ملاقات کا بھرپور موقع ملتا ہے۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ کے ایل نارنگ کے ساتھ 'ساقی' کا اضافہ کیوں کر ہوا اور یقین جانئے پہلی بار کسی مدیر اور اس کے رسالے کے من تو شدم تو من شدی ہو جانے کا اندازہ ہوا۔ نیاز فتح پوری کے بارے میں مشہور ہے کہ لوگ ان کے رسالے 'نگار' سے انہیں اس حد تک وابستہ کر دیتے تھے کہ ایک صاحب نے یہ کہہ دیا تھا کہ نگار صاحب جو لکھنو سے رسالہ 'نیاز' شائع کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود نیاز اور 'نگار' الگ الگ ہی سمجھے جاتے رہے۔ 'نارنگ' کے ساتھ تو 'ساقی' ایسا پیوست ہو چکا ہے کہ اسے الگ کر دیجئے تو بے چارے گوپی چند نارنگ کے لئے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔

میں اپنی طبیعت کی کم آمیزی کی وجہ سے کبھی نارنگ ساقی سے نہیں مل سکا اور اب جب نذیر فتح پوری کی مرتبہ اس کتاب کے مطالعے کا موقع ملا ہے تو اپنی نارسائی پر افسوس ہوتا

ہے اس لئے کہ پیش نظر کتاب میں نارنگ ساقی کی شخصیت کے اتنے دل خوش کن اور پر کشش پہلوؤں سے پردے اٹھے ہیں کہ کف افسوس ملتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ''ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں'' اس کتاب میں کم وبیش ایک سو اہل قلم حضرات نے اپنے اپنے طور پر نارنگ ساقی کی مطبوعات اور ان کی شخصیت کے متعدد گوشوں کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان سے ممدوح کی صد پہل خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ نذیر فتح پوری نے نارنگ ساقی کے لئے ایک ایسا Prism تیار کر دیا ہے جس سے نارنگ ساقی کی شخصیت کے تمام پہلو منکشف ہو جاتے ہیں۔ بڑا آدمی صرف وہ نہیں ہوتا جو اہم کتابوں کا مصنف یا مرتب ہو بلکہ وہ بھی ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے جسے صاحبان علم وادب عظیم ہونے کی سند دیتے ہیں۔ نارنگ ساقی ان خوش نصیب لوگوں میں ہیں جن کی شخصیت کی دلاویزی کے سبھی معترف ہیں۔

نذیر فتح پوری کی اس مرتبہ کتاب کے ساتھ ڈاکٹر سیفی سرونجی کی مرتبہ کتاب ''مشاہیر کے خطوط: نارنگ ساقی کے نام'' کو شانہ بہ شانہ رکھا جائے تو نارنگ ساقی کے کارنامے اور ان کی شخصیت کے زاویے زیادہ تابناک ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں مطبوعات ایک دوسری کے لئے تکملہ کا کام کرتی ہیں۔ نارنگ ساقی کی اپنی گرانقدر ادبی خدمات کے علاوہ ان کی اس غیر معمولی خصوصیت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے سرپرستانہ رویے اور شعراء و ادباء کے بے محابہ اخلاص کے ذریعہ ادبی ماحول کی بقا کی صورت حال پیدا کرتے رہتے ہیں۔

(انتخاب۔ ۲۸ صفحہ ۴۷ سن اشاعت ۲۰۱۳ء)

☆☆

پروفیسر خالد محمود

پروفیسر خالد محمود تعلیم و تعلم اور تخلیق و تنقید سے بڑی تندہی کے ساتھ وابستہ ہیں اور کئی دہائیوں سے خدمت ادب میں منہمک ہیں۔ وہ خدمت کرتے ہیں تو خاموشی کے ساتھ لیکن سچا ادب دوست شہرتوں سے بچ نہیں سکتا چنانچہ خالد محمود کی ادبی شخصیت کا گراف مسلسل بڑھتا جاتا ہے۔ ان کی شہرت کی بنیاد ان کے نوع بہ نوع کاموں پر ہے جو ایک متوازن تسلسل کے ساتھ سامنے آرہے ہیں۔ ابھی حال میں ان کی تازہ کتاب ''ادب اور صحافتی ادب'' شائع ہوئی ہے۔ ناشر کتاب نے اس تصنیف کے گرد پوش پر خالد محمود کی علمی و ادبی فتوحات کی جو تفصیل پیش کی ہے میں اسے ذیل میں لفظ بلفظ نقل کر رہا ہوں کہ ان میں سے کئی نکات کا علم خود اسی تحریر سے حاصل ہوا ہے۔ ناشر کتاب لکھتے ہیں:

''پروفیسر خالد محمود اُردو کے ایک ممتاز استاد، خوش فکر شاعر، طنز و مزاح نگار، مترجم اور نقاد ہیں۔ آپ نے متعدد ناولوں اور کہانیوں کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ دو شعری مجموعے 'سمندر آشنا' اور 'شعر چراغ' ہیں جن سے آپ کے تخلیقی وژن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ 'شگفتگی دل کی' مزاحیہ مضامین کا مجموعہ اور 'اُردو سفر ناموں کا تخلیقی مطالعہ' پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جسے ہندو پاک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اُردو اکادمی دہلی کی درخواست پر آپ نے شاہ مبارک آبرو پر مونو گراف تحریر کیا۔ مضامین کے دو مجموعے ''تحریر کے رنگ' اور 'ادب کی تعبیر' منظر عام پر آچکے ہیں۔ دہلی اُردو اکادمی

کے لئے طنز و مزاح پر ایک کل ہند سمینار منعقد کیا اور ایک ضخیم کتاب 'اُردو میں طنز و مزاح کی روایت' ترتیب دی جسے بہت پسند کیا گیا۔ ہند و پاک کے اہم رسائل و جرائد میں آپ کی تخلیقی و تنقیدی نگارشات برابر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ساہتیہ اکادمی نے آپ کو اُردو ترجمے کے ایوارڈ سے سرفراز کیا اور مدھیہ پردیش اُردو اکادمی نے 'کل ہند میر تقی میرؔ ایوارڈ برائے شاعری' سے نوازا۔ درس و تدریس کے علاوہ ادبی اور سماجی زندگی میں بھی آپ سرگرم رہتے ہیں۔ فی الوقت دہلی اُردو اکادمی کی گورننگ کونسل کے رکن۔ اس کی تحقیقی اور اشاعتی کمیٹی کے کنوینر۔ این سی آر ٹی کی مجلس مشاورت اور قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے لٹریری پینل کے رکن ہیں۔ منسٹری آف کلچر حکومت ہند کی Tagor commemoration committee for recommending prijects & Programmes کی رکنیت بھی آپ کو حاصل ہے۔ ہندوستان کے مختلف تعلیمی اداروں مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ، جودھ پور یونیورسٹی کے اُردو شعبوں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے متعدد شعبوں کے بورڈ آف اسٹڈیز کے رکن بھی ہیں۔ آپ کی گرانقدر ادبی خدمات کے اعتراف میں سہ ماہی رسالہ 'انتساب' کا ایک ضخیم شمارہ 'خالد محمود نمبر' شائع ہو چکا ہے۔ سیفی سرونجی نے دو کتابیں 'خالد محمود: شخصیت اور فن' اور 'خالد محمود بحیثیت انشائیہ نگار' ترتیب دی ہیں۔ پروفیسر خالد محمود کا تعلق مدھیہ پردیش (بھوپال) کے ایک قصبے سرونج سے ہے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ ریاض المدارس سرونج میں ہوئی۔ ایم اے اور بی ایڈ کی اسناد سیفیہ کالج، بھوپال سے حاصل کیں اور پی ایچ ڈی کی ڈگری جامعہ ملیہ اسلامیہ نے تفویض کی۔ دہلی میں آپ کی تدریسی زندگی کا آغاز جامعہ سینئر سکنڈری اسکول میں بحیثیت لکچرر ہوا پھر رفتہ رفتہ ترقی کے مواقع ملتے گئے اور اس وقت آپ شعبہ

اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں صدر کے منصب پر فائز ہیں۔ بحیثیت صدر آپ کی نگرانی میں جہاں شعبہ اُردو کے مجلّے 'ارمغان' کا اولین شمارہ شائع ہوا وہیں شعبہ اُردو سے کئی کتابیں 'رابندر ناتھ ٹیگور: فکروفن'، 'اُردو صحافت: ماضی اور حال'، 'خطبات----شعبہ اُردو'، 'اُردو زبان اور ابلاغ عامہ' ترجمے کی فنی اور عملی مباحث بھی شائع ہوئیں۔ان میں سے پہلی تین کتابوں کے مرتبین میں آپ شامل ہیں۔آپ کے عہد صدارت میں بہت سے کل ہند سمینار اور کلچرل پروگرام منعقد ہوئے مگر ۹۶ لاکھ کا ٹیگور پروجکٹ شعبہ اُردو کے لئے آپ کی تاریخ ساز حصولیابی ہے اُردو کے مشہور اشاعتی ادارے مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ کی سربراہی بھی آپ کی سپرد ہے۔آپ اس ادارے کے مینیجنگ ڈائرکٹر اور ماہنامہ 'کتاب نما' اور بچوں کا ماہنامہ 'پیام تعلیم' کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ پروفیسر خالد محمود کا شمار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قابل فخر اساتذہ میں ہوتا ہے۔ جامعہ میں آپ مختلف ادبی اور ثقافتی پرگراموں کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔''

اس تعارف نامے میں صرف اتنی تبدیلی کرنی چاہئے کہ آج پروفیسر خالد محمود جامعہ ملیہ اسلامیہ میں صدر شعبہ نہیں بلکہ توسیع معیار کی بنیاد پر تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور ترویج علم وفن کے دیگر کاموں میں نہایت مستعد ہیں۔

پیش نظر کتاب ''ادب اور صحافتی ادب'' متنوع موضوعات پر لکھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔اس ۳۲۰ صفحات کی ضخیم کتاب میں ادب اور صحافت دونوں شقوں پر باوقار مقالات ملتے ہیں۔موضوعات کا تنوع علم ودانش سے تعلق رکھنے والے اوران کے نکات کے متلاشی قارئین کو مطالعے پر مجبور کرتا ہے۔ولیؔ، فراقؔ، فیضؔ، شہریارؔ، شہپر رسول اور سیفی سرونجی کے سلسلے میں جو مضامین شریک کتاب ہیں وہ اگرچہ بادی النظر میں تجزیاتی معلوم ہوتے ہیں۔ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالد محمود نے یہ تجزیات تنقیدی اصولوں کے تحت کیے ہیں۔پروفیسر خالد محمود نے دلی میں اُردو غزل، اُردو نظم ۸۰ کے بعد، تحریک آزادی میں

اُردو شاعری کا کردار اور اسی طرح کے دوسرے موضوعات کو بھی علمی خزانے اور ادبی آگہی سے معمور کردیا ہے۔کتاب کا ایک حصہ صحافت کے موضوعات و مسائل کے لئے مختص ہے۔کتاب میں شذرہ نگاری، ترجمہ کے مسائل، تدریسی تجربات اور اسی طرح کے دوسرے مشتملات دانش و آگہی کے متعدد نکات سے متعارف کراتے ہیں۔اس طرح مجموعی اعتبار سے یہ کتاب ادب کے Cross section کے قارئین کے لئے ایک قیمتی ارمغان کی حیثیت رکھتی ہے۔

(انتخاب۔۲۸ صفحہ ۵۷ سن اشاعت ۲۰۱۳ء)

ظفر انصاری ظفرؔ

جناب ظفر انصاری ظفرؔ کے مجموعہ کلام 'شرار سنگ' کا مسودہ پیش نظر ہے۔اس کے مطالعے کے بعد مجھے اس بات کا اندازہ ہوگیا ہے کہ اُردو شاعری کی مضبوط و مستحکم روایت کا سرچشمہ اس قدر توانا ہے کہ نئی نسل کے شعرا بھی اس سے حسب حیثیت اپنی تخلیقی سیرابی کے مواقع پیدا کر سکتے ہیں۔جناب ظفرؔ نے اپنے شعری اظہار کے لئے اس متمول خزانے سے استفادہ کیا ہے۔جدت اور روایت کو دو مختلف خانوں میں بانٹ کر ہمارے بہت سے ناقدین نے تحقیقی پروسس کی تفہیم میں دشواریاں پیدا کردی ہیں۔کوئی اچھی تخلیق کلیتہً جدید نہیں ہوسکتی۔کہیں نہ کہیں سے اس کا رشتہ سابقہ اقدار سے قائم رہتا ہے۔

جناب ظفرؔ کے رنگ سخن پر مستند اساتذہ کے لہجے اور لغات کے اثرات کے معنی یہ نہیں ہے کہ وہ اتباع کو فن کاری سمجھتے ہیں۔انہوں نے اپنے لئے نئی راہیں نکالی ہیں۔صنف غزل کی فنی خصوصیت کا خیال رکھتے ہوئے انہوں نے اسے حدیث دل کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا ہے اور سب کچھ اپنے ان واردات قلبی کے ذریعہ بیان کیا ہے جو محبوب کے حوالے سے ان پر طاری ہوتے ہیں۔ایک ایسے دور میں جب بقول ظفرؔ ع

ہر اک شئے اشتہاری ہوگئی ہے
یہ دنیا کاروباری ہو گئی ہے

انہوں نے اخلاص ومحبت کی حرمت اور تعلقات کے دردوسوز کے بہانے متعدد سماجی سروکار کے موضوعات دلاویزی کے ساتھ پیش کر دیئے ہیں۔مصروف زندگی کا سب

سے بڑا المیہ ان کے خیال میں یہ ہے کہ آج کا انسان نرم و نازک محسوسات سے بیگانہ ہوتا جارہا ہے اور لطیف ترین جذبات کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹتا جارہا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

میں کارو بار دہر میں مصروف ہو گیا
تم کو بھی یاد کرنے کی فرصت نہیں رہی

ظفر انصاری کی غزلوں میں فکر و بصیرت کے متعدد نکتے ہمیں انسانی اقدار کی عظمت کا احساس بخشتے ہیں اور عہد حاضر کی بے اعتدالیوں سے متنبہ کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں تعمیر ذات اور ترتیب حیات کے کئی دانشورانہ نکتے سامنے آتے ہیں:

جو آسماں کی بلندی پہ ناز کرتے ہیں
انہیں بھی لوٹ کے آنا ہے خاکداں کی طرف

اک پھول روز آتا ہے، جاتا ہے روز ایک
یہ گلستانِ ناز ہے مثل سرائے گل

اس فقیری سے مجھے نسبت روحانی ہے
مت بٹھا مجھ کو سرِ تختِ سلیماں بلبل

اوڑھ لوں گا میں فقیری کی دریدہ چادر
جب مرے دل کو خیال زرو مال آئے گا

نہ جانے خلق پہ گزرے گی کیا کہ یہ دنیا
بڑھا رہی ہے قدم دَورِ بے اماں کی طرف

ظفر انصاری ظفر کی غزلوں میں خودداری (ہم اپنی خودی کو کبھی رسوا نہیں کرتے + قدموں میں شہ وقت کے سجدہ نہیں کرتے) ہمت و جرأت (جہاد زندگی کو دل اگر تیار ہو جائے + یہ ممکن ہے کہ ہر شاخ شجر تلوار ہو جائے) ریاکارانہ کردار سے بیزاری (اے ظفر پالے ہوئے ہیں وہ بھی دنیا کی ہوس + اب فقیر عشق میں بھی بوئے عرفانی نہیں) اور دوسرے موضوعات و محسوسات ان کے تخلیقی رویے کی تفہیم میں کلیدی نکات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تعمیری موضوعات کو ظفر نے معروضی انداز سے نہیں بلکہ داخلی ذہنی وابستگی کے ساتھ پیش کر کے ایک

منفرد آواز پیدا کرلی ہے جس میں کہیں کہیں میرؔ کے لہجے سے مطابقت کا احساس ہوتا ہے۔

ظفرؔ انصاری غزلیہ کلچر سے اچھی طرح واقف ہیں۔انہوں نے اپنی ایک غزل میں(جس کی ردیف 'میری غزل میں' ہے)ان عناصر کا ذکر کیا ہے جن سے غزل کے اشعار روشن ہوتے ہیں۔انہوں نے بتایا ہے کہ غزل کے لئے ایک مخصوص آہنگ کی ضرورت ہے، اس میں عوام الناس کے جذبات کی پیش کش ہونی چاہئے، زندگی کے مسائل نظم ہونے چاہئے، کون و مکاں کے اسرار خوش رنگ الفاظ کے ساتھ آئیں۔نئے نئے مضامین سامنے آئیں، بیان میں چستی اور برجستگی ہو، لہجے میں کاٹ ہو، اسلوب میں روانی بھی ہو اور فصاحت بھی -------ظفرؔ انصاری نے صنف غزل کے جو فنی اجزا مرتب کئے ہیں ان سے فن کار کے اندرون میں چھپے ہوئے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ظفرؔ کے کلام میں ان اجزاء کا ظہور انہیں ایک کامیاب غزل گو ثابت کرتا ہے۔مجھے امید ہے کہ 'شرار سنگ' غزل کے شیدائیوں کے لئے ایک قیمتی تحفہ ثابت ہوگا۔

(انتخاب۔۲۹ صفحہ ۶۵ سن اشاعت ۲۰۱۴ء)

☆☆

علیم صبا نویدی

شاعری کی اثر انگیزی کے لئے اوزان و بحور اور قوافی و ردف کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ اصل چیز ہے جذبے کی وارفتگی، موضوع سخن سے فنکار کا ناگزیر ذہنی ربط، اظہار کی بے تابی اور بیان پر مکمل دسترس -------- اگر کسی فن کار کو یہ دولت مل جائے تو پھر اس کی شاعری دل نشیں ہو جاتی ہے۔ موضوع خواہ کچھ بھی ہو اگر فن کار ان خصوصیات سے متصف ہے تو فن پارے میں رنگ دوام پیدا ہو جاتا ہے۔ تخلیق کا صحیح منصب اسی طرح پورا ہوتا ہے۔ یہ دعویٰ کہ:

من نہ دانم فاعلاتن فاعلات
شعری گویم بہ از آب حیات

اسی صورت میں قابل تسلیم ہو سکتا ہے جب فن کار متذکرہ بالا خصوصیات کا حامل ہو جائے۔ ہمارا عروضی نظام بنیادی طور پر صوتی آہنگ کے حصول کا ایک آزمودہ وسیلہ ہے۔ جذبے کی وارفتگی بھی ایک صوتی آہنگ پیدا کر لیتی ہے۔ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ یہ ہمارے احساسات کو اس لئے متاثر کرتی ہے کہ اظہار کی بے تابی نغمگی کا باعث بن جاتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے شعر العجم میں ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ ایک چھوٹے بچے کو ہڈے نے کاٹ کھایا تھا۔ وہ اس کیڑے کا نام نہیں جانتا تھا۔ روتے چیختے گھر پہنچا اور اپنے باپ سے کہا کہ ایک خوبصورت رنگین پروں والا پرندہ گاتا ہوا تیزی سے آیا اور اس نے مجھے ڈس لیا ہے۔ اس بیان کو سن کر صاحب خانہ کے دوست نے معاً کہا کہ بخدا یہی شاعری ہے۔ غور کیجئے تو چھوٹے بچے کے اظہار میں شاعری کے تمام لوازم موجود ہیں۔ درد و سوز، نغمہ و سرود،

رنگ وصوت، محاکات، پیکر تراشی، اظہار کی برجستگی ---------غرض وہ تمام اجزا موجود ہیں جو اعلیٰ درجے کی شاعری کے لئے ضروری ہیں۔

اس تمہید کے بعد جناب علیم صبا نویدی کی ان نثری نعتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کا مجموعہ زیر اشاعت ہے۔علیم صبا نویدی نے اُردو شعروادب کی اقلیم میں وہ شہرت حاصل کر لی ہے جو بہت سے لوگوں کو حاصل نہیں۔انہیں اس فتح ونصرت پر فخر کرنا چاہئے۔ایک اہم بات یہ ہے کہ ان کی شہرت عام کے پس منظر میں وہ متعدد فنی تجربات جو انہوں نے مختلف اصناف سخن کے سلسلے میں برتے ہیں۔اپنی غیر معمولی طباعی سے انہوں نے بظاہر خشک اور اُردو کی شعری روایتوں سے منحرف اسالیب میں بھی اپنے تخلیقی جوہر کا مظاہرہ کیا ہے۔انہوں نے نثری نظم کی صنف کو بھی اس حد تک مقبول ومعقول بنانے کی کوشش کی ہے جس حد تک اس صنف میں قبولیت کی گنجائش ہے۔

جناب نویدی کی پیش نظر نثری نعتیں فطری طور پر زیادہ روشن اور تابناک ہیں کہ نعتوں میں مقدس ومطہر جذبوں کی فراوانی ہوتی ہے۔ایسے روحانی اور سرمدی جذبات دل نشینی کے حامل ہو جاتے ہیں۔بعض نعتوں (مثلاً سواری، نورانی تبسم، حُبّ محمدی اور تلاش وغیرہ) میں ایک غیر عجمی اور اعرابی لہجے کا احساس ہوتا ہے جس کی وجہ سے عشق رسولؐ کی وارفتگی قاری کے لئے زیادہ پُر اثر ہو جاتی ہے۔

نثری شاعری کے صنفی وجود کی بقا اسی وقت ممکن ہے جب جذبات کی ناقابل تسخیر یورش ہو، ایک ایسا والہانہ پن اور بے محابہ کیف ہو جس کا احساس غالبؔ نے آبگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے، کہہ کر ظاہر کرنا چاہا ہے۔علیم صبا نویدی کی مسلسل ریاضت اور روحانی و معتقداتی کیفیات سے ان کی سرشاری کسی بھی ہیئت واسلوب پر حاوی ہو جاتی ہے --------اور یہ نثری نعتیں اس کی تابندہ مثالیں ہیں۔

(انتخاب۔۲۹ صفحہ ۶۷ سن اشاعت ۲۰۱۴ء)

☆☆

فراغ روہوی

فراغ روہوی نئی نسل کے کامیاب شاعروں میں ہیں۔ان کی شاعری تخلیقی ابال کا نتیجہ ہے۔ان کے یہاں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور اظہار و بیان کی وارفتگی بھی۔نئے ہیئتی تجربات میں ان کی ماہرانہ دسترس انہیں معاصر فن کاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ان کے اثاثۂ سخن میں ماہیے، غزلیں، نعتیہ کلام بچوں کے لئے تخلیقات، رباعیات وغیرہ جیسی متفرق اصناف اس امر کی شاہد ہیں کہ شعری اظہار ان کے طبع خداداد کا حصہ ہے۔جب فطرت خود بخود لالے کی حنا بندی کرتی ہو تو اس کی مشاطگی کے لئے کسی خارجی مشقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔شاعری ان کے لئے مجبوری ہے، کوئی جبر نہیں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ جس موضوع کو اٹھاتے ہیں اور جس صنف و ہیئت کا استعمال کرتے ہیں وہاں شگفتگی، برجستگی اور کشادہ فراغ کا احساس ہوتا ہے۔یہ نصرت کم سخنوروں کو مل پاتی ہے۔

فراغ روہوی کی اس فتح مندی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے فنون لطیفہ کی اساسی خصوصیات کا عرفان حاصل کر لیا ہے۔فنون لطیفہ بنیادی طور پر TO GET OUT OF NOTHING SOME THING کی جلوہ سامانی کا آرٹ ہے، یہاں نفی سے اثبات کی طراوت ہوتی ہے، یہاں بیان سے زیادہ طرز بیان کی اہمیت ہے، موضوع سے زیادہ اسلوب اثر انداز ہوتا ہے فنون لطیفہ بشمول شاعری میں MATTER سے زیادہ MANNER کی کرشمہ سازی ہوتی ہے۔بسا اوقات لفظوں کے دروبست، جذبے کی فراوانی اور اظہار کے بے محابہ پن سے Content خود بخود سامنے آجاتا ہے۔موضوع کی دبازت بلکہ کثافت لہجے

کی لطافت میں چبھنے لگتی ہے۔شعری فن پارے میں ابہام یا عدم تفہیم کی شکایت کرنے والے لوگ سمجھنے پر زور دیتے ہیں حالانکہ فن پارہ محسوس کرنے کی شئے ہے۔دوسرے فنون لطیفہ کی طرح شاعری کا بھی اولین منصب یہ ہے کہ یہ ہمارے احساسات کو انگیخت کرے۔فراغ روہوی کے ماہیے،نعتیہ کلام اور رباعیات اسی اولین فریضے کی تکمیل کرتے ہیں۔

''جنون خواب'' کی رباعیاں دیار جاہ وجلال،دیار خوش خصال،دیار کمال،دیار جمال اور دیار بے مثال کی شقوں میں منقسم ہیں اور ہر جگہ وہی سرشاری پیدا کررہی ہیں جو سچی شاعری کا وطیرہ ہے۔اول الذکر دو شقیں تو خالصاً محبت وعقیدت کی امین ہیں۔ان میں عرفان اور والہانہ سرمستی ہے۔خالق کائنات کی عطاو بخشش کو مندرجہ ذیل رباعیوں میں کس خوبصورت فنی روپ میں یاد کیا گیا ہے۔

بندوں کا خیال اس نے زیادہ رکھا
دروازہ الطاف کشادہ رکھا
دینے پہ جب آیا تو کہاں اس نے کبھی
کچھ فرق شہنشاہ وپیادہ رکھا

وہ رحمتیں دن رات کہ گننا مشکل
وہ لطف وعنایات کہ گننا مشکل
تاحد نظر ارض وسماں میں تیرے
اتنے ہیں کمالات کہ گننا مشکل

اسی طرح 'دیار خوش خصال' کے ضمن میں رسول اکرمؐ کی صفات اوران کی ذات پاک سے والہانہ محبت کے ذکر میں فراغ روہوی کے یہاں جو سرمستی نظر آتی ہے وہ بھی دیدنی ہے۔آسان لہجے اور عام مروج الفاظ میں جب تک جذبے کی توانائی نہ ہو ایسا اظہار ممکن ہی نہیں:

ہے زیست اگر شعلہ تو شبنم تم ہو
رستے ہوئے ہر زخم کا مرہم تم ہو

کیوں آس لگائے نہ زمانہ تم سے
اے میرے نبیؐ ! رحمت عالم تم ہو

رباعی ایک عرصے تک بوڑھوں کی صنف سمجھی جاتی رہی ہے لیکن آج اُردو کے لسانی ارتقاء اور عصر حاضر کے فن کاروں کی تخلیقی رسائیوں نے اسے نئی نسل کے لئے بھی قابل عبور بنا دیا ہے۔فراغ روہوی کی 'دیار کمال' اور 'دیار جمال' کی شقوں کی رباعیاں بھی فکری ومحسوساتی عموداور جذب وکیف کی تابندہ مثالیں ہیں۔ایک خوبصورت بات یہ ہے کہ فراغ نے کہیں بھی اپنی رباعیوں کو فلسفہ طرازی اور فکری بوجھل پن کا شکار ہونے نہیں دیا ہے بلکہ ہر جگہ اظہار و بیان میں جذبہ واحساس کی حکمرانی ہے۔اس خصوصیت نے ان کی رباعیوں کو غیر معمولی دلاویزی عطا کردی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اہل نظر فراغ کی اس تخلیقی توانائی اور اس کے امتیاز ضرور محسوس کریں گے۔

(انتخاب۔۲۹ صفحہ ۶۹ سن اشاعت ۲۰۱۴ء)

☆☆
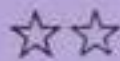
کہکشاں توحید

کہکشاں توحید کا پیش نظر مسودہ ''ننھی راہبر'' ان چھوٹی چھوٹی کہانیوں پر مشتمل ہے جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ان کی فرمائش ہے کہ میں اس کتاب کے سلسلے میں اپنے تاثرات پیش کروں۔عام طور پر اس طرح کی فرمائش کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا توصیف و تحسین سے کام لے اور یہ ثابت کرے کہ آنے والی کتاب اپنے موضوع پر نہایت کامیاب پیش کش ہے۔شکر ہے کہ کہکشاں توحید نے مجھے اس تکلف سے بری کر دیا ہے۔اس سلسلے میں میں ان کا ممنون ہوں۔اس مسودے پر اظہار خیال کرنے کا جواز یہ بھی ہے کہ ادب اطفال کے بارے میں چند ضروی نکات سامنے آجائیں۔

اُردو میں ادب اطفال کی تخلیق کا رواج بالعموم غیر منظم طریقے پر موجود ہو رہا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس اہم شعبے کی نزاکتوں کا خیال رکھا جائے۔اس میں کوئی شک نہیں بچوں کے لئے لکھی گئیں تحریریں خواہ نثری صنف میں ہوں یا شعری ہیئت میں اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہیں کہ ان سے مختلف عمروں کے بچوں کی تعلیم و تدریس اور ذہنی تربیت کی صورت پیدا ہو سکے۔اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور اہمیت کے حامل ہیں۔

ا۔عام طور پر ادب اطفال کا تعلق سات آٹھ سال سے لے کر چودہ پندرہ سال کے بچوں بچیوں سے ہوتا ہے۔ان عمروں میں بچوں کی ذہنی تبدیلیاں تیز رفتار ہوتی ہیں۔کم سے کم وقت میں وہ زیادہ سے زیادہ آگہی بٹورنا چاہتے ہیں۔علوم و فنون ،اطلاعات اور معلومات بے شمار ہوتی ہیں، بچوں کا ذہن غیر بالیدہ ہوتا ہے۔اس لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ان کے

ذہنوں میں دانش و آگہی کا INPUT زیادہ مقدار میں کر دیا جائے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ان موضوعات و مسائل کا انتخاب کیا جائے جو ان کے ذہنوں میں ڈالنے ہیں۔ ادب اطفال کی تخلیق کرنے والے اہل قلم تمام حضرات کو اپنے طور پر یہ طے کرنا چاہئے کہ وہ سات سے پندرہ برسوں کے بچوں میں سے کس عمر کا احاطہ کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا ادب بچوں کے سن و سال کا SPAN سامنے رکھ کر تخلیق کیا جانا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ جو ذوق و میلان اور صلاحیت اخذ سات آٹھ سال کے بچوں میں ہوتی ہے وہ کچھ بڑے بچوں سے مختلف ہوتی ہے۔ تیز رفتار ذہنی ارتقا اس امر کا متقاضی ہوتا ہے۔

۲۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ادب اطفال تخلیق کرتے ہوئے بچے اور بچیوں کے خلقی جنسی فرق کو بھی سامنے رکھنا چاہئے۔ بچیوں کے حصول آگہی کے خطوط بچوں سے خاصے مختلف ہوتے ہیں۔ فطری ذوق اور طبعی میلان کے فرق کے ساتھ لڑکوں کے فہم کے دائرے اور میلان لڑکیوں سے الگ ہوتے ہیں۔ جن موضوعات اور تمثیلوں کے وسیلے سے لڑکیوں کے ذہنوں کی تربیت ہو سکتی ہے وہ بسا اوقات لڑکوں کے سلسلے میں کارگر نہیں ہوتے۔ اس لئے دونوں کے لئے یکساں اسباق یا فن پارے اکثر زیادہ کارگر نہیں ہوتے۔ نظموں یا کہانیوں میں جن کھیلوں کا ذکر کر کے بچوں کے تدریس و تعلیم ہو سکتی ہے وہ بچیوں کے لئے مناسب نہیں ہوتے اسی طرح بچیوں کے فطری جنسی رجحان اور ان کے طفلانہ نسائی حوالے ہی ان کی تدریس کا بہتر ذریعہ بن سکتے ہیں۔

۳۔ ادب اطفال کی تخلیق میں اس بات کا خیال کرنا بھی ضروری ہے کہ آپ نظم و نثر میں جو موضوع یا قصے پیش کر رہے ہیں وہ مطالعہ کرنے والوں کی تہذیب و معاشرت سے کس حد تک مربوط و مناسب ہیں۔ اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ بچے انہیں امور کو اخذ کر سکتے ہیں جو ان کے ماحول، معاشرت اور عمومی تہذیب سے مطابقت رکھتے ہوں۔ جن بچوں کے تہذیبی اقدار اور گھریلو ماحول میں عید اور رمضان اہمیت رکھتے ہوں انہیں اگر کرسمس کی چمک دمک دکھلائی جائے تو ایک طرح کا CULTURAL INFILTRATION کا نقشہ سامنے آتا ہے جو بچوں کے تہذیبی اساس کو متزلزل کر سکتا ہے۔ ایک سامنے کی مثال دیکھئے۔ ''زبان و

ادب'' (دسمبر ۲۰۱۳ء) کے بچوں کے حصے میں ایک کہانی 'جولی' شائع ہوئی ہے۔ جولی ایک کتیا ہے۔ شازیب اسے پیار کرتا ہے۔ وہ جولی کے نوزائیدہ بچے کو گود میں اٹھائے پیار کرتا ہوا اپنی امی کے پاس آتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ جس طبقے اور کلچرل گروپ کے لئے یہ کہانی لکھی گئی ہے وہاں کتا ایک نجس جانور سمجھا جاتا ہے۔ مذہبی اور معتقداتی لحاظ سے اسے ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ یہاں کتیا اور اس کے بچے سے جس پیار اور محبت کی تصویر کھینچی گئی ہے اس سے پڑھنے والوں کو ایک غلط پیغام جاتا ہے۔ یہ تو ایک مثال ہے اس طرح کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں جن سے تہذیبی انحطاط کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ غرض یہ کہ ادب اطفال کی تخلیق میں اس احتیاط کا برتنا ضروری ہے۔

۴۔ ادب اطفال خواہ نظم کی صورت میں ہو یا نثر میں دونوں صورتوں میں لسانی معیار کا خیال.... سال پہلے تک تھا وہ آج نہیں ہے۔ ایسی صورت میں زبان و بیان کی تبدیلی ناگزیر ہے۔ اُردو میں جب سے لے کر اب تک بہت سے تغیرات پیدا ہو چکے ہیں۔ قدیم الفاظ کے معنی بدلے ہیں زبان میں نئے الفاظ داخل ہو گئے ہیں۔ عالمی سطح کی سائنسی ایجادات و انکشاف نے غیر ملکی زبانوں کی اصطلاحات کو زبان کا جزو بنا دیا ہے، اُردو میں بھی امتزاجی رنگ پیدا ہو چکا ہے۔ اس لئے ہم جس معیاری اور خالص زبان کا تصور رکھتے ہیں اس کا استعمال آج ممکن نہیں، ہمیں عالمی ترقیات اور ٹکنالوجی کے اس دور میں اصطلاحات قبول کرنے سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ ان اصطلاحات کے متبادل الفاظ جو عربی و فارسی کے توسط سے گڑھ لئے جاتے ہیں وہ بچوں کے لئے چیستاں بن جاتے ہیں، ان سے تفہیم میں آسانی کے بجائے الجھنیں پیدا ہوتی ہیں بچوں کے لئے تیار کردہ مطبوعات میں بھی مصنوعی اور ازکار فہم اصطلاحوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ کوشش کرنی چاہئے کہ عام طور پر گفتگو کرتے ہوئے ہم جو ملی جلی زبان استعمال کرتے ہیں وہی ادب اطفال میں بھی استعمال کریں۔ مرکب جملوں سے پرہیز کریں، چھوٹے چھوٹے خود کفیل جملے لکھیں، ادق اور مغلق الفاظ بچوں کے لئے گراں بار ہو جاتے ہیں۔ جس AGE GROUP کے لئے تحریر پیش کی جا رہی ہے اس کے پیمانہ فہم کا خیال ضرور رکھا جائے۔ تراکیب، علامات، اشارات، تشبیہات اور دوسرے دشوار محاسن سخن

سے بچنے کی کوشش کی جائے،صراحت اور سادگی کے ساتھ جو موضوع بیان کیا جاتا ہے وہ بچوں کے لئے دل نشیں ہو جاتا ہے۔تلمیحات کا استعمال بھی بچوں کو الجھن میں ڈال دیتا ہے۔

۵۔بچوں کے لئے ادب کی تخلیق کے دو بنیادی مقاصد ہوتے ہیں۔اول تو یہ کہ بچے اپنی سطح پر رہ کر اظہار و بیان کی صلاحیت پیدا کر سکیں،انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے خزانۂ الفاظ (جو ظاہر ہے ان کی عمر میں مختص ہوتا ہے) کے توسط سے اپنے خیالات و محسوسات کا اظہار کر سکیں۔اضافی محنت کئے بغیر ان میں وہ ہنر پیدا ہو جائے کہ جس حد تک وہ زبان جانتے ہیں اس میں واقعات،موضوعات اور محسوسات کے بیان پر قادر ہو سکیں۔اس طرح بھی یہ ضروری ہے کہ ادب اطفال میں لغات والفاظ (VOCABULARY) اور نحوی ساخت (SYNTACTICAL STRUCTURE) کو آسان اور ممکن الحصول بنایا جائے۔ادب اطفال کا دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچے ان تحریروں سے انسانی اور اخلاقی اقدار حاصل کر سکیں۔ایک مہذب،بہتر اور صالح معاشرے کی تشکیل کے لئے بچوں کے کردار و اخلاق پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے،اس لئے اصلاً ادب اطفال کے فن پاروں کو سبق آموز اور.....فن پاروں میں راست نصیحت کی بجائے اسے بانداز دیگر پیش کیا جائے تا کہ قیمتی اور کارگر باتیں بیکار نہ ہو جائیں۔

ان معروضات کی روشنی میں کہکشاں توحید کی کہانیوں کا مطالعہ کرنا چاہئے پہلی کہانی ''چندو کی عید'' ایک غریب بچے کی کہانی ہے،باپ پان بیڑی بیچتا ہے وہ بچے کے لئے عید کے کپڑے نہیں بنوا سکتا چندو کی ماں مر چکی ہے،باپ پر بیمار بھائی کا بوجھ بھی ہے۔دوسرے بچے چندو کی ناداری کا مذاق اڑاتے ہیں،کریم بھی طنز کرتا ہے،چندو کا باپ غریب ضرور ہے لیکن حد درجہ ایمان دار ہے،کسی کو دھوکا نہیں دیتا،بیٹا سوچتا ہے کہ ایسی ایمان داری کس کام کی۔حالات پلٹتے ہیں،کریم کا بھائی بے ایمانی کرنے اور خریداروں کو دھوکا دینے کے جرم میں پکڑا جاتا ہے،چندو کا باپ پیسوں سے اس کی مدد کرتا ہے اور اسے چھڑا لیتا ہے،ایک بار مرزا صاحب کا بیگ دوکان میں چھوٹ جاتا ہے،اس میں بہت سے روپے تھے،چندو کا باپ اس بیگ کو حفاظت سے مرزا صاحب تک پہنچا دیتا ہے،انعام میں وہ سو روپے دیتے ہیں،انہیں روپوں

ہے وہ بیٹے کے لئے عید کے کپڑے خرید لیتا ہے۔ایمانداری کا انعام کبھی نہ کبھی مل جاتا ہے۔

دوسری کہانی 'ننھے راہبر'۔شنو اور گلو کا باپ رکشہ چلاتا ہے،غریب آدمی ہے، بیوی بیمار رہتی ہے،علاج کے لئے پیسے نہیں، دوا آئے تو چولہا نہیں جل سکتا،شنو سخت پریشان ہے،ڈپٹی صاحب بھی مدد کرنے کو تیار نہیں، بڑی مشکلوں سے ڈپٹی صاحب دو روپے عنایت کرتے ہیں،ماں مرجاتی ہے،ڈاکٹر عادل علاج اس لئے نہیں کرتے کہ شنو کے پاس فیس کے پیسے نہیں ہیں۔ماں کے مرنے کے بعد شنو گھر کو سنبھال دیتی ہے ملازمت کرتی ہے، چھوٹے بھائی کا اسکول میں داخلہ کراتی ہے،عہد کرتی ہے کہ اپنے بھائی گلو کو ڈاکٹر بنائے گی تاکہ آئندہ کسی ڈاکٹر سے مایوس نہ ہونا پڑے۔عزم مستحکم ہو اور انسان محنت کرے تو مصیبتوں کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

'کارساز' میں رضیہ بیگم ہیں جو دولت کی وجہ سے حد درجہ مغرور ہیں، وقت پلٹتا ہے،شوہر لقوہ کی وجہ سے بیکار ہوجاتے ہیں،نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ بیٹے کو مزدوری کرنی پڑتی ہے،ایک اور غریب بچہ گڈو ہے،وہ بھی مزدوری کر کے گزراوقات کرتا ہے،ایک روز وہ زخمی ہوجاتا ہے اور اسی حالت میں مزدوری کرتا ہے۔رضیہ کو اس کی حالت زار پر افسوس بھی آتا ہے تاہم اسے لگتا ہے کہ بہر حال اس کی مصیبت دوسروں سے کم ہے، یہ بھی سکون کا ایک ذریعہ ہے۔

'غم گسار' میں بجو اور فیضی نظر آتے ہیں، بجو کو چوری کرنے اور جھوٹ بولنے کی عادت لگ گئی تھی اس کا دوست فیضی چاہتا تھا کہ اس کی یہ عادت چھوٹ جائے۔دونوں دوست تھے، سچے دوست۔اپنے خالہ زاد بھائی وقار سے مل کر اس نے ایک اسکیم بنائی،وقار ڈاکٹر ہے،فیضی اس کے اسپتال میں........

'سزا' میں رفیع ہے، رات بہت دیر تک گھر نہیں پہنچتا، ماں سخت پریشان ہوتی ہے،ایک بار دیر رات آیا تو سر پر پٹی بندھی تھی، چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا،خوب پٹائی ہوئی۔ماں اکثر اس کی پشت پناہی کرتی تھی، اس کی وجہ سے وہ جرائم کا عادی ہوگیا تھا محمد رفیع کہیں چلا گیا، بھائی چنو ماں کے پاس رہا، ماں بیمار پڑتی ہے، پیسے نہیں کہ علاج ہو، جمن اس

کے لئے پیسے لا رہا تھا مگر راستے میں کسی نے جیب کاٹ لی، پاکٹ مارنے والا کوئی اور نہیں رفیع ہی تھا، بغیر علاج کے ماں مر جاتی ہے۔ رفیع آتا ہے اور بالآخر چوری سے توبہ کر لیتا ہے۔

کہانی 'یادیں' میں ایک چھوٹی بچی ہے جو ضعیفوں کی خدمت کی وجہ سے بزرگوں کی دعائیں لیتی ہے اور زندگی میں کامیاب ہوتی ہے۔ اسی طرح کہانی ''شرارت کا پھل'' میں جامی جو پڑھنے لکھنے سے جی چراتا ہے، ماں نے حلوہ بنایا، چوری کر کے کھانے کے لئے وہ اس کمرے میں چھپ گیا جہاں ماں نے حلوہ رکھا تھا، باہر سے کمرہ لگا دیا تھا۔ وہ کمرے میں بند ہو جاتا ہے۔ جب دیر رات تک پتہ نہیں چلا تو بالآخر راز ظاہر ہو گیا۔ پٹائی ہوئی تو اس نے توبہ کر لی۔ ''ہمدم' قمر اور روفی دو دوستوں کی کہانی ہے، ایک دوست نے دوسرے دوست کے علاج کے لئے حکمت عملی سے پیسے اکٹھے کئے، وہ جھوٹ بولا لیکن ایسا جھوٹ جس سے کسی کی بھلائی ہو قابل ستائش بھی ہو سکتا ہے۔ کہانی ''مجھے میری ممی سے بچاؤ'' میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک اچھے معاشرے کی تشکیل کی بڑی ذمہ داری والدین اور بزرگوں پر ہے۔ بچے کبھی والدین کی بے پروائی، کبھی ان کی زیادتی اور کبھی خود والدین کی بے راہ روی کے اثرات قبول کرتے ہیں۔ کہانی ''رشتوں کا کیا'' کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ مصیبت میں جو کام آجائے دراصل وہی عزیز اور رشتہ دار ہوتا ہے۔ عسرت کے وقت اپنے بیگانے ہو جاتے ہیں اور غیر مدد کے لئے تیار ہو جاتا ہے 'اندھیرا' ایک ایسی کہانی ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ دولت کی فراوانی بسا اوقات انسان کو آسائش پسند بنا دیتی ہے۔ باہمی محبت کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے بخلاف اس کے ناداری میں محبت قوی تر ہوتی ہے۔ اس لئے غربت سے گھبرانا نہیں چاہئے اور رشتے اور قرابت کا احترام کرنا چاہئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ کہکشاں توحید کی یہ کہانی بہر لحاظ کامیاب ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان سے بچوں کو اچھائیوں کا درس ملتا ہے۔ ادب اطفال کے تحت لکھی جانے والی کہانیوں اور بڑوں کے لئے لکھے گئے افسانوں میں ایک بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ ادب اطفال میں مقصدیت حاوی ہوتی ہے، اور عام انسانوں میں فنی جمالیات کی حیثیت مقدم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بچوں کی کہانیوں کو بھی اس طرح دلکش بنایا جا سکتا ہے کہ تعمیری پہلوؤں کے ساتھ

ساتھ اسلوب میں بھی تازہ کاری اور کشش پیدا ہو جائے۔ کہکشاں توحید کی یہ اولین کاوش ہے۔'نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول کے مصداق.........

(انتخاب۔ ۲۹ صفحہ ۱۷ سن اشاعت ۲۰۱۴ء)

☆☆
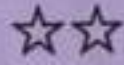
ریحانہ نواب

ریحانہ نواب مشاعروں کی کامیاب شاعرہ ہیں۔انہیں عوامی مشاعروں میں اس قدر داد تحسین ملتی ہے کہ قاعدے سے انہیں ان ہی تعریفوں سے مطمئن ہو جانا چاہئے تھا۔ بے شمار شعراء ہیں جو مشاعرے کی کامیابی، اپنی خوشنوائی اور عوامی ہر دل عزیزی سے سرشار ہیں۔وہ اس بات کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے کہ مجموعہ شائع کر کے ادبی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کریں۔پھر ریحانہ نواب کے ساتھ ایسا کیوں ہے کہ وہ اپنا مجموعہ ''زلفیں سنوار دو'' شائع کرنے پر بضد ہیں۔غور کرتا ہوں تو اس عزم وارادہ کے پیچھے ریحانہ کی شخصیت کے کئی اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔دراصل وہ وقتی، ہنگامی اور عوامی تعریفوں سے مطمئن نہیں ہوتیں، انہیں فنون لطیفہ کے منصب کا عرفان حاصل ہے، وہ جانتی ہیں کہ شاعری صرف حظ وانبساط کا وسیلہ نہیں ہوتی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ ہمیں آگہی اور وجدان بھی عطا کرتی ہے۔یہ ہمیں ایک ایسے جہانِ ناپیدہ میں پہنچاتی ہے جہاں لطیف ترین حقائق کی یافت ممکن ہے۔یہ ہمیں طبیعات سے مابعد الطبیعات تک لے جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔یہ ہمارے فکر کو انگیخت کرتی ہے اور اس کے ذریعہ بصیرت سے ہمکنار کرتی ہے۔اچھے اشعار لمحۂ موجود کی بشاشت تک محدود نہیں رہتے بلکہ تادیر ہمارے ذہن کو کریدتے رہتے ہیں، ایک مبہم اور غیر شفاف منظر کا نظارہ کراتے ہیں۔فراقؔ کا شعر:

شام بھی تھی دھواں دھواں، حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

یا جگر کا شعر:

کس کا خیال کون سی منزل نظر میں
صدیاں گزر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے

اوران جیسے اشعار ہمیں احساس کی ان دیکھی دنیاؤں کی سیر کراتے ہیں، ہمیں ایک ایسے ذہنی سفر پر آمادہ کرتے ہیں جہاں ہم خود اپنے آپ سے بے قابو ہو جاتے ہیں۔ مشاعروں میں پڑھے جانے والے ایسے اشعار فوری واہ واہ کی نذر ہو کر ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں لیکن جب شائع ہو کر سامنے آتے ہیں تو حیات دوام کے حامل بن جاتے ہیں۔ ریحانہ نواب کی غزلیں حدیث دل کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری کسی لمحے ان کی ذات سے الگ نہیں ہوتی۔ یوں تو غزل کے سوا باقی تمام شعری اصناف میں اپنے نجی جذبات کے راست اظہار کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اپنے جذبات میں خود ہی لت پت ہو کر فن کار جب اظہار و بیان کی سرحد میں آتا ہے تو اس کا بیان ذات کا مرثیہ تو بنتا ہے لیکن قاری اسے فرد واحد کی کیفیات سمجھ کر اس سے متاثر نہیں ہو پاتا۔ حزن والم کی تاثیر اس کے بے محابہ اظہار سے نہیں بلکہ اس کے نیم گفتہ رہ جانے سے دو چند ہوتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ ”برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست“۔ قوال پر حال طاری نہیں ہوتا، حال میں تو سامعین آجاتے ہیں۔ OBJECTIVE CO-RELATIVE کی خصوصیت اچھے شعری اظہار کے لئے ضروری ہے۔ اس حقیقت کے باوجود یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ غزل ہی ایک ایسی صنف سخن ہے جو حد درجہ ذاتی، شخصی اور نجی ہے۔ یہاں فن کار نمائش زخم جگر سے کام لیتا ہے۔ محرومی، ناکامی، یاس والم کے جذبات و محسوسات غزل کو فن کار کی شخصیت سے الگ نہیں ہونے دیتے۔ یہاں، خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ والی خصوصیت ہوتی ہے اور شاعر سارے جہاں کے غم کو اپنا غم بنا لیتا ہے۔ ریحانہ نواب کی شاعری میں اس Personal touch نے نئی نئی شکلیں اپنا لی ہیں۔ ان میں کہیں ذاتی محرومی ہے، احتجاج آمیز نسائی جذبہ ہے، کہیں تقدیر کا شکوہ ہے، کہیں سماجی نظام کا کھوکھلا پن ظاہر ہوتا ہے، کہیں جذبے کا استحکام اور ارادے کی پختگی، کہیں تشخص انائے ہے، اور کہیں وہ کیفیت ہے جسے غالبؔ نے ”رشتہ برپا ہوں قفس میں الفت صیاد

سے" کہہ کر بیان کیا ہے۔ یہ متنوع محسوسات وموضوعات ریحانہ نواب کے مندرجہ ذیل اشعار میں مل جاتے ہیں:

حیراں حیراں کھویا کھویا، پاگل پاگل، بے کل سا
جانے کس کو ڈھونڈنے چندا جھیل کے جل میں آتا ہے

جانے کہاں سے اتنے پرندے شاخوں پر آجاتے ہیں
کھٹا میٹھا البیلا رس جوں ہی پھل میں آتا ہے

وہ مکان جس میں سورج کئی دن رہا تھا مہماں
اسی گھر کی ایک کھڑکی ابھی تک کھلی ہوئی ہے

میں جو ٹوٹ کر گری ہوں تو سبب ہے ٹوٹنے کا
نہ لچک ہو جس میں کوئی وہی شاخ ٹوٹتی ہے

چاہتی ہوں جہاں کا ہر غم ریحانہ دل میں سمیٹ لوں میں
وہ سنگ ہے تو رہے سلامت، میں موم بن کر پگھل رہی ہوں

مجھے خود بھی اس کا پتہ نہیں کہ دکاں پہ کیسے میں آگئی
میں ہوں ملکیت کسی اور کی، مجھے بیچتا کوئی اور ہے

تجھ سے ہی نہیں خود سے بھی ہم دور ہوئے ہیں
تب جاکے کہیں شہر میں مشہور ہوئے ہیں

طوفان بلا خیز سے لڑنے کو ہے تیار
جس کشتی کو تنکے کا سہارا بھی نہیں ہے

اگر پہلے ہی موجوں سے الجھ لیتے تو اچھا تھا
خطا یہ ہے کہ طوفانوں کا رخ موڑا نہیں ہم نے

تری آنکھوں میں جب سے میں نے اپنا عکس دیکھا ہے
مرے چہرے کو کوئی آئینہ اچھا نہیں لگتا

تو ہی بتلا تجھے کس نام سے منسوب کریں

عہد نو جسم پہ تیرے کوئی چہرہ بھی نہیں
ویسے تو زندگی میں کئی بت کدے ملے

تجھ کو صنم کہا تو تجھے پوجتے رہے
ڈوبتے ڈوبتے دنیا سے کہا سورج نے

اک سفر ختم ہوا ایک سفر باقی ہے
ٹوٹا ہے اگر دل تو پریشان سے کیوں ہو

آئینے کی تقدیر میں ہے ٹوٹتے رہنا
اُف یہ سناٹا، یہ خاموشی، یہ اشکوں کا سکوت

کوئی طوفان دبے پاؤں اٹھا ہے شاید
ترا لہجہ بغاوت مجھ کو کرنے پر نہ اکسا دے

گلِ تر پر نہ رکھ کوئی شرر، اچھا نہیں لگتا

ریحانہ نواب کے ان منتخب اشعار سے صرف یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ یہ میری پسند اور معیار کے عین مطابق ہیں بلکہ میں نے یہ اشعار اس لئے نقل کئے ہیں کہ ان سے شاعرہ کے طرز تخلیق کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ کسی فن کار کے مطالعے کی منصفانہ روش یہ ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے ذوق و معیار کو درمیان میں حائل نہ کریں بلکہ اس کے طبع و مزاج، وضع اظہار، اس کے فکر اور لہجے سے ہی اس کی شناخت حاصل کریں۔ ریحانہ نواب کی صحیح پہچان اسی صورت سے حاصل ہوسکتی ہے۔ میں ان کے مجموعہ کلام کا استقبال کرتا ہوں۔

(انتخاب۔ ۲۹ صفحہ ۷۷ سن اشاعت ۲۰۱۴ء)

افتخار راغبؔ

'لفظوں میں احساس' اور 'خیال چہرہ' کے بعد افتخار راغبؔ کا تیسرا شعری مجموعہ 'غزل درخت' آیا ہے۔ اس کے ذریعہ فن کار کی وسیع تر اور بہتر شناخت قائم ہوتی ہے۔ غزلوں کے اس مجموعے کے ابتدائی صفحات پر کلیم عاجزؔ، پروفیسر احمد سجاد، ڈاکٹر فیصل حنیف اور ڈاکٹر مولا بخش کی توصیفی تحریریں مطالعے پر اکساتی ہیں۔ ان تمام ارباب نقد و نظر نے افتخار راغبؔ کی غزلوں کے محاسن کو اپنے اپنے طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوششیں کی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان تحریروں سے اس خوش گو شاعر کے کئی امتیازی اوصاف سامنے آجاتے ہیں۔ دراصل غزل کے اچھے اشعار ہشت پہل خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں، یہاں "صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے" والی بات ہوتی ہے۔ ہر ذہین قاری اشعار کو اپنے زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے اور اچھا شعر قرأت کی جتنی جہتوں سے گزرتا ہے اس میں اسی قدر معنوی تہیں نمودار ہوتی ہیں۔

افتخار راغبؔ کے لہجے کی سادگی سب سے پہلے ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اکثر شعراء اپنی تخلیقی کمزوری کو چھپانے کے لئے خوب صورت تراکیب اور صناعانہ حربوں کا استعمال کرتے ہیں، راغبؔ کی شاعری اپنی فطری سادگی کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔ لیکن اس سلیس اور سادہ اندازِ اظہار میں جوہر سخن کچھ اس طرح چمک پیدا کر دیتا ہے کہ قاری چونک جاتا ہے، ان کے یہاں لفظوں کے استعمال میں کفایت شعاری بھی ہے، کم سے کم لفظوں میں نہایت غیر صناعانہ انداز میں افتخار راغب سہل ممتنع کی خصوصیت پیدا کر دیتے ہیں۔

افتخار راغبؔ غزل کی اس فنی خصوصیات سے آشنا ہیں جس کے ذریعہ کائنات کو اپنی ذات

کی کیفیات میں سمیٹا جاتا ہے۔غزل فن کار کی اپنی ذات سے کبھی الگ نہیں ہوتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سماجی، خارجی اور اجتماعی سروکار کی ترجمان بھی ہوتی ہے۔یہاں فنکار کا ارتکاز اور استغراق خارجی وقوعوں کا استعارہ بن جاتا ہے۔راغبؔ کو اس امر کا احساس ہے۔ایک جگہ کہتے ہیں

اُن کے بھی فسانے میں کردار مرا روشن
گم گشتہ نہیں ہوں میں اپنی ہی کہانی میں

ان کا سیاسی شعور یہ واضح کرتا ہے کہ:

جو سچ پوچھو تو ساری تیسری دنیا کی سرکاریں
کسی کے ہاتھ کی کٹھ پتلیاں معلوم ہوتی ہیں

افتخار راغبؔ ایک باشعور فن کار کی طرح عالمی سطح پر ہونے والے واقعات وواردات سے واقف ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ بعض بڑی طاقتیں کمزور جماعتوں کو نقصان پہنچانے کی درپے ہیں اور اس طرح امن عالم میں مسلسل خلل پیدا کر رہی ہیں۔راغبؔ کے اشعار میں چھپے یہ محسوسات تمام تر فنی جمالیات کے ساتھ موجود ہیں، کہتے ہیں:

ہمارے ہاتھوں وہ ہم کو تباہ کرتے ہیں
یہ اور بات کہ اس کی ہمیں خبر بھی نہیں

فسطائی طاقتوں کے خلاف ان کے توانا احتجاج کا نمونہ دیکھئے۔

وہ کہتے ہیں کہ ہم ہیں دشمنانِ امن کے دشمن
میں کہتا ہوں کہ ان کے ہاتھ میں شمشیر کس کی ہے

راغبؔ کے فکر و نظر کا کینوس خاصا وسیع ہے۔عہد حاضر کی تہذیبی بے راہ روی، انتظامیہ کی نااہلی، اقتدار کا جبر، تخریب پسندوں کی گروہ سازی، ماحولیات، ہجرت، گلوبل وارمنگ، طاقتوں کا عدم توازن، غربت اور ناداری، استحصال، فکری انتشار، حکمت عملی کا فقدان، انسانی اقدار کا انحطاط...... یہ اور اس طرح کے متعدد مسائل و موضوعات افتخار راغبؔ کے فن میں منفرد تخلیقی تیور کے ساتھ ہمارے لئے آگہی اور فرح مندی کا وسیلہ بنتے ہیں۔ان تمام موقعوں پر کہیں بھی راغبؔ کے ہاتھوں سے شعری جمالیات کا دامن نہیں چھوٹتا۔ان اشعار پر غور کیجئے

اس لفافے میں بند ہوں راغبؔ
جس پہ نام اور پتہ نہیں موجود
لے جائے جہاں چاہے ہوا ہم کو اڑا کر
ٹوٹے ہوئے پتوں کی حکایت ہی الگ ہے
(بیرون ملک بے نام ونشان مہاجرت کا احساس)
کیا خوب ہر طرف ہے ترقی کی دھوم دھام
کشکول تھامے ملک ہے کاسہ بدست لوگ
(ترقی معکوس کا منظرنامہ)
کیا حشر اس زمین کا ہو گا نہ پوچھئے
بڑھتی رہی جو یوں ہی تمازت زمین کی
(گلوبل وارمنگ کا خوف)
یک جا تھے سارے فہم وفراست میں پست لوگ
قبلہ بنے ہوئے تھے قبیلہ پرست لوگ
(ذات پات گروہ بندی اور فرقہ پسندی کی ذہنیت)
بڑھ رہا ہے مستقل قحطِ شجر
زہر آلودہ فضا ہے مستقل
آب وہوا کی آنکھوں میں کیوں اشک آگئے
شاید کوئی درخت ہرا کاٹنے لگا
(ماحولیات کا احساس)

افتخار راغبؔ کی شاعری ان کے اپنے مزاج اور طرز فکر کی عکاس ہے۔ان کے کلام میں خاکساری، بے ریائی، سادگی، استغنا، درویشانہ بے نیازی اور سرمستی کے موضوعات و محسوسات کثرت سے ملتے ہیں۔ان موضوعات کے اظہار میں بھی ان کی فنکارانہ ہنرمندی انہیں ممتاز بناتی ہے۔

زمیں دوز ہوئے کتنے آسمان وجود
ترے غرور کا سورج بھی لا زوال نہیں
نہ فرق پاؤ گے کچھ میری خاکساری میں
زمین بن کے ملو تم کہ آسماں بن کر
کیا پتا عظمتِ انکسار
خود نماؤ تمہیں کیا پتا

افتخار راغبؔ کا ڈکشن بہت سے نوجوانوں اور ہم عصر شعرا سے مختلف اور ممتاز ہے۔وہ اپنے قاری کو الفاظ وتراکیب کے خوش رنگ کھلونوں سے بہلاتے نہیں،اظہار میں اختصار سے کام لیتے ہیں،کہیں کہیں غزل کے اشعار میں مکالماتی رنگ پیدا کر لیتے ہیں،مشکل سے مشکل ردیفوں کو جُزوِ شعر بنا لیتے ہیں،کہیں غزل مسلسل نظم کا روپ دھارتی نظر آتی ہے،عام طور پر سادہ شعر دوہری معنویت کا حامل ہو جاتا ہے،بالکل نئے TEXTURE سے معنی ومفہوم کی نیرنگی پیدا کر لیتے ہیں۔مندرجہ ذیل اشعار سے افتخار راغبؔ کے لہجے کی انفرادیت آشکار ہوتی ہے۔

کسے ہے خواہشِ آسودگی محبت میں
نواز کر مجھے جینا مرا محال تو کر
وجہِ بے خوابی بتا کر مجھ کو
نیند میری بھی اُڑا دی اُس نے
تیری خوش بو مرے شعروں میں بسا کرتی ہے
شاعری قرض محبت کا ادا کرتی ہے

موجودہ تخلیقی منظر نامے میں افتخار راغبؔ کا یہ لہجہ جس طرح 'لفظوں میں احساس' اور 'خیال چہرہ' سے ہوتے ہوئے 'غزل درخت' تک پہنچا ہے اس کی بنیاد پر بلاشبہ زیادہ روشن امکانات کی توقع کی جاسکتی ہے۔

(انتخاب۔۲۹ صفحہ ۸۰ سن اشاعت ۲۰۱۴ء)

ضر ؔ وصفی

جناب ضرؔ وصفی نے ادھر بیس بائیس برسوں میں اپنی جو شناخت قائم کر لی ہے وہ بہتوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ ان کا پہلا مجموعہ ''شب چراغ'' ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ''نسبتِ بے ستون'' ۲۰۰۲ء میں، تیسرا ''حرف حرف لہو'' ۲۰۰۸ میں اور چوتھا مجموعہ ''ساغر حرف'' ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ آج سے کم وبیش دس سال پہلے میں نے جناب ضر کی شاعری کے سلسلے میں اپنے تاثرات پیش کئے تھے۔ وہ تحریر کہاں چھپی تھی اب یاد بھی نہیں۔ ان کی تازہ مطبوعات اور ادبی رسائل میں ان کی تخلیقات کی متواتر اشاعت سے میں آج اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ ان کی تخلیقی حیثیت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے۔ تخلیق کاروں میں متعدد ایسے حضرات بھی سامنے آئے ہیں جنہوں نے کسی ایک دور میں اپنی تخلیقات سے متاثر کیا ہے لیکن بعد کے عرصے میں کمزور ہو گئے ہیں۔ اس لئے تاثرات اور آرا کی حیثیت بھی زمانی ہوتی ہے۔ کبھی کسی کے بارے میں تحسین وآفریں کے کلمات بعد کے وقتوں میں کارگر نہیں ہوتے۔ لہٰذا ہر تحریر کی معنویت بالعموم وقتی اور ہنگامی ہوتی ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ میں نے جناب وصفی کی تخلیقات پر جو گفتگو کی تھی وہ آج نہ صرف یہ کہ قائم ہے بلکہ ان کے تخلیقی امکانات اس سے کہیں زیادہ واضح ہو گئے ہیں۔

امکانات کی اسی وسعت کی وجہ سے ضرؔ وصفی ادبی حلقوں میں دور دور تک پہچانے جاتے ہیں۔ ہندو پاک کی بسیط وعریض ادبی دنیا میں بے شمار ایسے اہل قلم ہیں جن کی پذیرائی اپنے خطوں تک محدود رہتی ہے۔ متعدد فنکار ہیں جو شمالی ہندوستان میں تو معتبر سمجھے جاتے ہیں

لیکن جنوبی خطے میں ناشنا سا ہیں۔ اسی طرح جنوب کے گوہر نایاب کی چمک شمال تک نہیں پہنچ پاتی۔ ضؔرر وصفی کی فنی ریاضت اور تخلیق کے میدان میں ان کی کاوشوں کے تسلسل نے انہیں ایک بڑے تناظر میں شہرت و مقبولیت بخش دی ہے۔ یہ نصرت کتنوں کو مل پاتی ہے۔؟

ضؔرر وصفی کے یہاں جو بات سب سے پہلے ہماری توجہ کھینچتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ غیر معمولی قوت بیان اور قدرت اظہار کے حامل ہیں۔ اظہار و بیان کی قدرت و روانی ایک ایسی طاقت ہوتی ہے جس کے طفیل فنکار متنوع موضوعات کو نظم کر سکتا ہے اور ہر طرح کے ہیئتی ڈھانچوں میں اپنے فکر و احساس کو منظوم کر سکتا ہے۔ ضؔرر وصفی کا سیل اظہار مشکل سے مشکل ردیفوں اور قافیوں پر بھی قابو پا لیتا ہے، ہر نوع کے موضوعات کو اپنے شکنجے میں لے لیتا ہے۔ اظہار کی یہ بے تابانہ کیفیت کبھی کبھی اظہار کے مروجہ قواعد اور پابندیوں سے نکل کر بھاگنے کے لئے بھی جست لگاتی ہے۔ محسوسات کی شدت اور تصورات کی کثرت و فراوانی بسا اوقات خطرناک صورت حال پیدا کر دیتی ہے۔ غالبؔ نے اس کیفیت کو کچھ یوں بیان کیا ہے، کہتے ہیں:

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ
تکلیف پردہ داری زخمِ جگر گئی

اور یہی ہوتا ہے کہ اگر اظہار و بیان کے وسیلے سے لذت فراغ حاصل نہ کر لیا جائے تو احساس کی شدت عذاب جان بن جاتی ہے۔ اظہار کی روانی ضؔرر وصفی کے لئے ایک مداوا ہے، ایک تدارک ہے لیکن اس کے اس پہلو پر بھی توجہ دینی چاہئے کہ بسا اوقات اظہار کا سیل بیکراں معیار فن کو متاثر بھی کر دیتا ہے۔ بسیار گوئی یا بسیار نویسی میں تکرار مضامین کا اندیشہ بھی رہتا ہے اور معیار کے پست اور عمومی ہونے کا احتمال بھی ہوتا ہے۔ ہنر مند سے ہنر مند تخلیق کار کے یہاں اگر BULK ہے تو اس سے اچھے فن پارے چننے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ میر تقی میرؔ اس کی زندہ مثال ہیں۔ ہاں تو بات ہو رہی ہے ضؔرر وصفی کی جنہوں نے قدرت سے طبع کی روانی کی دولت حاصل کر لی ہے اور اس کے ذریعہ وہ متنوع اور متفرق موضوعات سمیٹ لیتے ہیں۔ وہ بسا اوقات لفظوں کے سہارے کسی نادیدہ فضا کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ

مضبوط ہے۔ وہ خارجی وقوعوں سے ایک ماورائی اقلیم تک پہنچنے کے لئے مضطرب نظر آتے ہیں فطرت کی رنگارنگی کو Depict کرتے ہوئے وہ مختلف اجزاء کا امتزاج تیار کر لیتے ہیں۔ اسی لئے ان کی نظموں کی بنت میں کولاج کی خصوصیت ملتی ہے، وہ دھیرے دھیرے دبے پاؤں گزرتے رہنے والے وقت کی رواں تصویر اتارنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

دوپہر کے خزاں زدہ لمحے / خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ ہے / خاک چہرے پہ در بدر کی ہے / دل حسرت زدہ ہے دیوانہ / نیم پاگل یا جیسے وحشی ہوا / کسی پرچھائیں سے ہے خوف زدہ / راگ بے وقت کے الاپتا ہے / بارش سنگ، شور طفلاں میں / زندگی کے کھنڈر میں اب کیا ہے / صرف یادوں کا ایک سناٹا / ہر گھڑی سائیں سائیں کرتا ہے / اور ایسے اداس لمحوں میں / بھولا بھٹکا ہوا کوئی لمحہ / میرے آنگن کے پیڑ پر آ کر / بے محل کائیں کائیں کرتا ہے۔ (نظم: لمحہ)

اپنی نظم ''میرا وطن تلنگانہ'' میں بھی ضؔرر وصفی نے منظروں کو جس طرح روشن کیا ہے اس سے ان کے اظہار و بیان کی توانائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''وادی کشمیر'' اور ''ہجر زدہ'' وغیرہ بھی اسی نوع کی منظومات ہیں۔ اشعار میں معنوی ربط اور موضوعاتی تسلسل ضؔرر کے لہجے کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ انہوں نے اگرچہ غزلوں کے مقابلے میں نظمیں کم لکھی ہیں۔ لیکن ان کے تخلیقی رجحان میں نظم اُس صنفی خصوصیت کا احساس ہوتا ہے جہاں موضوعاتی ربط و تسلسل کا نظام ہوتا ہے۔ فطری مناظر ضؔرر کے یہاں متحرک نظر آتے ہیں۔ فطرت کے جلوے اگر ایک طرف تحیر بہجت کا سبب بنتے ہیں تو حسرت و اضطراب بھی پیدا کرتے ہیں۔ مناظر کو لفظوں کا پیکر عطا کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں:

گاؤں سے کچھ فاصلے پر اک حسیں تالاب تھا / دھان کی مڑیوں کا منظر دلکش و شاداب تھا / سبز کھیتوں سے گزرتی خوش نما پگڈنڈیاں / اور اس کے پار تھے شہر خموشاں کے نشاں / یہ مری تنہائیوں کا مرکز و محور بھی تھا / صبح سے تا شام غور و فکر کا محور بھی تھا / ایک اڑتی طشتری اتری معاً تالاب پر / وہ دمکتی شے کہ جیسے آگ دہکی آب پر / بن گیا اندر سبھا کچھ دیر کو تالاب پر / جیسے بیداری کے عالم میں ہو کوئی خواب پر / چشم حیرت زا تھی اب دل بھی پریشاں ہو گیا / یہ حسین منظر اچانک جب گریزاں ہو گیا۔ (نظم: خواب بیداری)

ضؔر روصفی کی غزلیں بھی عام طور پر نظم نما ہوتی ہیں۔ موضوعاتی اور تاثراتی سطح پر غزل کے اشعار ایک دوسرے سے مربوط ہو کر تسلسل کا شائبہ دیتے ہیں۔ ضؔر ان خوش نصیب شاعروں میں ہیں جنہیں متعدد لوگوں نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ عشرت ظفر، محمد فرحت حسین خوشدل، پروفیسر احتشام اختر، رؤف خیر، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، محبّ کوثر، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر خالد حسین رفیق شاہین، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر طیب انصاری، ڈاکٹر ایم اے قدبر اور ڈاکٹر زبیر قمر ویلوری کے تاثرات و آرا بہر حال اہمیت رکھتے ہیں میں ان کی تائید کرتے ہوئے صرف اس نکتے کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان تخلیقات میں اوزان و بحور کی غلطیاں کھٹکتی رہتی ہیں۔ پروف ریڈنگ کی طرف سے بے نیازی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمپوزنگ کی غلطیاں بھی فنکار کے کھاتے میں چلی جاتی ہیں۔ اس رواں دواں لہجے کے خوش گو اور منفرد شاعر کو بہر حال ہشیار رہنا چاہئے۔ (انتخاب۔ ۲۹ صفحہ ۸۴ سن اشاعت ۲۰۱۴ء)

انور شمیم

انور شمیم کو ہو یا نہ ہو، مجھے ہم عصر ناقدین سے یہ شکایت ضرور ہے کہ انہوں نے انور شمیم کی شاعری سے بے توجہی برتی ہے۔ان کی غزلوں کا مجموعہ ''زہر باد'' شائع ہوا لیکن ہر طرف سناٹا چھایا رہا،ان کی منظومات مختلف ادبی رسائل میں تواتر کے ساتھ چھپتی ہیں،نظم کے قارئین انہیں پسند بھی کرتے ہیں لیکن نئی ہیئتوں کی شاعری سے دلچسپی کا دعویٰ کرنے والے مبصرین وناقدین خاموش رہتے ہیں۔منظومات کے باب میں میرا رویہ تو خیر ایسا ہے کہ نثری نظمیں اور بحرووزن سے عاری منظومات کے خالقین کو مجھ سے کچھ زیادہ توقع بھی رہتی نہیں اس لئے وہ مجھ سے شاکی بھی نہیں ہو سکتے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ میں اُردو شاعری کو اس فطری آہنگ اور صوتی نغمگی سے ہم رشتہ سمجھتا ہوں جو ہماری ثابتاً شعری جمالیات کے وسیلے سے حاصل ہوتی ہے ہیئتوں کے بے ترتیب تجربات سے عام طور پر مجھے الجھن ہوتی ہے۔میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہر زبان کی شاعری کی جمالیات کا تعلق اس کی ثقافت اور اجتماعی تہذیب و معاشرت سے ہوتا ہے جو اس لسانی گروہ کی امتیازی شناخت بنتی ہے۔اس تہذیب وثقافت کے نقوش صدیوں میں مرتب ومتشکل ہوتے ہیں۔اس کی تشکیل میں اس مخصوص زبان کے عناصر ترکیبی،دوسری زبان سے اس کے تال میل کے اثرات،لسانی جماعت کے معتقدات، رسم ورواج،سیاسی وسماجی وقوعوں کے نتائج،ترسیل اظہار کے نئے مواقع،لسانی فروغ اور دوسری زبانوں سے امتزاج کے نتیجے میں الفاظ ومحاورات میں تغیرات وتوسیع ----غرض متعدد عوامل ہیں جو تہذیب وثقافت کے راستے سے شعری جمالیات پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں لیکن اس سلسلے

میں تبدیلی کی رفتار نہایت سست گام ہوتی ہے۔ یہ اکثر و بیشتر غیر محسوس بھی ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ اُردو کی شعری ہیئتوں کو میں مستحکم لسانی جمالیاتی اقدار سے الگ کر کے دیکھنے کا قائل نہیں۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ کبھی کبھی میرے اس نقطۂ نظر میں اضمحلال بھی پیدا ہو جاتا ہے، میں ایسے مواقع کو مستثنیات پر محمول کرتا ہوں یعنی یہ کہ کبھی ثابتا اور مستحکم ڈھانچوں سے ہٹ کر ایسی تخلیقات بھی سامنے آجاتی ہیں جو ہیئتی عجوبہ کاری کے باوجود غیر معمولی تخلیقیت کی حامل ہوتی ہیں۔ انور شمیم کی نظم نگاری کے سلسلے میں میری پسند کی نوعیت کچھ ایسی ہی ہے۔ ان تمہیدی سطور سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ میں انور شمیم کی منظومات کو بحر و وزن سے عاری اور یکسر آزاد تصور کرتا ہوں۔ مذکورہ بالا بیان کی حیثیت جملہ معترضہ کی سی ہے۔ یہاں اس کے جواز کی صورت یوں ہے کہ انور شمیم کی تخلیقیت الفاظ و اشارات کی بالکل نئی بافت کے ساتھ ہمیں چونکاتی ہے۔ فسون و انتشار کو غزل بنالینا، فطرت کی اشیا کو نظم کی ردا قرار دینا، اشیا کا شعری پیکروں میں بدل جانا، پرندوں کی طرح اپنی شخصیت کو فضا میں تحلیل ہوتے ہوئے محسوس کرنا، پارسائی کو جوتیوں میں ڈال آنا، منظروں کا چھپانا، مشام جاں میں مشک پاروں کی نغمہ سرائی، خدا کا بدن میں سرسرانا، شاعری سے مزرع روح کی سیرابی حاصل کرنا، مُردوں کا خیریت سے رہنا اور ان جیسے متعدد کنایات نے انور شمیم کی روایتی پابندیوں پر ایک خاص انداز سے ضرب لگائی ہے۔ انہوں نے اس کے ذریعہ ایک آزاد تخلیقی اظہار تلاش کرلیا ہے جہاں ہیئت کی پابندی نا قابل اعتنا ہو جاتی ہے۔ ان کی شاعری کارخانہ قدرت میں پھیلی ہوئی فطری خوبصورتی کو سمیٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان کی منظومات میں پینٹنگ کا حسن ہے، دیہی مناظر کا حسن خاص طور پر دلکش پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ ان کے اظہار کے رویے میں 'رنگ' کی خاص اہمیت ہے، 'جاناں' اور 'رنگ' کے استعارے ان کے تخلیقی امواج میں اختصاص پیدا کرتے ہیں، ان کی اُردو شاعری پر سبک ہندی کا احساس ہوتا ہے اور اسی منظومات میں Rustic sensibility کا بھرپور لطف ملتا ہے۔ روحانی انجذاب، درویشانہ بے نیازی اور ایک جوگی کی درون بینی نظم کو شاعر کی شخصیت سے قریب کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ارضیت سے پرے شاعر ایک ماورائی فضا کا متلاشی نظر آتا ہے۔ فطرت کی درزوں میں جھانکتا ہوا فن کار حسن ازلی کے

لئے کچھ اس طرح بیتاب رہتا ہے۔

پہاڑوں
اور درختوں کی
قطاروں کی طرف
سارے دریچے کھل رہے ہیں
سمندر------کھڑکیوں سے جھانکتا ہے
طلوعِ صبح کا منظر
درودیوار و محراب بدن پہ چھچہاتا ہے
مہ کامل کی کرنیں
روزنوں سے جھانکتی ہیں
دھنک تتلی شفق بادل ہوا خوشبو
سبک دریا سکوت کوہ
میدانوں میں ہاؤ ہو
مشام جاں میں کیا کیا مشک پارے
گا رہے ہیں
مظاہر جلوۂ جاناں میں سارے
آ رہے ہیں جا رہے ہیں
خدا کا کلمہ سارے گا رہے ہیں
خدا سارے بدن میں سر سراتا
اپنا کلمہ پڑھ رہا ہے
لا الٰہ
لا الٰہ!!

(نظم: خدا سارے بدن میں سرسراتا ہے)

انور شمیم کے یہاں ماورائیت کی یہ تلاش، تڑپ اور یافت کی سرشاری ان کی نظموں میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ ''ذرا سا نور جاناں''، ''آگہی''، ''کسے بھاتا ہے آخر''، ''اس عجب خواب کی تعبیر کہو تو جاناں'' کے علاوہ متعدد منظومات میں فکر و احساس کا یہ آمیزہ ان کے یہاں ایک بالکل ہی نئے لہجے کا احساس دلاتا ہے کبھی کبھی احساس 'گوشے' کی صورت میں پالنے کا اضطراب اور کرب انور شمیم کی شخصیت کے اندرون میں طوفان اٹھاتا رہا ہے۔ وہ حق الیقین کو عین الیقین بنانا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں:

دائمی ایک حقیقت------
کہ نہیں جس کو زوال
شاعری ہے
کہ وجود
قرن ہا قرن سے ہے
دائمی ایک حقیقت------
کہ نہیں جس کو زوال
صرف جذبہ نہیں، احساس نہیں
پیاس نہیں
صرف صناعی فنکار نہیں
مزرع روح کی سیرابی ہے
اس تصوف کو سمجھنا بہت آساں بھی نہیں
گوشۂ قلب میں پوشیدہ سی جھنکار کوئی
صورت والفاظ کے پیراہن زرتار میں جو
کرۂ ارض کو ہے کب سے محیط
اور رہنا ہے ابد تک جاناں!!

(نظم: گوشۂ قلب میں پوشیدہ سی جھنکار کوئی)

اندرون کی اس جلتی سلگتی آگ میں انور شمیم سماجی سروکار سے غافل نہیں ہو جاتے۔ وہ معاشرے میں پھیلے ہوئے جبر کے خلاف بیزار ہیں۔ظلم، استحصال، فرقہ واریت، نقص امن، گندی سیاست میں سماج کی خاموشی انہیں مضطرب کرتی ہے۔ان کی شاعری میں حالات کو بدلنے کا ایک توانا شعور اپنے مضبوط تیور کے ساتھ سوتوں کو جگانے کا کام کرتا ہے۔ان کی نظم "مردے خیریت سے ہیں" اگر عام بے حسی کا منظر نامہ پیش کرتی ہے تو "لیکن پنکھ بندھے تھے جاناں" جبر کے احساس سے مملو ہے۔امن عامہ کے قیام کے حوالے سے ان کی نظمیں "کسے بھاتا ہے آخر" اور "اس عجب خواب کی تعبیر کہو تو جاناں" نیز "کیوں ڈرامے ہو رہے ہیں" خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔بے حسی بیزاری اور معاشرے کی زبوں حالی کے خوبصورت Depictions ان کی نظم "مردے خیریت سے ہیں" کے علاوہ "موت" سیریز کی منظومات میں ملتے ہیں۔انور شمیم کی نظموں کی بنت میں سماجی شعور کے ساتھ تنہائی اور کسمپرسی کی کیفیات اور پرسنل تجز خارجی مسائل کو دل نشیں بنا دیتے ہیں۔حالات کی تمام ابتری اور نامساعدت کی ترجمانی میں فنکار کی اپنی شخصیت کا Involvement انور شمیم کے یہاں ایک نئی تخلیقی دروبست کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ان کی نظم "ایک دیوار نہیں ہے خالی" ان کے اثاثۂ فکر کے تمول کی پہچان ہے۔انور شمیم نے شعری ترجمانی کی نئی صورتیں کچھ اس طرح پیدا کی ہیں کہ ہیئتی شکست وریخت ایک نئی شعری فضا بنتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔غزل انور شمیم کے یہاں ایک اضافی ترسیل کا وسیلہ بنتی ہے۔وہ واضح کر دیتے ہیں کہ:

بیاں کرتی ہے عصر نو کے قصے
غزل رقاصۂ دربار کیوں ہو

وہ غزل کے اشعار کی Nucleus Entry کے ہنر سے واقف ہیں۔لہجوں کے جم غفیر میں انہوں نے اپنی پہچان کے منفرد نقوش بنا لئے ہیں۔غزل میں موضوعات ومسائل اور فنکار کے اپنے محسوسات بیرونی سطح پر نہیں تہ نشیں ہوتے ہیں یہاں "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" والی خصوصیت ہوتی ہے۔انور شمیم کی نیم گفتنی والا لہجہ غزل کے اس بنیادی فنی رمز سے آشنا ہے۔ان کی غزلیہ شاعری کا سرمایہ بھی خاصا وقیع ہے۔پہلی قرأت میں مجھے ان کے

مندرجہ ذیل اشعار اچھے لگے:

دھوپ بارش میں بھیگنے والے
چھت کسی کے لئے کہاں ڈھونڈیں

یہ آنکھیں جاگتی رہتی ہیں بے سبب شب بھر
انہیں کسی کا بھی اب انتظار تھوڑی ہے

پسند آیا تو خوش ہو کے ہاتھ کاٹ دیے
ہنر کا یوں بھی زمانے نے اعتراف کیا

رہائی کی یہی صورت ہے ایک، سچ مانو
کہ اب فصیلوں کا گرنا بہت ضروری ہے

ریت پہ نقش ٹھہرتے تو نہیں
انگلیاں اپنی ادا پر قائم

اٹھاؤ تیشہ تو ممکن ہے کوئی بات بنے
کہ اب صدا سے فصیلوں میں در کھلے گا نہیں

خدا کی مصلحت تو بس خدا بہتر سمجھتا ہے
مگر یہ امتحاں پر امتحاں اچھا نہیں لگتا

چاک کرتا نہیں پیراہن جاں
ہر کوئی داد وفا چاہتا ہے

سرکشی کیا ہے کہ فریاد تلک لب پہ نہیں
اتنا بے حس بھی کہیں وقت بنا دیتا ہے

بات کرتا ہے مجھ سے سناٹا
اور ہوتی بھی ہے کرامت کیا

کوئی بھی رنگ تو کچھ دیر آنکھ میں ٹھہرے
کسی کا عکس غم جاوداں دکھائی دے

ٹوٹ جانے میں مرے جرم ہوا کا کب تھا
میری شاخوں میں بھی تھوڑی سی لچک ہونی تھی
رونے دھونے سے ستم شہر کا کیا ٹل بھی گیا
چشم نم میں تو شراروں کی لپک ہونی تھی

(انتخاب۔۲۹صفحہ ۸۷سن اشاعت ۲۰۱۴ء)

☆☆

ندا فاضلی

ایک ایسے دور میں جب شہر کاری کا ماحول تیزی سے حاوی ہوتا جا رہا ہے، ندا فاضلی شہر میں گاؤں بسانا چاہتے ہیں۔ ان کی شعری مجموعوں کا ضخیم انتخاب ''شہر میں گاؤں'' اردو شاعری کے ہم عصر منظر نامے میں فکر و نظر اور تخلیقیت کے ایسے نقوش بناتا ہے جن سے اغماض نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تیزی سے بڑھتی ہوئی انسانی آبادی اور راحت، آسائش کی نئی ایجادات نے عالمی سطح پر انسانی معاشرے پر کئی منفی اثرات مرتب کئے ہیں۔ سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں نے انسانی اقدار کو بھی مجروح کیا ہے اور انسان مادے کے مایا جال میں کچھ اس طرح جکڑ چکا ہے کہ بظاہر فراغ و کشاد کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ زندگی کے موجودہ ڈھانچے نے سب سے بڑا حملہ یوں کیا ہے کہ ہم سے وہ احساسات چھین لئے ہیں جو شہر کاری کے مضر اثرات کے سلسلے میں پیدا ہونے چاہیں تھے نتیجہ یہ ہے کہ آج انسان اقدار و احساسات سے محروم صارفانہ نظام کا ایک مجہول اور بے معنی جزو ہو کر رہ گیا ہے۔ اس پر آشوب و اقدار کش اور بے کیف و بے مزہ صورت حال میں ندا فاضلی ہمیں جھنجھوڑ کر بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری کے سلسلے میں پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ یہ سرتاپا انحراف، اختلاف اور احتجاج سے معمور ہے لیکن ایک عجیب بات ہے (اور اچھی بات بھی ہے) کہ یہ ہماری شاعری کے عام مروجہ اور معروف احتجاجی لہجے کے خاصی مختلف ہے۔ ہمارے یہاں نعروں کو احتجاج و اختلاف سمجھنے کا رواج رہا ہے۔ میر انعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب، راج سنگھاسن ڈانواں ڈول اور اسی طرح کے کف در دہن جذبات ہمارے لہو کو گرما تو سکتے ہیں اور ممکن ہے اس کے اثر

سے کہیں کنجشک فرد مایہ شاہی سے لڑنے کی جسارت بھی پیدا کرے مگر یہ سارا کھیل ہنگامی اور مادی تبدیلیوں تک محدود رہتا ہے جو کچھ دیر کے لئے ایک خارجی انقلاب کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے مگر بہت جلد شعلۂ مستعجل کی طرح جوابی انقلاب (Counter revolution) کی نذر ہو جاتا ہے۔ نظام کو بدلنے کا یہ طریقہ خود اپنے حربے سے مات کھا جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

ندا فاضلی کا احتجاج ایک فن کار کا احتجاج ہے، دھیما، نرم و دل آویز اور تہہ نشیں۔ ان کے چھٹے مجموعے "زندگی کی طرف" کے ابتدائی صفحات میں جو تعارفی تحریر رقم کی گئی ہے اس میں ندا کی تخلیقی شخصیت کے بعض اہم گوشوں کی طرف اشارے مل جاتے ہیں۔ اس میں لکھا گیا ہے کہ: "وہ مزاج سے باغیانہ، سرشت سے رندانہ اور رواج سے صوفیانہ ہیں۔" شخصیت کے ان متضاد رویوں سے انہیں بہت سے تاریخی و تہذیبی سوالوں کے روبرو کیا ہے۔ انکار و اقرار کی کشمکش ان کی تحریروں کا اسلوب بھی ہے اور یہی انہیں دوسروں سے مختلف بھی کرتا ہے۔

دراصل انحراف ہی وہ بنیادی نقطہ ہے جس سے سرشت اور رویے میں انفرادی نقوش پیدا ہوتے ہیں۔ موجودہ establishment کے خلاف شخصیت میں کئی الگ نقوش ظاہر ہوتے ہیں۔ آزادہ روی، صوفیانہ وضع، روایات سے بیزاری، نئی راہوں کی تلاش اور پھر فن کارانہ سطح پر اظہار کے لئے اسالیب کا استعمال --- یہ سب کے سب انحراف کا عطیہ ہیں اور ندا فاضلی کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔ ان انحراف میں خارجی اور مادی تغیر کے مقابلے میں ناخوشگواری کے اس لہجے کو خاص طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے جو صوفیوں اور دنیا بیزار لوگوں کی پہچان ہے۔ کہتے ہیں:

زمانہ بیت گیا نعرۂ اناالحق کو
کہیں تو کوئی ہو ایسا جو انحراف کرے

انحراف اور انکار میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ انکار ایک منفی رویہ ہے جہاں روایات اور اپنی تہذیبی تاریخ سے بیزاری اور تنفر کے جذبے پیدا ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے انحراف نئے راستوں کی طرف لے جاتا ہے۔ ندا فاضلی نے اپنی سرزمین کے صدیوں پرانے تمدنی

تمول اور روایات کی نئی تفہیم کی ہے، اساطیر کو تخلیقی سطح پر برتنے کی کوشش کی ہے اور احتجاجی ثقافتی ورثے سے شعری تحرک حاصل کیا ہے۔

ندؔا فاضلی اُردو کے ان معدودے چند شعرا میں ہیں جو عوام وخواص دونوں طبقوں میں مقبول ہیں ورنہ صورت حال تو یہ ہے کہ مشاعروں میں مقبول اور عوام سے دادو تحسین حاصل کرنے والے بے شمار شعرا ہیں جو ادبی شناخت سے محروم ہیں۔ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو اس شناخت کی پرواہ بھی نہیں کرتے اور اسٹیج کی واہ واہ سے مطمئن اور نذرانے کی یافت سے مسرور ہو جاتے ہیں۔مشاعروں کو تفریح کا ذریعہ بنا لینے سے بھی زبان کی کچھ نہ کچھ خدمت تو ہو ہی جاتی ہے۔ندؔا فاضلی نے عوام سے رابطے کی مہم میں خواص کو شریک کر کے میر کے تخلیقی رویے پر عمل کیا ہے۔میرؔ کہتے ہیں:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

ندؔا کی غزلوں کے کچھ اشعار تو خاصے مشہور ہو چکے ہیں۔جنہیں سامنے رکھ کر ان کی تخلیقی شخصیت کی تفہیم ہو سکتی ہے۔قارئین اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ندؔا کی غزلیہ شاعری بھی عام عصری مزاج سے خاص مختلف ہے۔ان کے لہجے میں اُردو کی غزلیہ شاعری سے اختلاف کی نوعیت جدید تر اُردو غزل میں ایک نئی شاخ کی طرح منفرد ہے۔الفاظ و محاورات،لفظوں کی ترتیب و ساخت اور عام تراکیب (جہاں غزل میں حسن تضاد کا اہتمام بھی ہوتا ہے) یہ سب ندؔا کے یہاں نہیں ملتے۔ان کے غزلیہ اشعار میں احساسات اظہار کے نئے زاویوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔معنوی تہہ داری کے ساتھ ایک طرح کی خود کلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔بسا اوقات قصباتی لہجہ اور کہیں کہیں Rustic expression کا احساس بھی ہوتا ہے، سادگی میں اس معنوی پیچیدگی کی جھلک مل جاتی ہے جو کبھی کبھی میرؔ کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔میرے خیال میں غزل کے حوالے سے ندؔا کی پہچان ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے متعین ہوتی ہے:

اب نظر آتا نہیں کچھ بھی دو کانوں کے سوا
اب نہ بادل ہے نہ چڑیاں ہیں نہ پروائی ہے

کبھی اکیلے میں خود سے بھی باتیں کر کے دیکھو
ہر محفل میں آنا جانا اچھی بات نہیں
ایک سا رہتا نہیں وقت ہمیشہ سب کا
کل حویلی تھی جہاں آج ہے رستہ سب کا
اتنا چھوٹا تو کبھی شہر نہیں تھا پہلے
تیرے رستے ہی سے گزرا میں جدھر سے گزرا
کسی دیوار سے ٹکرایا نہ در سے گزرا
وقت حیرت سے خدا جانے کدھر سے گزرا
اے شام کے فرشتو ذرا دیکھ کر چلو
بچوں نے ساحلوں پہ گھروندے بنائے ہیں
فاصلہ چاند بنا رہتا ہے ہر پتھر کو
دور کی روشنی نزدیک تو آنے سے رہی
ان کی ناکامیوں کو بھی گنئے
جن کی شہرت ہے کامیابوں میں
یہ کیسی کشمکش ہے زندگی میں
کسی کو ڈھونڈتے ہیں ہم کسی میں
کوئی ملا تو ہاتھ ملایا کہیں گئے تو باتیں کیں
گھر سے باہر جب بھی نکلے دن بھر بوجھ اٹھایا ہے
سب کچھ تو ہے، کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں نگاہیں
کیا بات ہے میں وقت پہ گھر کیوں نہیں جاتا
عشق کی عمر کم ہی ہوتی ہے
باقی جو کچھ ہے دوستانہ ہے۔
ہر ایک بات کو چپ چاپ کیوں سنا جائے

کبھی تو حوصلہ کر کے نہیں کہا جائے

اور ندؔا کے یہ اشعار تو خاصی شہرت حاصل کر چکے ہیں:

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے رات ہو گئی

رستے میں وہ ملا تھا میں بچ کر نکل گیا
اس کی پھٹی قمیص مرے ساتھ ہو گئی

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کبھی زمین ،کبھی آسماں نہیں ملتا

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجئے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

ان اشعار میں ندؔا کی فطرت پسندی، ان کی عزلت گزینی، محرومی و مایوسی، احساس تنہائی، اکتاہٹ، بیزاری، درویشی، زندگی کی بے معنویت اور اپنے اندرون میں اتر کر آواز لگانے کی ایک منفرد فضا ملتی ہے جو لہجے کے اعتبار سے اُردو غزل میں نئی نئی اجنبی سی لگتی ہے۔ ندؔا نے اگر چہ یہ کہا ہے کہ:

اکیلے غم سے نئی شاعری نہیں ہوتی
زبان میرؔ میں غالبؔ کا امتزاج بھی ہو

مگر عملی طور پر ان کی غزلیں اس تجویز کی تائید نہیں کرتیں۔

ندؔا فاضلی کی شاعری موضوعات، اسلوب ڈکشن (آہنگ)، لب ولہجہ اور منظر و ماحول ہر لحاظ سے ہند آریائی ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ ان کے مجموعے ''شہر میرے ساتھ

چل‘‘ کے مرتب نے ان کی تخلیقی انفرادیت کا تعارف کراتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ:

’’ان کی شاعری کی یہ خوبی انہیں ۱۶ویں صدی کے ان سنت کویوں
کے قریب کرتی نظر آتی ہے جن کے کلام کی زمینی قربتوں، روحانی برکتوں
اور تصویری عبارتوں کو شروع ہی سے انہوں نے اپنے کلام کے لسانی اظہار کا
معیار بنایا ہے۔‘‘

ندؔا کا غیر اعرابی بلکہ غیر سامی فکر اور وسیلۂ اظہار اُردو کے اپنی سرزمین سے مربوط ہونے کا جواز پیدا کرتا ہے۔ ان معنوں میں ہم ندؔا کی شاعری کو میؔر اور نظیؔر کے ڈکشن کی روشنی میں زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا توانا شعری اظہار خالص ہندوستانی کلچر میں اپنا بھرپور تاثر پیش کرتا ہے۔ ایک لڑکی اپنی سہیلی سے کہتی ہے:

بیٹھے بیٹھے اوب رہے ہیں / آؤ سہیلی / سرپٹ بھاگیں /
سر کے بالی تلک کھل جائیں / ادھم دھم / یوں دہلیزیں لانگیں /
گھٹنوں گھٹنوں تال میں چل کر / پتہ پتہ تک / گاگر بھرلائیں /
اور نشانے تاک تاک کر / پتھر سے پتھر ٹکرائیں / برگد کی ننگی شاخوں پر /
بن جھولے کے / ایسا جھولیں / ۔لوکٹ چٹلے میں پھنس جائے /
انگوٹھے پیشانی چھولیں / ہنسی ہنسی میں اک دوجے پر بدلی بن کر یوں ٹوٹیں /
آئے جیسا کس کر گوندھیں / جگہ جگہ سے ٹوٹیں پھوٹیں /

(نظم ’دو سہیلیاں)

ندؔا کے سارے موضوعات فطری زندگی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اپنی جانی پہچانی ہوئی فضا میں تجسس کی کہیں شوخ اور کہیں سنجیدہ تہیں قاری کو منظرنامے سے تادیر متاثر کرتی ہیں اور اس طرح بیانات سے سیر چشم کر کے اپنے اندرون میں اترنے کا راستہ کھول دیتی ہیں۔ یہ منظر بھی دیکھئے:

بادل میرے گاؤں بھی آؤ / گمبڑی ٹانگو / پیپل نیچے / اونٹ بٹھاؤ / مسجد پیچھے /
سوکھ رہے ہیں تال تلاؤ / پھر ان کو بھر جاؤ / بادل میرے گاؤں بھی آؤ /

چو پالوں میں کتھا سناؤ/ پنجرے کی مینا سے بولو/ بنیا ڈنڈی مار رہا ہے/
دال نمک/ اچھے سے تولو/ کھول کے اپنی مہنگی گٹھری/ ہستی ہاٹ لگاؤ/
بادل میرے گاؤں بھی آؤ/ نیم کی میٹھی مردنبولی/ سلگاؤ ٹھنڈے چولہوں کو/
میدانوں سے دھوپ اٹھا کر/ پینگیں بھرنے دو جھولوں کو/ چپ چپ ہیں/
بیچوں میں انکڑا/ آلہا اودل گاؤ/ بادل میرے..... / پگڈنڈی پر گھاس بچھاؤ/
دودھ چڑھاؤ گائے کے تھن میں/ پہاڑ کے مکھیا کے کھانے کو/ چین لکھو گھر کے آنگن میں پیاسی
ہے اندیا بے چاری/ شیتل جل برساؤ/ بادل میرے گاؤں بھی آؤ/

(گیت)

ندا فاضلی کی نظم 'ناراض آدمی' ان کی تخلیقی شخصیت کی شناخت میں جس طرح معاون ہوتی ہے اسی طرح دور حاضر کے ہر حساس انسان کی بے بسی، محرومی، احساس نایافت، انتشار اور جستجو کا خوبصورت استعارہ بھی ہے۔ حوصلے کی مسلسل شکست اور ہدف کی نارسائی انسان کو مادی انقلاب کی محدود ارضیت سے نکال کر تصوف کی مبہم اور غیر شفاف وسعتوں کی طرف لے جاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے تا آنکہ انسان لاحاصلی کو اپنا مقدر مان لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ نظم یوں ہے:

اس نے/ سمندر کو اپنی بانہوں میں سمیٹنا چاہا/ سمندر/ اس کی بانہوں میں نہیں سما پایا/
اس نے ناراض ہو کر/ سمندر سے منہ موڑ لیا اس نے/ آسمان کو چھونا چاہا/
آسمان/ اپنی اونچائی سے نیچے نہیں آیا/ اس نے ناراض ہو کر/ آسمان سے رشتہ توڑ لیا/
اس نے دنیا کو جیتنا چاہا/ دنیا نے/ اسے تاج نہیں پہنایا/ اس نے ناراض ہو کر/
دنیا کا ساتھ چھوڑ دیا پھر وہ/ سمندر آسمان اور دنیا میں/ کسی کا نہیں تھا/
لیکن اسے یہ جان کر دکھ ہوا/ کہ اس کے بغیر بھی/
سمندر یوں ہی مچلتا رہا/ آسمان یوں ہی رنگ بدلتا رہا/ دنیا کا کاروبار یونہی چلتا رہا/

(نظم 'ناراض آدمی)

مختصر نظمیں ندا فاضلی کے تخلیقی اظہار کا بہتر اور زیادہ موثر وسیلہ ہیں۔ جدید اُردو نظم نگاری کے متنوع اظہارات اور دانش و آگہی کے فروغ میں اس صنف سخن کے اثرات کا سنجیدگی

کے ساتھ کوئی جائزہ ہنوز نہیں لیا گیا ہے۔ چند رواروی کے مقالات اور بعض رسمی سمیناروں سے یہ حق ادا نہیں ہوتا۔ بعض قابل توجہ مطالعات عصری اعتبار سے دور ہو چکے ہیں جن سے نظم کے ارتقائی تسلسل اور تغیرات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ آج اُردو نظم نگاری سے موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر جو تنوعات حاصل کئے ہیں اور اُردو کے نئے شعری بوطیقا کی تشکیل میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے اس کا تفصیلی مطالعہ ہونا ابھی باقی ہے۔ یہ جہت بھی اہم نتائج پیدا کر سکتی ہے کہ دور حاضر میں مختصر نظم نگاری کے میدان میں متعدد شعرا کے یہاں فکر و نظر کی یکسانیت کے ساتھ موضوعات کو برتنے کے سلسلے میں الگ الگ برتاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ ندا فاضلی کی متعدد منظومات کے عنوانات دوسرے شعرا کے یہاں بھی مل جاتے ہیں۔ 'ایک کہانی'، 'شام'، 'ایک نظم'، 'مشورہ'، 'اظہار'، 'بے خواب نیند'، 'ایک صبح'، 'پہچان'، 'آخری سہارا'، 'فریب'، 'خودکشی'، 'انتقام'، 'حادثہ'، 'آخری سچ'، اور دوسرے بہت سے عنوانات دیگر نظم نگاروں کے یہاں بھی موجود ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ خود میری کئی نظموں کے عنوانات وہی ہیں جو ندا فاضلی کے ہیں۔ موضوع کی مماثلت اور عنوان کے تکرار کی روشنی میں منفرد تخلیقی رویوں کی دو مثالیں پیش کر رہا ہوں:

تم نے / شاید کسی رسالے میں / کوئی افسانہ پڑھ لیا ہوگا /
کھو گئی ہوگی روپ کی رانی / عشق نے زہر کھا لیا ہوگا /
تم اکیلی کھڑی ہوئی ہوگی / سر سے آنچل ڈھلک رہا ہوگا /
پڑوسن کے پھول سے رخ پر / کوئی دھبا چمک رہا ہوگا /
کام میں ہوں گے سارے گھر والے / ریڈیو گنگنا رہا ہوگا /
تم پہ نشہ سا چھا گیا ہوگا / مجھ کو وشواس ہے کہ اب تم بھی /
شام کو کھڑکی کھول دینے پر / اپنی لڑکی کو ٹوکتی ہوگی / گیت گانے سے روکتی ہوگی /

نظم: ایک کہانی (ندا فاضلی)

بہت دنوں قبل / جب زمیں نے / سلگتے سورج سے چھوٹتے وقت / یہ کہا تھا /
کہ میں تیری آگ کی حفاظت میں / زندگی کا ہر ایک لمحہ گزار دوں گی /

مری رگ و پے سے تند شعلے / نکل کے ہر سمت پھیل جائیں گے /
اور خلائے محیط کے / سارے ذرے / اس آتش مقدس میں ناچ اٹھیں گے /
اگرچہ سورج یہ بات سن کر / بڑی اداسی کے ساتھ خاموش ہو گیا تھا /
مگر وہ یہ بات جانتا تھا / کہ اس سے چھٹ کر / زمین اس آگ کی ضمانت کو گم کرے گی /
اداس یخ بستہ، منجمد ہو کے مبتلائے الم رہے گی

نظم: ایک کہانی (راقم الحروف)

اسی طرح دو اور ہم عنوان نظموں کی بدلتی شکلیں ملاحظہ کیجیے:

شام ہونے کو ہے / پہلی دھوپ / چھجے سے اتر کر /
اون کے گولے سی بستر پر پڑی ہے / رنگ میں ڈوبی دشائیں /
پتیوں میں سرسرانی اپسرائیں / تم نہیں ہو / چاہتا ہوں اس گھڑی
جو ذہن میں ہے نظم کر دوں / لفظ سارے لفظ / کتنے اجنبی / کتنے انجانے /
کانچ کی پیالی کو چکنا چور کر دوں / سب کتابوں پر نئے کاغذ چڑھا دوں /
نیم کی ڈالی سے چڑیاں کو اڑا دوں / دوڑتے بچے کو گودی میں اٹھا کر /
راستے سے اک نئی گڑیا دلا دوں / ریشمی تکووں کو منہ سے گدگدا دوں
لفظ سارے لفظ / کتنے اجنبی / کتنے اجالے

نظم: اظہار (ندا فاضلی)

تو مرے حرف و نوا کا ایک چھوٹا آئینہ / تو رفیق فن تو ہے لیکن ہے یار کج ادا
قطرہ قطرہ طاق فن سے جو تجلی کی شراب / میرے شیشے میں اترتی ہے تو ہو جاتی ہے کیا
جو میرے ذہن تو حش آشنا کی زد میں تھا / صحن میں تیرے وہ اترا تھا شکار نیم جاں
لفظ و معنی کے دھندلکے میں کہیں گم ہو گیا / طائر احساس نے جانے کہاں توڑا ہے دم
اے مرے اظہار تو مجھ سے خفا ہوتا ہے کیوں / آئینہ ہاتھوں کا بھی منظر بدل دیتا ہے کیوں؟

نظم: اظہار (راقم الحروف)

خوف طوالت سے بچتے ہوئے صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم عصر اُردو نظم

نگاری کے جائزے میں یہ طریق کار کئی دلچسپیوں اور اہم نتائج سامنے لاسکتا ہے۔

ندا فاضلی کے یہاں اُردو کی شعری جمالیات کے متوازی ایک نئے آہنگ کی ترتیب ہمیں چونکاتی بھی ہے اور امکانات کا مژدہ بھی سناتی ہے۔ اسے سماعت اور تحسین کا ایک ایسا حلقہ چاہیے جو pre-concieved شعریات سے نکل کر ایک آزاد اور کھلی ہوئی فضا کا طلب گار ہو۔ نئی راہوں کی طرف پیش قدمی کرنے والوں کے ساتھ دشواری یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کا سفر اسی وقت معنویت کا حامل ہوتا ہے جب اس کی آواز پر لبیک کہنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہو۔ عوامی شہرت و مقبولیت کے تحفظ اور نئے لہجے میں منفرد معیار کے فروغ کی دہری ذمہ داری نبھانے کا مجاہدہ ندا فاضلی کی عصری اہمیت ثابت کرتا ہے۔

(انتخاب۔ ۳۰ صفحہ ۷۸ سن اشاعت ۲۰۱۴ء)

پروین شیر

ایک ایسے وقت میں جب اُردو دنیا پروین شیر کے شعری مجموعوں ''کرچیاں'' اور ''جہاں دل پر سحاب جیسے'' کے منفرد لہجے اور غیر معمولی اور تادیر رہنے والے تاثر سے سرشار ہو رہی ہے ان کی گرانقدر پیش کش ''چند سیپیاں سمندروں سے'' نے قارئین کو حیرت واستعجاب میں ڈال دیا ہے۔ کہنے کو تو موخر الذکر کتاب ان کے دو سفر ناموں ''سیاہ روشنی'' اور طلسمی جہاں'' کا مجموعہ ہے لیکن ان سفر ناموں کی حیرت انگیز اور اثر انگیز تخلیقیت نے انہیں سفر نامے کے حدود سے آگے اور بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ ان میں منزل بہ منزل خارجی مشاہدے نے فنکارانہ درون بینی کی خصوصیت سمیٹ لی ہے۔ اظہار و بیان نے جگہ جگہ شعریت پیدا کر دی ہے اور سب سے بڑی بات جو ''چند سیپیاں سمندروں سے'' عام سفر ناموں سے مختلف اور ممتاز بناتی ہے یہ ہے کہ یہاں مصنفہ قاری کو جہاں بینی کے اکہرے سے لطف سے بہرہ ور نہیں کرتیں بلکہ اسے بیرون کے ماورائی اور روحانی سفر پر آمادہ کر دیتی ہیں۔ نرا مشاہدہ ایک یک سطحی عمل ہوتا ہے جہاں مظاہر کی لپک جھپک انسان کی شخصیت کو محصور کر لیتی ہے۔ غالبؔ نے کہا ہے:

بخشے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالبؔ
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہونا

عام طور پر سفر نامے ہمیں ذوق تماشا کی لذت اور بسا اوقات اس کی بے باکی میں مبتلا رکھتے ہیں۔ اس کے بر خلاف پروین شیر کی کتاب ''چند سیپیاں سمندروں سے'' کا

اختصاص یہ ہے کہ یہاں مناظر اور وقوعے پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور قاری پر ایسے تاثرات حاوی ہو جاتے ہیں جہاں سماجی سروکار، اخلاقی نظام، انسانی اقدار، تہذیبی عوامل اور فلسفیانہ اور دانشورانہ آثار وخطوط روشن ہوتے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب بیک وقت کئی اصناف اور فیکلٹیز کا حق ادا کرتی ہے۔

اس کے بیانات اور ان سے پیدا ہونے والا فلسفیانہ تعمق ایک ناول کا شائبہ دیتا ہے۔ لہجے اور اسلوب کی جاذبیت شعری سرور بخشتی ہے، مصنفہ کی نجی شخصیت کا Involvement داخلی سچائی کا عرفان عطا کرتا ہے، انسان کے بد ساختہ سماجی نظام میں نسلی عصبیت، استحصال، تفریق بین البشر کے عیارانہ ماحول میں معصوم بچوں، نادار خاندانوں اور بے بس عورتوں کے سلسلے میں موانست کے جذبے کا فقدان ---- اس طرح کی کیفیات سے لبریز مناظر اس کتاب کو معاشرے، تہذیب، سیاست، سماجیات اور اخلاقیات کے ہشت پہل معاملات کے ارتقاء کے کھوکھلے پن پر مبنی ''چند سیپیاں سمندروں سے'' ایک ایسی دستاویز ہے جس میں حیات اجتماعی کے گوناگوں پہلو روشن نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ایسا تخلیقی کارنامہ ہے جو فکر ونظر کو بھی انگیز کرتا ہے اور جذب وکیف کے مسرت آگیں حزن سے بھی ہمکنار کرتا ہے۔

اس کتاب کی تخلیقی حیثیت کا عرفان حاصل کرنے کے لئے خود مصنفہ کے ذہنی رویے اور ان کی فنکارانہ انفرادیت کا مطالعہ ضروری ہے۔ پروین شیر کی تخلیقی ذہنی ساخت فنون لطیفہ کی روایتی تقسیم کی نفی کرتی ہے۔ 'سرود نغمہ'، 'خطوط ونقوش'، 'ایوان والحان' اور الفاظ و معانی' سب یکجا ہو کر پروین کے فن پارے کی تشکیل کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر فن لطیف اثر وکیف کی الگ صورتیں پیدا کرتا ہے۔ دراصل فنون لطیفہ کا اصل وظیفہ یہ ہے کہ یہ ہمارے حواس خمسہ کے وسیلے سے ہماری روح کو متاثر اور منزہ کریں۔ قوت شامہ سانسوں کے ذریعہ، قوت سامعہ آوازوں، قوت لامسہ لمس، قوت باصرہ عینی تسکین واحتراز اور قوت ذائقہ کام و دہن کے وسیلے سے ہمیں حقیقت تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن چونکہ ان سبھوں کا دائرہ کار الگ الگ ہے اس لئے مکمل عرفان صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ان وسائل کا اتحاد واتفاق ہو بظاہر اس اشتراک امتزاج کی صورت پیدا نہیں ہوتی لیکن انسان ازل سے تجسس کا

شکار ہے اور حقیقت کے اسرار کو تمام وسیلوں کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔کوئی ایک قوت مکمل طور پر مطمئن نہیں کرسکتی۔حضرت موسیٰ کو سرکوہ طور اس آواز پر یقین وایمان تو تھا کہ ''میں تیرا رب ہوں'' مگر اس کے باوجود عین الحق کی تڑپ اصرار کررہی تھی کہ ''میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں'' --- پھر جو ہوا سو ہوا لیکن اس سے یہ نتیجہ تو ضرور نکلتا ہے کہ انسان فطری طور پر حواس کے جملہ وسائل کی تسکین وتکمیل کا متمنی ہے۔فنون لطیفہ اگر امتزاج ،اختلاط اور باہمی انضمام کے منتہیٰ تک پہنچ جائیں تو یہ بہت حد تک حقیقت کل تک پہنچا سکتے ہیں۔کوئی فن لطیف تنہا رہ کر یہ قوت حاصل نہیں کرسکتا۔آرٹ کی نصرت یہ ہے کہ یہ ہمیں حقیقت عظمیٰ سے قریب تر کر دے۔فن کار کا ہدف تو یہی ہوتا ہے مگر نارسائی اس کا مقدر ہوتی ہے۔میں نے خود بھی یہ کرب محسوس کیا ہے۔اپنی نظم ''جستجو'' میں میں نے سچ کے Wholeness تک پہنچنے کے لئے عرفانی وسائل کے امتزاج کی غایت کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

چھو کے دیکھیں / آہٹوں کو سونگھ لیں / روشنی کو پی کے
تصویروں سے محو گفتگو ہوں دیر تک / سانس چکھ لیں
عکس مٹھی میں چھپا لیں / رنگ کی آواز سن کر
ہر حقیقت کی نئی تعبیر سے رشتہ کریں / سارا منظر بدلا بدلا ہو
نیا پن / جسم وجاں میں سنسنی پیدا کرے
ٹیڑھے میڑھے / راستوں پر چل کر دیکھیں
یوں نہیں ملتا --- تو شاید اس طرح / زندگی کا راز / کوئی پاسکیں

(نظم 'جستجو')

میں معذرت خواہ ہوں کہ فن کارانہ التہاب اور سچ کی تڑپ کے لئے مجھے خود اپنے شعری اظہار کے اقتباس سے کام لینا پڑ رہا ہے۔ممکن ہے اس طرح میرے نثری بیان پر زیادہ stress پڑ سکے۔پروین شیر کی دسترس چونکہ فنون لطیفہ کی کئی شاخوں تک پہنچتی ہے اس لئے وہ ان کے ارتباط سے سچائی کے بہت سے پہلوؤں کو سمیٹنے پر قادر ہیں۔تفصیلی مطالعے کے لئے تو ایک دفتر درکار ہے۔ابھی ان کی ایک نظم سن لیجئے:

چلو جینے کا اب یہ راستہ چن لیں
اماوس کے اندھیروں کو کہیں یہ ماہ کامل ہے
ببولوں سے بھری راہوں کو کہہ دیں
پھول بکھرے ہیں
سلگتے ریگ زاروں کو خنک رستے
کراہوں کو ہنسی، گرداب کو ساحل پکاریں
اور ہوائے تازہ تر سمجھیں گھٹن کو
زمانے کے کچوکوں نے ہمیں جو زخم بخشے ہیں
انہیں ریشم کے کپڑوں سے ڈھکیں--اور مسکرائیں
کہ اب تو ماسوا اس کے
کوئی چارہ نہیں باقی
ادھورے پن کو ہم تکمیل کہہ کر زندگی جی لیں!
چلو جینے کا اب یہ راستہ چن لیں!!

(نظم حل،)

اس نوع کی متعدد نظمیں ہیں جن سے پروین شیر کی ماورائی دسترس (Trascendental access) کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروین شیر کی کارنامے ''چند سیپیاں سمندروں سے'' کو میں کسی ایک صنف تحریر میں مقید نہیں کرنا چاہتا۔ یہ ایک ایسا سیاحت نامہ ہے کہ اس میں بیک وقت جنوبی افریقہ اور پیرو (ساؤتھ امریکہ) کی جغرافیائی صورت حال ' موسم' شہر اور گاؤں کی تہذیب و معاشرت کے ساتھ ساتھ دنیا کی بڑی اور ترقی یافتہ طاقتوں کی اس سازش کا پردہ بھی فاش کیا گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں انہیں جدید ترقیوں سے محروم ہونا پڑا ہے۔ یہ استحصال اور بربریت کی ایک داستان بھی ہے کہ ان علاقوں کو غلامی کی کھیتی کے طور پر تیز رفتار تہذیبی ارتقا کے دھارے سے الگ تھلگ کر دیا گیا۔ ہے۔ یہ ایک ناول بھی ہے کہ وقوعوں کا تسلسل قاری کے لئے دردانگیزی کا

جذبہ پیدا کرتے ہوئے اب حیات انسانی کے سلسلے میں فلسفیانہ نتائج تک پہنچاتا ہے۔ یہ ایک شعری کارنامہ بھی ہے کہ یہاں داخلی کرب اور بے پناہیت کے جذبات پڑھنے والوں میں درد کی لہریں پیدا کرتے ہیں، یہ ایک نگار خانۂ احساس بھی ہے کہ یہاں جذبوں کو مصور کر کے سچائیوں کو عینی شہادت بخشی گئی ہے۔ یہ تاریخ کی ایک اہم دستاویز بھی ہے سماجیات کا ایک گہرا مطالعہ بھی -----اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ذریعہ ہمیں سیاہ وسفید اور خیر وشر کے درمیان انسانی واخلاقی اقدار کی تفہیم کی آگہی نصیب ہوتی ہے۔ بڑا فن پارہ، ہیئت واسلوب کا دریوزہ گر نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بڑے تخلیقی کارناموں سے اصناف واسالیب کی مروجہ تعریفوں (defination) میں ردوبدل ہوتی ہے۔ اعلیٰ ادبی کارنامہ اپنی بوطیقا خود پیدا کرتا ہے۔ ''چند سیپیاں سمندروں سے'' پروین شیر کے فوزِ عظیم کا ایک نمونہ ہے۔ اس تخلیق پر مصنفہ کے ساتھ اُردو زبان وادب کو بھی ناز کرنا چاہئے۔

(انتخاب۔۳۰ صفحہ ۸۶ سن اشاعت ۲۰۱۴ء)

☆☆

اعجاز صدیقی

مجھے معلوم نہیں کہ جناب اعجاز صدیقی کے تازہ مجموعہ کلام 'درون سخن' کا نام کس نے رکھا ہے۔ اس کے پہلے ان کا مجموعہ 'کرب خود کلامی' شائع ہو چکا ہے۔ ممکن ہے کہ 'کرب خود کلامی' کا نام خود جناب اعجاز صدیقی نے رکھا ہو اور دوسرے مجموعے 'درون سخن' کا نام تاجدار یا افتخار امام صدیقی نے طے کیا ہو۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں ناموں سے نہ صرف غزلیہ شاعری کے منصب کا تعارف ہوتا ہے بلکہ ان سے خود جناب اعجاز صدیقی کے رنگ سخن کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اُردو شاعری کی عام روایت میں پروردہ اعجاز صدیقی کا ذہن خود کلامی اور سخن کے اندرون پر اس دور میں اصرار کرتا ہے جب فنی ارتکاز اور اپنی ذات میں اتر کر داخلی سچائیوں کی تلاش کا کوئی عمومی ماحول نہیں تھا۔ دنیا داروں نے بالعموم میر کو Reject کر کے غزل کو ہنگامۂ روز و شب اور جذباتی ہاو ہو میں محدود کر دیا تھا۔ 'کرب خود کلامی' اور 'درون سخن' جیسے ناموں کا انتخاب خود اعجاز صدیقی نے کیا تھا تو اس نتیجے پر پہنچنا چاہئے کہ ان کی خود انتقادی نے انہیں عرفان ذات کی منزل تک پہنچا دیا تھا اور اگر یہ نام ان کے صاحب زادگان نے رکھے ہیں تو ان کی انتقادی ہنر مندی کو سلام کرنا چاہئے ----- کہ انہوں نے اعجاز صدیقی کی غزل گوئی کے امتیاز و اختصاص کو اپنی گرفت میں کر لیا ہے۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اعجاز صدیقی کی دوررس نگاہیں ظواہر کی ان پرتوں کی متلاشی ہوتی ہیں جو اصل تماشا ہوتی ہیں اور جہاں تک عام لوگ اپنی کم بصری کی وجہ سے پہنچ نہیں پاتے۔ غالب نے ایک جگہ کہا ہے:

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالبؔ
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہوجانا

اس میں کوئی شک نہیں کہ جلوۂ گل، ذوق تماشا پر اصرار کرتا ہے اسی لئے مناظر کے ہر رنگ سے محظوظ ہونے کے لئے آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں کہ ہر منظر نئی حقیقتوں کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ محو تماشا ہونے کی ایک کیفیت ہے اور دوسری کیفیت وہ ہے جسے میرؔ نے

بند رکھنا چشم کا ہستی میں عین دید ہے
کچھ نظر آتا نہیں جب آنکھ کھولے ہے حباب

کہہ کر ظاہر کیا ہے۔ میرؔ ماورائے مناظر دیکھنے کے متمنی ہیں۔ تماشے کے ذریعے اندرون تماشا کی کرید اور جستجو ایک عارفانہ مجاہدہ ہے۔ اسی کسک اور بے چینی سے مجبور ہو کر اقبالؔ کو یہ کہنا پڑا کہ:

میں نو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولیٰ
کہ دل سے بڑھ کے ہیں میری نگاہ بے قابو

اقبالؔ یہ بتاتے ہیں کہ نگاہ کا تجسس نو نیاز ہونے کی دلیل ہے، عشق کے اعلیٰ ترین جذبے کا ہدف پس پردہ ہوتا ہے۔ بات کچھ آگے چلی جارہی ہے، دراصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اعجازؔ صدیقی بھی ان حقائق کے جویا ہیں جو پس پردہ ہیں، کہتے ہیں:

ملا ہے جب کبھی اذنِ تماشا
نظر کی وسعتوں میں کھو گیا ہوں

وہ اذنِ تماشا کے باوجود ان وسعتوں میں پہنچنا چاہتے ہیں جو بسا اوقات گرفت سے باہر ہوتی ہے اور صورت حال کچھ یوں ہو جاتی ہے کہ "دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے"۔ غزلیہ شاعری میں فکر کا یہ تیور بلاشبہ اعجازؔ صدیقی کو اپنے عہد سے الگ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ایسا نہیں کہ اعجازؔ صدیقی نے غزل کے عام مروجہ موضوعات و محسوسات سے یکسر کنارہ کشی کر لی تھی اور ان کا پورا اثاثہ 'سخن روایت سے رخصت کا نمونہ ہے۔ سچائی یہ ہے کہ روایت ان کی بنیاد ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں اس کا پورا پورا احترام کیا ہے لیکن اس سے

ان کی اختصاص کے اس پہلو کو منہا نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے روایت کے حدود اربعہ میں توسیع کی ہے اور سنجیدہ، متین اور موثر جدت، روایت کی اسی توسیع کا نام ہے۔ روایتی غزل کے بیشتر فن کار اس امر کی کوشش تو کرتے ہیں کہ اپنے حدود میں رہ کر وہ تازہ اور جدید نقوش پیدا کرلیں لیکن فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ جدید اور جدید تر کی تلاش میں سرگرداں عہد حاضر کے متعدد غزل گو شعرا روایت سے مکمل انحراف کی وجہ سے کھردرے اور بے کیف اشعار کہہ رہے ہیں۔ کامیاب جدت، روایت کے جلو میں سامنے آتی ہے۔ اعجاز صدیقی کی غزل گوئی کا ایک حصہ تو بلاشبہ روایت کی اس شق سے تعلق رکھتا ہے جہاں پرانے موضوعات کے عمومی تکرار کا احساس ہوتا ہے اور اس طرح کے اشعار سامنے آتے ہیں:

بڑے عجیب ہیں دل کے معاملات اعجاز
اسی کو بھولنا چاہیں اسی کی بات کریں
حرم اور دیر سے آگے بھی سوچا ہے کبھی تم نے
جبینوں کی رسائی کیوں یہیں تک سنگ در والو

لیکن ظاہر ہے کہ فن کار کی کامیابی اور عظمت وانفرادیت تو ان اشعار سے طے پاتی ہے جو عمومی رنگ سے ہٹ کر معنی وتاثر کی کئی شعاعیں پیدا کرنے لگتے ہیں۔ اعجاز صدیقی کی ماضی اور روایت سے قربت بسا اوقات ایک خوش اطوار جدت میں بدلنے لگتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار پر روایت کی شاخ سے پھوٹنے والے نئے اور تازہ گلوں کا شائبہ ہوتا ہے:

ملنے کے لئے خود سے غنیمت اسے جانو
اک لمحہ بھی مل جائے اگر بے خبری کا
نقش پائے دگراں نقش سفر کیا معنی
سب چلیں جس پہ وہی راہ گزر کیا معنی
ٹوکتا رہتا ہے اکثر مری باتوں پہ مجھے
دوسرا شخص کوئی مجھ میں چھپا لگتا ہے
کل بھی یہ بری کیا تھی، آج بھی بری کیا ہے

اس کا نام دنیا ہے، یہ بدلتی رہتی ہے

اعجاز صدیقی کے یہاں ان اشعار میں روایت سے ایک باوقار اور بامعنی رخصت کا احساس ہوتا ہے۔ان کا غیر صناعانہ اور سادہ اظہار موضوع واحساس کی تازہ جہتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔یہاں اپنی ذات میں مرتکز ہونے کی ایک ادا ہے۔بیروں کے سروکار کا اعتراف کرتے ہوئے خود کو خروش دنیا سے بچائے رکھنے کی ایک صوفیانہ سعی ہے۔اعجاز صدیقی کے مجموعے 'درون سخن' میں اس رنگ اور لہجے کے متعدد اشعار ملیں گے۔غزل کے 'ناغزل' بنتے ہوئے تخلیقی معیار و ماحول میں اعجاز صدیقی کی شاعری موجودہ نسل کو غیر فن کارانہ تجربات کے حملوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ (انتخاب۔۳۰ صفحہ ۹۰ سن اشاعت ۲۰۱۱ء)

☆☆

خالدہ خاتون

عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ خواتین اہل قلم تحقیق وتنقید کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوتیں۔انہیں تخلیق سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔افسانہ نگاری، ناول یا پھر شاعری کی اصناف سے ان کی اولین دلچسپی کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا رہا ہے کہ طبقہ نسواں بالعموم تخیل،تصور اور جذبات وکیفیات سے فطری طور پر سرشار ہوتا ہے، ان سے انسانی اقدار، روحانی تقدیس اور لطیف محسوسات کی جو تہذیبی فضا متشکل ہوتی ہے وہ اس طبقے کی سرشت کے عین مطابق ہے۔اس بات کو بہت حد تک تسلیم کر لینے کے باوجود اسے ایک مسلمہ حقیقت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

علم ودانش کے فروغ اور فکر ونظر کی وسعت نے عہد بعہد شعروادب کی حدود میں خوب وزشت کے لئے جو میزان ومعیار بنائے ہیں اس نے طبقہ نسواں کو بھی اقدار فن کی آگہی بخشی ہے چنانچہ خواتین کی انتقادی ادب سے دلچسپی کی جو مضبوط روایت ممتاز شیریں نے قائم کی وہ رفتہ رفتہ برومند ہوتی ہوئی عہد حاضر میں داخل ہوتی ہے اور آج کا منظر نامہ یہ ہے کہ خواتین اہل قلم مردوں کے شانہ بہ شانہ چل رہی ہیں۔اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں جامعیات سے وابستہ خواتین نصابی اور درسی ضرورت کے تحت بھی کامیاب تحقیقی وتنقیدی مقالات لکھ کر اسناد حاصل کر رہی ہیں۔گویا تیزی کے ساتھ رجحان بدل رہا ہے اور ایں وآں کا فرق ختم ہوتا جا رہا ہے۔

تنقید وتحقیق کی کدوکاوش اور تخلیقی سرمایے کی جانچ پڑتال کے باب میں بہار کی خواتین قلم کاروں کی پیش رفت بھی قابل توجہ ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ کم از کم ریاستی

سطح پر تحقیق وتنقید سے وابستہ خواتین کے کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور ان کی تحریروں سے ان کے روبہ کمال انتقادی انہماک کی درجہ بندی کی جائے۔

پیش نظر مسودے 'ذکر رفتگاں' کی مولفہ ڈاکٹر خالدہ خاتون اپنی ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے کم سے کم بہار میں محتاج تعارف نہیں رہیں۔ تخلیق وتنقید سے ان کی والہانہ وابستگی کی نوعیت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی اس بات پر اکتفا نہیں کیا ہے کہ انہیں محض قلم کاروں کی فہرست میں شمار کرلیا جائے بلکہ ایک بلند نگاہ اور صاحب فکر ونظر جائزہ کار کی طرح اصیل تخلیقی وتنقیدی نگارشات کی درجہ بندی کی کوشش کرتی ہیں۔

انہیں جاننا چاہئے (اور بہت حد تک وہ سمجھتی ہیں) کہ تنقید محض اطلاعات کی فراہمی تک محدود نہیں رہتی بلکہ انتقادی تحریر کا معیار اس وقت قائم ہوتا ہے جب ادبی متن کو ماقبل اور ہم عصر معیار پر پرکھا جائے اور زیر بحث فن کار یا اس کی تحریروں کی معنویت کی کھوج لگائی جائے۔

ڈاکٹر خالدہ خاتون کی کتاب 'ذکر رفتگاں' عام تنقیدی جائزے کے مقابلے میں ذرا مختلف نوعیت کی حامل ہے یعنی یہ کہ اس میں ان ارباب ادب کی خدمات کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ یہاں بے باک انتقادی فیصلوں کی گنجائش نہیں رہتی بلکہ مرحومین کے سلسلے میں جو ایک نرم رویہ اور ہمدردانہ تاثر ہونا چاہئے وہ بہر حال خالدہ خاتون کی ان تحریروں سے ہویدا ہے۔ ان مضامین میں اطلاعات کی فراہمی کے ساتھ مرحومین کی ادبی خدمات کو تحسین آمیز جذبے سے سامنے لایا گیا ہے۔ عقیدت، محبت اور ایک خوشگوار تاثر کے ساتھ ''ذکر رفتگاں'' کی ادبی خدمات کے اعتراف نے ڈاکٹر خالدہ خاتون کی اس کتاب کو جو منفرد رنگ عطا کیا ہے وہ قارئین ادب کے لئے وجہ کشش ہو سکتی ہے۔

(انتخاب۔ ۳۰ صفحہ ۹۴ سن اشاعت ۲۰۱۴ء)

پرویز شاہدی

شاعری کی معنویت عہد بعہد بدلتی رہتی ہے۔ زندہ شاعری کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ کئی ادوار عبور کرنے کے بعد بھی اپنی اہمیت و معنویت کا احساس دلاتی رہے۔ یہ کلیہ ان معنوں میں درست ہے کہ شاعری کے بنیادی محرکات خارجی حالات کے زائیدہ ہوتے ہیں۔ فن کار اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتا ہے یا عالمی سطح پر اس کے عہد میں جو واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں وہ کہیں نہ کہیں سے اس کے تخلیقی جذبے کو انگیخت کرتے رہتے ہیں۔ یہی واقعات اور ان کے اثرات اس کی شاعری کے موضوعات بن جاتے ہیں۔ یوں فن کار ماضی کے وقوعوں اور بالخصوص اپنے دور کے حالات میں اسیر ہوتا ہے۔ اس کی نظر اور اس کے تخیل اس مرکزی نقطے سے یکسر ہٹ نہیں جا سکتی لیکن اس پابندی کے باوجود کامیاب فن کار الفاظ ولغات، تاثرات کے اخذ وقبول، لہجے کی انفرادیت اور وقوعوں کے انبار میں ترک وانتخاب اور اپنی مخصوص تخیلی قوت کی وجہ سے خارجی واقعات کے نئے معنوی گوشے پیدا کرنے اور ان کے اظہار وبیان پر قادر ہوتا ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ فنکار بنیادی طور پر ہم عصر واقعات سے منسلک رہ کر بھی شعری تخلیق کے لئے فکر واحساس کے نئے برگ وبار پیدا کرتا ہے اور جو فنکار امکانات کی جتنی جہتیں نکال سکتا ہے وہ اسی قدر اہم سمجھا جاتا ہے۔

تفہیم کی سطح پر ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ ہر دور کے اپنے ثقافتی، تہذیبی، سیاسی وسماجی اور لسانی احوال متن کے معانی کے تغیر اور ان کی تجدید پر اصرار کرتے ہیں۔ اچھی شاعری عہدوں اور ادوار میں بسیط ہوتی ہے۔ یہ اپنے content کو نئے عہد کی تطبیق کے ساتھ سمجھنے کی

دعوت دیتی ہے۔

آج سے کم وبیش پندرہ برسوں پہلے میں نے پرویز شاہدی کے تخلیقی سرمایے کی روشنی میں ان کا جو معنوی احاطہ طے کیا تھا آج اس میں تبدیلیاں پیدا ہو چکی ہیں۔میں نے اپنے مرتب کردہ مونوگراف (مطبوعہ ساہتیہ اکادمی ۲۰۰۰ء) میں ان کی انقلابی اور احتجاجی منظومات 'تلوار'، 'بنت ہمالیہ'، 'ہم نوجوان ہیں'، 'والگا کو سلام'، 'آگ کی لکیر'، اور 'خوابوں کی سیڑھیاں' کے مطالعے سے جو تعبیرات پیش کی ہیں ان کی معنویت آج کے تناظر میں بدل چکی ہیں۔پرویز شاہدی بنیادی طور پر رجائی ذہن کے حامل ہیں اسی لئے ان کے افکار بدلے ہوئے حالات میں مطابقت کا تقاضا کرتے ہیں۔ملک اور بیرون ملک میں نئے سیاسی حالات اور بدلتی ہوئی عوامی آئیڈ ولوجی وطن دوستی کے نئے عملی منصوبے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔پرویز شاہدی اپنی نظموں کے ذریعہ نئے حالات میں نئی حکمت عمل پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ انسانی ارتقاء کے قائل ہیں، تبدیلیوں سے گھبراتے نہیں، ان کا رجائی ذہن نئے حالات کا استقبال کرتا ہے اور ان میں مثبت شرکت کی دعوت دیتا ہے۔کہتے ہیں:

علم و حکمت کی یہ فلک گردی
آسماں پر یہ دشت پیمائی
یہ قدم بوسیاں ستاروں کی
ماہ تاباں کی یہ جبیں سائی
ارتقائے شعور انساں کے
سلسلے کی حسین کڑیاں ہیں
یہ وہ لمحے ہیں جن کے سینوں میں
لاکھوں ہی ماہ وسال رقصاں ہیں

(نظم: خوابوں کی سیڑھیاں)

ہمارے ناقدین ادب کی عام بے نیازی اور نارسی کا یہ المیہ ہے کہ پرویز شاہدی کے فکر وفن کو کمیونسٹ میں محدود کر کے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔نظریاتی طور پر اشتراکی تصورات

سے قریب ہونے کے باوجود تخلیقی سطح پر پرویز شاہدی کی شاعری میں جو بلند تر اور آزاد فکر و نظر کی شعاعیں پھیلی ہوئی ہیں ان سے عام طور پر اغماض کیا گیا ہے۔ وہ تسلسل ارتقاء کے قائل ہیں اور ہر آن نئے امکانات کے قائل ہیں۔ اپنی نظم ''ساز مستقبل'' میں وہ اپنی خوبصورت تخلیقی جودت کے ساتھ نئے انسانی فتوحات کی بشارت دیتے ہیں اور کہتے ہیں:

کتنے اصنام ناتراشیدہ
پتھروں ہی میں کسمساتے ہیں
کتنے ہی ناشگفتہ لالہ و گل
ذہن بلبل کو گد گداتے ہیں
کتنے ہی جلوہ ہائے نادیدہ
ابھی پردے میں مسکراتے ہیں
ناسرائیدہ کتنے ہی نغمے
دل کے تاروں سے لپٹے جاتے ہیں
بے جلائے ہوئے دیئے کتنے
رات ہوتے ہی جھلملاتے ہیں
کس نے چھیڑا ہے ساز مستقبل
آج لمحات گنگناتے ہیں

(نظم: ساز مستقبل)

پرویز شاہدی کے پورے سرمایۂ سخن کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ان تخلیقات پر مشتمل ہے جن کا تعلق وطن دوستی اور عام انسانی و اخلاقی اقدار سے ہے۔ یہاں ظلم و استبداد، استحصال، طبقاتی کشمکش، سماجی اور اقتصادی لحاظ سے کمزور طبقے کے سلسلے میں ہمدردی نیز ایک ایسے نظام حیات کا تصور ملتا ہے جو ایک بہتر معاشرے کی تعمیر کر سکے۔ یہیں اشترا کی نظریات سے ان کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ اس نظریہ حیات کے نفاذ کے خوشنما خواب بھی نظر آتے ہیں۔ پرویز شاہدی کی شاعری کا دوسرا حصہ رومانیت سے متعلق

ہے لیکن یہ رومانی نظمیں محض محبت کے جذبات کی ترسیل تک محدود نہیں ہیں۔ داستان کرم، گل چیں اور محرکات جیسی بظاہر رومانی منظومات میں بھی پرویز شاہدی کے یہاں ایک بہتر اجتماعی زندگی کی خواہش موجیں مارتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ رومانی تعلق پرویز شاہدی کے یہاں انفعال اور مجہولیت کا باعث نہیں بنتا بلکہ یہ قوت حیات کو قوی تر بناتا ہے۔ یہ دو بند ملاحظہ کیجئے:

جن کی رنگینی سے تخیل مری گلفام ہیں
لالہ رنگ الفاظ ہیں، فقرے سمن اندام ہیں
جو امین جلوہ ہائے گلشن الہام ہیں
جو خدائے رنگ وبو کا آتشیں انعام ہیں
دل میں وہ جذبات رنگیں پیرہن لایا ہوں میں
انجمن سے آپ کی اک انجمن لایا ہوں میں
جس کے شعلوں پر گری پڑتی ہے فکر بے قرار
استعارے جس پہ صدقے جس پہ تشبیہیں نثار
جس کی لو پر ناچتی ہیں صنعتیں پروانہ وار
جس کے تار اشک پر شاعر بجاتا ہے ستار
ذہن میں اپنے وہ شمع ضوفگن لایا ہوں میں
انجمن سے آپ کی اک انجمن لایا ہوں میں
(نظم: محرکات)

اس طرح وہ تخلیقات بھی جو بطور مزاح وتفنن اور طنز وظرافت شمار کی جاتی ہیں پرویز شاہدی کے تعمیری اور مقصدی ذہن کی ترجمانی کرتی ہیں۔ فکر وفلسفہ کے نکات ان کے پُر اثر شعری اظہارات سے شیر وشکر ہو کر ان کی شاعری کی معنویت کو ہر دور کے لئے اہم بنا دیتے ہیں۔ اُردو کی پائندہ تخلیقی روایت کی تاریخ پرویز شاہدی کے ذکر کے بغیر مرتب نہیں ہو سکتی۔

(انتخاب۔۳۱ صفحہ ۸۷ سن اشاعت ۲۰۱۵ء)

☆☆

پروفیسر عبدالقادر فاروقی

پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کی تالیف "اُردو شاعری اور تصوف" اپنے موضوع میں اس حیثیت سے اہمیت کی حامل ہے کہ انہوں نے نہ صرف ان شعرا اور ان کے کلام کا مطالعہ پیش کیا ہے جنہوں نے تصوف کے موضوع سے اپنی خصوصی دلچسپی ظاہر کی ہے بلکہ اس کی اہمیت یوں بھی متعین ہوتی ہے کہ انہوں نے اس جذبے اور کیفیت کا علمی تجزیہ بھی کیا ہے جو کسی اچھے فنکار کو صوفیانہ موضوع کی پیشکش پر آمادہ کرتی ہے۔ اتنی بات تو آسانی سے تسلیم کی جاسکتی ہے کہ تصوف کے موضوع میں سچی کیفیت اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب اسے محض موضوع کی سطح پر نہ اپنایا جائے۔ یہ اس انجذاب کا نتیجہ ہوتا ہے جو مابعد الطبیعات تصورات سے ذہنی و روحانی رابطے سے پیدا ہوتا ہے۔ میں تصوف کی کیفیت کا تجزیہ موجودہ معاشرے سے بیزاری اور گریز کی روشنی میں کرتا ہوں۔ حساس فن کار حالات حاضرہ کی نامساعدت سے اکتا کر ایک ایسی فضا کا متلاشی ہوتا ہے جہاں اسے سکون دل نصیب ہو سکے۔ جہاں انسانی اقدار خطرے میں نہ ہوں، جہاں معاشرے میں ظلم و جور اور بالادستی کا دار دورہ نہ ہو، جہاں امن و سکون خطرے میں نہ ہو، جہاں کوئی ایک طبقہ دوسرے طبقات کو معاشی، نفسیاتی، تمدنی اور تہذیبی اعتبار سے کمزور و نابود کرنے کے درپے نہ ہو۔ غرض ہنگامی خارجی حالات سے نامطمئن ہو کر جب حساس فن کار گریز و فرار اختیار کرنا چاہتا ہے تو وہ ایک ایسی طاقت میں پناہ لینا چاہتا ہے جو رحمٰن و رحیم ہے، جو قادر مطلق ہے کہ دادرسی اور سکون طلبی کے لئے اس ذات سے بہتر کون ہوسکتا ہے۔ اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ تصوف کا جذبہ دکھے دل لوگوں

کے لئے ایک سہارا ہے، ایک مداوا ہے ایک جائے پناہ ہے۔

اس تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صوفیانہ جذبے کی اساس انحراف اور اختلاف ہے۔ یہ ایک طرح کا احتجاج و انقلاب ہے جو بر خود غلط اقتدار سے نجات کا وسیلہ ہو سکتا ہے۔ گریز و اختلاف کی فضا میں اہل فکر و نظر اور صاحبان ہنر کے پیش نظر کچھ اور بھی راہیں ہوتی ہیں۔ حالات سے نامطمئن حضرات سماجی اور خارجی علائق سے نجات پانے کے لئے بسا اوقات روحانی ماحول کے متلاشی بھی ہوتے ہیں، فطرت پسندی، تنہائی، مناظر قدرت، کیف و سرور اور عشق و موانست وغیرہ کئی ایسے گوشے ہیں جہاں خستگان خنجر جور و جفا فراغ و تحفظ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اپنی بنیاد میں یہ راہیں بھی معاشرے کے جمود، تعطل اور انتشار سے دور لے جا کر مادی و ذہنی حفاظت کا وسیلہ سمجھی جاتی ہیں۔ فرار کا ایک گوشہ سیاسی و سماجی انقلاب اور مسابقت و مجادلت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ چنانچہ شاعری کا ایک بڑا حصہ اس جذبے کے اظہارات پر بھی محیط ہے۔ انقلابی ذہن حالات حاضرہ میں تبدیلی پیدا کر کے انہیں استوار بنانے کے لئے قلم سے تلوار کا کام لینا چاہتا ہے اور ظلم و جور کے خلاف راست مقابلہ آرائی پر اکساتا ہے۔ اُردو شاعری کا ایک مضبوط حصہ ایسی انقلابی شاعری کا امین ہے۔

غور کیا جائے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ شاعری کا ایک بڑا حصہ احتجاج، انقلاب، انحراف اور دفاعی جذبوں پر مشتمل ہے۔

صوفیانہ شاعری ان سبھوں سے قریب ہوتے ہوئے ایک الگ شناخت کی حامل ہے۔ گریز و فرار کی جو صورتیں رومان پسندی، فطرت نوازی، تعشق یا مادی مقابلے اور مجادلے میں ملتی ہیں ان سبھوں کا تعلق جسمانی اور مادی حصول راحت سے ہے۔ یہاں باطن کے فراغ و بشاشت اور روحانی انبساط نیز اخلاقی اقدار سے تعلق نہیں رہتا۔ بخلاف اس کے جس فرار کے نتیجے میں انسان تصوف کی طرف راغب ہوتا ہے اس میں مادی علائق سے دور ہٹ کر روحانی اور ماورائی فضا کی جستجو اصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ تصوف میں غیر اسلامی عناصر کی شرکت بھی ہوتی گئی ورنہ فی الاصل یہ خالص اسلامی طریق عمل ہے۔ اسی لیے پروفیسر جعفر رضا نے لکھا ہے کہ:

"تصوف کی حیثیت قرآن حکیم میں تلاش کرنا زیادہ مفید ہے۔ اس کی یہ آیت تصوف کا رہنما اصول ہے"

(پروردگار ان کے درمیان ایک رسول مبعوث فرما۔ جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں قرآن و حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس کو پاکیزہ بنائے۔ البقرہ ۱۲۹/۲)۔ اس آیت کریمہ سے بشر کے نہاد باطن میں خوابیدہ قوت غریزی کو بیدار کرنے کی تین منزلیں اخذ کی جاسکتی ہیں۔ پہلی منزل: آیت قرآنی کی تلاوت۔ دوسری منزل: کتاب و حکمت کی تعلیم، اور تیسری منزل: نفوس کو پاکیزہ بنانا۔ ان تینوں منزلوں سے گزرنے کے لئے ایک ہادی و رہنما کی حکمت ناگزیر ہوتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ رسول بنا کر مبعوث کرتا ہے۔ اس طرح اولین صوفی رسول ہوئے۔ پھر ارشاد ہوا:

(اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ بھی تم سے محبت کرے گا۔ آل عمران ۳۱/۳)

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تصوف کے اس خالص اسلامی کردار کے باوجود مختلف عصری منزلوں میں اور مختلف خطہ ارض میں اس پر غیر اسلامی اثرات بھی طاری ہوتے رہے ہیں۔ تصوف کی ملتی جلتی شکلیں مختلف مذاہب میں ملتی رہتی ہیں۔ چنانچہ پروفیسر عبدالقادر فاروقی نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہندو مذاہب، آریہ سماج، بدھ مذہب، جین اور سکھ مذہب، پارسی اور یہودی مذہب ہر جگہ تصوف سے ملتی جلتی صورتیں اس بات کا احساس دلاتی ہیں کہ ہر عقیدے میں اپنے طور پر اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان اپنے نفس کو مادی آلودگی سے پاک کرے۔ ہندوؤں میں سلوک (یوگ) بھی اس کی ایک شکل ہے۔ بودھ مذہب میں آٹھ اصولوں (اشٹانگ مارگ) کی تعلیم ملتی ہے جن کے ذریعے اپنی شخصیت کو پاکیزہ بنانے کی تاکید کی گئی۔ یہ آٹھ اصول:

(۱) صحیح ارادہ (۲) صحیح علم (۳) صحیح عمل (۴) صحیح کلام (۵) حلال کمائی (٦) صحیح کوشش (۷) نیک خیال (۸) سچا دھیان

اسی طرح پارسی مذہب میں ان کی کتاب "اویستا" میں بھی وہ طریقے بتائے گئے

ہیں جن سے ان کے خیال میں انسان کا ضمیر روشن ہو سکتا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر فاروقی نے اس طرح مختلف مذاہب اور عقائد کا جائزہ لے کر تفصیل کے ساتھ تصوف کی آفاقیت پر بحث کی ہے اور تقابلی مطالعے کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی تصوف حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

انہوں نے دوسری کتابوں کی مدد سے اس موضوع پر مہیا ماٰخذ کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ تصوف سے متعلق پروفیسر صفی حیدر کی کتاب ''تصوف اور اُردو شاعری'' کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے اس خیال کا تجزیہ بھی کیا ہے۔

اس کے تحت یہ کہا جا سکتا ہے کہ تصوف سامی مذہب کے خلاف ایک آریائی ردعمل ہے۔ دراصل قبل از اسلام جن مذاہب کے اثرات ایک عہد تک دنیا کے خطوں پر قائم رہے ان کے یہاں انہماک، استغراق اور ذہنی ارتکاز کی مختلف شکلیں بنتی بگڑتی ہیں۔ اس کے علاوہ ارتکاز کا عمل جب فلسفے کی سرحد میں داخل ہو گیا تو مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا۔ غرض یہ کہ مختلف طریقہ عمل کی بنیاد پر الگ صورتیں سامنے آ گئیں۔ پروفیسر عبدالقادر نے نہایت تفصیل کے ساتھ تصوف کے سلسلے میں علمی تصورات اور عملی صورتوں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے اپنے اصل موضوع یعنی اُردو شاعری میں تصوف کا نہایت عمیق مطالعہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں اُردو شاعری کے ارتقائی سفر کو ملحوظ رکھا ہے۔ جنوبی اور شمالی ہندوستان کے بہت سے شعرا کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے تصوف کے موضوع اور اس کے مختلف پہلوؤں کا جس وسعت کے ساتھ مصنف نے اپنی کتاب میں جائزہ پیش کیا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ اگرچہ تصوف اور اُردو شاعری کے سلسلے میں اُردو میں مواد کی کمی نہیں ہے لیکن ابواب کی جو عالمانہ تقسیم پروفیسر عبدالقادر نے کی ہے اور اس کے تحت اپنے وسیع تر مطالعے اور عالمانہ تجزیے سامنے لائے ہیں اس کی وجہ سے ان کی یہ تصنیف اس میدان مطالعے کے حوالے سے ناگزیر سمجھی جائے گی۔

(انتخاب۔ ۳۱ صفحہ ۹۰ سن اشاعت ۲۰۱۵ء)
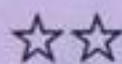
حیرتؔ فرخ آبادی

شاعری بنیادی طور پر فشار جذبات کا نام ہے۔ اس کے لئے آداب و قیود کی پابندی اس لئے لگائی جاتی ہے کہ اس فشار میں حسن پیدا ہو جائے اور جذبے کی وارفتگی اور اس کے مجنونانہ Out burst کو مانوس جمالیات حاصل ہو جائے۔ وحشت جب تھوڑے آداب اسیری سیکھ لیتی ہے تو عوام و خواص دونوں کی نظروں میں حسین تر ہو جاتی ہے۔ بے لباس فطری جذبے جو شاعری کی اصل ہوتے ہیں عام طور پر تحسین کی سرحدوں سے دور رہ جاتے ہیں۔ میں جب اس نقطہ نظر سے شعری اظہارات کا جائزہ لیتا ہوں تو فن کار کی داخلی تخلیقی شخصیت سے قریب ہو جاتا ہوں۔

مجھے یہ دعویٰ تو نہیں ہے مگر ایسا گمان ہوتا ہے کہ میں جناب حیرتؔ فرخ آبادی کی تخلیقی انفرادیت کی تفہیم میں دور تک پہنچ سکتا ہوں۔ ہر فنکار اپنے جذبات کے اظہار میں ایک تشنگی سی محسوس کرتا ہے۔ وہ جو کہنا چاہتا ہے اسے پورے طور پر نہیں کہہ پاتا۔ یہی احساس اسے دوسری تیسری تخلیقی جست پر آمادہ کرتا ہے۔ تکمیل اظہار کبھی نہیں ہو پاتی۔ قاری یا تنقید نگار کو اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ گفتہ سے ناگفتہ رموز اور ان کے حسن کا پتہ لگائے۔ فنکار کی حسرت اظہار کی کھوج خود ایک سرشاری کا باعث ہوتی ہے۔

جناب حیرتؔ فرخ آبادی اُردو شاعری کی روایات کے خوگر ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل کی حسین تر مستحکم شعری روایات قدیم رنگ سخن کے بغیر پہچانی نہیں جاسکتی۔ سن ۶۰ کے بعد اُردو غزل کے وہ تجربے جن سے غزل ناغزل بنتی جارہی تھی حیرتؔ کے نزدیک

قابل نفرین ہیں۔اس لئے وہ شعوری طور پر قدیم روایت غزل سے باہر آنا نہیں چاہتے۔ان کا شعر

غزل سنے گا تری کون اس جگہ حیرتؔ
تو کاش ساٹھ سے پہلے ہی مرگیا ہوتا

دور جدید سے ان کی وحشت کا اعلان نامہ ہے۔حیرتؔ کے ذخیرہ غزلیات میں کئی ایسی کاوشیں ملیں گی جہاں قدیم اساتذہ کے فکر وخیال میں کچھ نئے زاویے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔دراصل جدت کا تعلق ایسی کاوشوں سے بھی قائم ہوتا ہے۔جدت کا حسن روایت کے جلو میں نکھرتا ہے۔فکر ونظر کے متعارف متن میں تغیر پیدا کرکے نئے زاویے سامنے لانا بھی ایک طرح کی جدت ہے۔حیرتؔ جب یہ کہتے ہیں کہ:

رہے گا کچھ نہ کچھ ہوکر یقیناً
وہ مجھ سے آج کل برہم نہیں ہیں

تو معاً غالبؔ کے شعر:

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

کی طرف ذہن چلا جاتا ہے۔حیرتؔ نے اس طرح کے دوسرے مبارز کا مقابلہ بھی کیا ہے۔حیرتؔ فرخ آبادی کی شاعری میں انسانی اور اخلاقی اقدار کی حمایت، مذہبی معتقدات کی بجائے مذہب دل کی ترجمانی، بے ثباتی عالم کا احساس، کشادگی ذہن جیسی خصوصیات کے ساتھ زندگی کا رجائی پہلو نمایاں نظر آتا ہے، کہیں کہیں ایک صوفیانہ اور درویشانہ کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ایک تلاش، تجسس، کسی موہوم شئے کی جھلک کا شائبہ، ہجر کی بے تابی، فکر واظہار میں عدم تصنع اور راست و بے ریا لہجہ سے حیرتؔ فرخ آبادی کی تخلیقی شخصیت ہم عصروں سے مختلف ہوتی نظر آتی ہے۔اس بات کی توثیق ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

چراغ دیر و حرم ٹمٹما کے بجھ سے گئے
بس اب تو دل ہی جلانے سے روشنی ہوگی

میرے حصار ذات کے اندر یہ کون ہے
سمجھا نہیں ہوں آج تلک سوچتا رہا
حیرت سے پوچھئے تو خود اس کو پتہ نہیں
ہے کون جس کو آج تلک پوجتا رہا
کتنی پر لطف زیست ہوتی ہے
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا
خدا گواہ ہے جلتا ہوں ہجر میں حیرت
ہر ایک صبح سے پہلے ہر ایک شام کے بعد
اپنی ہستی کا بھی کچھ مجھ کو پتہ ملتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ ہیں حیرانیاں پھیلی ہوئیں

(انتخاب۔۳۱ صفحہ ۹۳ سن اشاعت ۲۰۱۵ء)

☆☆

جسپال کور کی تخلیق کاری

شاعری وزبان کا رشتہ تو یہ ہے کہ شعری تخلیقی کیفیات اور جذبات و محسوسات فنکار کے اندرون میں لہریں مارتے رہتے ہیں اور اپنے اظہار کے لئے تخلیق کار کی شخصیت میں طوفان پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس ارتعاش کے نتیجے میں تخلیق کار اپنی کیفیات کا اظہار لسانی سطح پر اس زبان میں کرتا ہے جو اس کی دسترس میں ہوتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زبان کا کام فن کار کے لئے محض ایک وسیلہ اظہار کے طور پر ہوتا ہے۔ تخلیقی اظہار کا یلغار اور اس کی بے کرانی ہے تو بہر حال اسے باہر آنا ہے اس لئے تخلیق کی اصل تلاش کرتے ہوئے زبان کی شکست وریخت اور اس کے معیار کا معاملہ بہر حال ثانوی ہوتا ہے۔

محترمہ جسپال کور کی تخلیقات میرے پاس آئیں تو مجھے پہلے لگا کہ اُردو کے معیاری لسانی جائزے کے لئے انہیں اولین درجے پر رکھ کر دیکھا جائے تو تخلیقی وجدان میں ان کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا ہے۔

محترمہ جسپال کور نہ اُردو میں مکمل دسترس کی دعوے دار ہیں نہ ہندی اور پنجابی کے اونچے لسانی معیار تک پہنچتی ہیں، لیکن چونکہ ان کے تخلیقی اظہارات کا معاملہ شاعری سے ہے اور شاعری اندرون کو بیرون کرنے کے مجاہدے کا نام ہے، اس لئے میں ان کی تخلیقات کو من وعن پیش کر رہا ہوں کہ ان کی تہہ سے جذبۂ بے اختیار شوق بیتابانہ انداز میں سر اٹھاتا ہے۔ میں فنون لطیفہ کو ذریعہ اظہار کی لغزشوں سے اوپر رکھ کر دیکھتا ہوں اور اس بات کا قائل ہوں کہ لسانی مہارت ایک الگ شئے ہے اور تخلیق کا کرب ایک الگ شئے۔

محترمہ جسپال کور کی یہ نظمیں ہندی، اُردو اور پنجابی ثقافت اور ان کی لسانی روایتوں

کے آمیزے سے زبان اور اندازِ بیان کی ایک نئی روش کی طرف اشارہ کرتی ہے جہاں لسانی آزادی کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کی ایک ایسی بے اطمینانی کا شائبہ بھی ہوتا ہے جہاں اظہار کے ناتشفی پن کا خوف اور جذبہ شرساری بھی ہویدا ہے۔ان سے تخلیق کار کی شخصیت کی کئی اور پرتیں سامنے آتی ہیں۔

میں محترمہ جسپال کور کے اس جذبہ اور شوق کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس کی وجہ سے وہ آہستہ خرامی کے ساتھ اُردو تخلیق کاری کے خیمے میں داخل ہونا چاہتی ہیں۔

(انتخاب۳۲ صفحہ۹۰ سن اشاعت ۲۰۱۵ء)

☆☆

ظہیر انور

غزل کی ہر دل عزیزی اور عہد حاضر میں اس کے معیار و مزاج کی ہمہ جہتی کی وجہ سے آج کسی غزل گو کے بارے میں محاکماتی انداز سے کچھ کہنا سخت مشکل ہو گیا ہے۔ آج اُردو شاعری ایک ایسے دور سے گزر رہی ہے جہاں ہر طرف غزل ہی غزل نظر آتی ہے۔ عہد حاضر میں غزل گو فنکاروں کے یہاں موضوعات، اسلوب، الفاظ ولغات، اشارات وکنایات اور ڈکشن کے اعتبار سے اتنا تنوع پیدا ہو گیا ہے کہ اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ غزل کی عام مقبولیت کی وجہ سے ہماری دوسری اصناف سخن کی شناخت کمزور ہو گئی ہے۔ اس خسارے کی تلافی اس طرح ہو رہی ہے کہ غزل ہمارے خارجی مشاہدات اور داخلی محسوسات کی ترجمانی میں نہایت مستحکم اور پر اثر ہو چکی ہے۔

کامیاب اور نمایاں غزل گو فنکاروں میں مکانی اعتبار سے قربت رکھنے والے ظہیر انور کو اس طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ غزل ان کی انگلیوں کے اشارے پر ناچتی ہے۔ یوں تو ہر باشعور غزل گو مصرعے سے مصرعے کو پیوست کرنے کا ہنر جانتا ہے لیکن جو بات ظہیر انور کو دوسروں سے بطور خاص ممتاز بناتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے غزلیہ اشعار کے دونوں مصرعے مل کر مشاہدے اور احساس کی ایک نئی فضا پیدا کرتے ہیں۔ غزل کا آرٹ دو مصرعوں کے بیانات میں ایک ایسا ربط پیدا کرنے پر منحصر ہے جس سے شاعر کے تخیل کی ایک نئی کائنات ہویدا ہو سکے۔ غزل نفی سے اثبات کی تراوش کا نام ہے۔ اس تعریف کی روشنی میں ظہیر انور نا قابل تسخیر کیفیات کو لفظوں میں سمیٹ لینے پر قادر ہیں۔ میں نے غزل کے سلسلے میں یہ کہا ہے کہ یہ صنف To get some thing out of nothing کی مظہر ہوتی ہے۔ یہاں

content اسلوب اور اظہار کی ندرت سے پیدا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ موضوع سخن نہایت لطیف، غیر معین، غیر واضح اور opaque ہوتا ہے۔ الفاظ عبد العزیز خالد، ظفر اقبال اور شمیم قاسمی کی طرح ظہیرؔ انور کے یہاں بھی مطیع و فرمانبردار نظر آتے ہیں اور اظہار و بیان کے معاملہ میں ان کے ہر حکم کے تابع ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ مشکل زمینوں اور قوافی و ردف کو بھی شگفتہ بنا دیتے ہیں۔ اظہار کی یہی قدرت ان کے یہاں جدت کا حسن پیدا کرتی ہے۔ ظہیرؔ انور کی دروں بینی اور دروں بیانی کی تفہیم کے لئے ذہین قاری کی شرکت ضروری ہے۔ وہ خود کہتے ہیں۔

ہر شخص ہے بضد کہ زباں ہی سے کچھ کہوں
دیوان میرا میز پہ کب تک دھرا رہے
(انتخاب ۳۲ صفحہ ۹۴ سن اشاعت ۲۰۱۵ء)

☆☆

فرد الحسن

فرد الحسن نئی نسل کے باشعور اہل قلم کی حیثیت سے اپنی شناخت کے لئے سرگرم ہیں۔تخلیق،تنقید اور تحقیق ان کا دائرۂ کار ہے۔انہوں نے اپنا سفر شاعری سے شروع کیا ہے۔خدا بخش اورینٹل لائبریری کے تعلق نے انہیں تحقیق وتنقید کی دشوار جہتوں کی راہ دکھائی اور اس طرح متن سے فطری دلچسپی کے ساتھ علمی وانتقادی آگہی نے ان کی شخصیت میں ایک طرح کے thoroughness کے نقوش پیدا کر دیئے ہیں۔تخلیق کے سلسلے میں ان کا والہانہ پن اور نقد ونظر کے باب میں ان کا محتاط انداز نیز مطالعہ اور استنتاج کا رویہ انہیں ان کی راہوں پر کتنی دُور تک لے جائے گا یہ کہا نہیں جا سکتا:

آغاز تو اچھا ہے انجام خدا جانے

میں فرد الحسن کے بارے میں تھوڑے تحفظِ اظہار سے اس لئے کام لے رہا ہوں کہ نئی ادبی نسل کو متعدد مبارزات کا سامنا کرنا ہے۔عہد حاضر میں اپنے وقیع ادبی اثاثے سے بے نیازی،مطالعے سے گریز،کچھ نیا کر دکھانے کے شوق اور جذبے کے تحت غیر ادبی اور اجنبی تجربات سے رغبت،اُردو ادب کی بوطیقا سے انحراف۔۔اور اسی نوع کے منفی رجحان نے نئی نسل کی تخلیقات اور دانشوروں کو STAGNANT ہے۔فرد الحسن کی تحریروں کی روشنی میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی اُٹھان میں یہ منفی نقوش نہیں ملتے۔وہ پرانے اقدارِ فن اور ادبی سرمایے کی اہمیت کے قائل ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے اعتراف کے بغیر نئے کی شناخت اور اس کی درجہ بندی ممکن نہیں۔

فرد الحسن کے پیش نظر مقالات کی روشنی میں مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ وہ تحقیق اور تنقید

کے باہمی ربط سے اچھی طرح واقف ہیں۔ تحقیق دراصل اثبات حق کا نام ہے۔ معلوم حقائق کو ثبوت و براہین اور دلائل کے ذریعہ متحقق کرنا ہی تحقیق کا فریضہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس چھان پھٹک اور تلاش و جستجو کے درمیان متعدد ایسے نکات سامنے آجاتے ہیں جن سے بعض سابقہ مسلمات اور محاکمات ٹوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں، محقق اس دھند کو بھی صاف کرتا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہر نئی دریافت بعض گوشوں سے تشنہ نظر آتی ہے اور یوں تحقیق کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ادبی تحقیق کو بہر حال ادب کے موضوعات و مسائل سے ہم رشتہ رہنا چاہئے۔ اس کے علاوہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ادبی تناظر کا خیال کرتے ہوئے محقق اپنے کارنامے کو ہم عصر ادبی مذاق و معیار سے قریب رکھے۔ ہر عہد کا اپنا الگ معیار فہم ہوتا ہے۔ لسانی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی حالات کی تبدیلی سے ادبی موضوعات و مسائل کی ترجیحات میں فرق آجاتا ہے۔ اس لئے تحقیقی نگارشات کی عصری معنویت [RELEVANCE] کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

جہاں تک کہ تنقید کا مسئلہ ہے تو یہاں فن پارے یا فن کار کے سلسلے میں اطلاعات کی فراہمی سے ہی تنقید کا حق ادا نہیں ہو جاتا۔ تنقید ہمیں مطالعات سے گزار کر وہ نظر [VISION] عطا کرتی ہے جس سے فن پارے کے معانی کی وسعتوں کا اندازہ ہو سکے۔ اس پروسس میں تشریح، تجزیے اور لسانی آگہی و جائزہ کی منزلیں بھی آتی ہیں۔

فرد الحسن کی اس کتاب میں تقریباً تمام مقالات ان ادیبوں اور شاعروں سے متعلق ہیں جنھیں ان کے کمالات کے باوجود ادبی تاریخ میں وہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہو سکا جس کے وہ حق دار ہیں۔ ظاہر ہے ایسے ناقد کا رویہ تحسینی اور توصیفی ہو جاتا ہے، وہ اپنے موضوع کا وکیل نہ بھی بنے لیکن ایک منصف کا فریضہ ضرور انجام دینا چاہتا ہے۔ منصفی کے لئے جواز اور دلائل کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ بڑی طمانیت کی بات ہے کہ فرد الحسن کے مقالات وافر جواز اور ناقابل تردید دلائل سے متمول ہیں۔ میں مصنف کے روشن مستقبل کی دعاؤں کے ساتھ اس کتاب کا استقبال کرتا ہوں۔

(انتخاب۔۳۳ صفحہ ۸۵ سن اشاعت ۲۰۱۶)

☆☆

عظیم صدیقی

ہم شعروادب کے حوالے سے شاعری کرنے والے یا فکشن نگار کو تخلیق کار کہنے کے عادی رہے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ تخلیق کاری فی الواقعی کیا ہے۔ ایک فطری اور سچے تخلیق کار کا منصب وفریضہ کیا ہوتا ہے۔ ادب کے میدان سے ہٹ کر تخلیق کاری زندگی کی کن جہتوں میں نمایاں ہو سکتی ہے۔

اگر اس مسئلے پر کچھ دور اور کچھ دیر تک غور کریں تو اس حقیقت تک پہنچ جائیں گے کہ تخلیق کا اطلاق کسی بھی شعبۂ حیات پر ہو سکتا۔ کسی بھی شعبۂ حیات کے عام اور عمومی معیار فہم سے اوپر اٹھ کر نئی وسعتوں کی طرف دیکھنا اور انہیں اپنی دسترس میں لینے کے لئے جہد و کاوش کر کے کوئی نئی صورت حال سامنے لانا ہی تخلیقیت ہے۔ اس اختراعی قوت کے حامل شخص کی پہلی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے عہد کے ذہنی معیار سے نامطمئن رہتا ہے اور اپنے طور پر نئی جہتوں کا متلاشی ہوتا ہے۔ تلاش، جستجو اور اس کے لئے جہد مسلسل میں شب وروز اپنے آپ کو ذہنی اور عملی طور سے مصروف رکھتا ہے۔

عبدالعظیم صدیقی (عظیم صدیقی) کی شخصیت کچھ ایسی نوع کی تھی۔ وہ زندگی بھر متجسس اور متلاشی رہے۔ میری ان سے ملاقات معروف افسانہ نگار اور ادبی شخصیت نگار عظیم کے توسط سے ہوتی تھی، نگار عظیم شعروادب کے میدان میں اپنی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کی وجہ سے نمایاں ہیں اور عظیم صدیقی دوسری جہتوں میں INNOVATION کی وجہ سے مجموعہ کمالات تھے۔ دونوں تخلیقی ذہن کے مالک رہے ہیں۔ یہی وجہ سے ان کی ازدواجی زندگی کو

میں نے ہمیشہ خوش گوار پایا۔ عظیم صاحب بنیادی طور پر خاموش پسند اور کم سخن تھے لیکن نگار عظیم ہمارے درمیان کوئی افسانہ یا مقالہ سنائیں تو اکثر عظیم صاحب اپنی رائے کے ذریعہ تخلیق و تحریر کی بعض خوبیاں کی طرف اشارہ ضرور کرتے تھے۔ ادب سے براہ راست تعلق نہ ہونے کے باوجود وہ زبان و بیان اور فکر و نظر نیز ان کی پیش کش کے رموز سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہ ذہنی تربیت و ترتیب انہیں اپنے خاندانی ماحول سے حاصل ہوئی تھی۔ ان کا تعلق ایک ایسے خانوادے سے تھا جہاں علم و ادب کا چرچا تھا۔ دادا، پردادا، والد وغیرہ ایسے مشاغل سے منسلک رہے جہاں زبان و ادب اور علم و دانش کا فروغ ہوتا ہے۔ پردادا (محمد کریم اللہ مرحوم) حافظ تھے اور انیسویں صدی کے اواخر میں اپنے ہفتہ وار اخبار 'مہر نیمروز' کی اشاعت کی وجہ سے اس دور کی صحافت میں نہایت مقتدر سمجھے جاتے تھے۔ دادا مرحوم بجنور گزٹ کی ترتیب تسوید اور اس کی اشاعت کی وجہ سے معروف رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ خانوادے کی نسلوں میں اپنے عہد کی ایجاد و اختراع سے دلچسپی کی نوعیت بدلتی رہی۔ والد ماجد (عبدالحفیظ صدیقی مرحوم) کتابوں کی اشاعت کے علاوہ اشتہار کی نئی تکنیک کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے کمرشیل آرٹ کی با قاعدہ سند حاصل کی۔

عظیم صدیقی نے نہ صرف یہ کہ طباعت و اشاعت کے امور میں مہارت حاصل کر لی بلکہ ان کے تخلیقی ذہن نے اس علم کے فروغ میں نمایاں کام کئے۔ انہوں نے طباعت کے جدید ترین آلات اور ان کے استعمال کو مقبول عام بنانے کی کوشش کی۔ میرے علم میں ان کی کتاب ''ہدایات مائکروسوفٹ ورڈ'' اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی تخلیق ہے۔ آج سے کئی دہائی قبل جب مائکروسوفٹ کے استعمال کا علم خال خال تھا، عظیم صاحب نے اُردو والوں کو اس ہنر کی طرف راغب کیا۔ یہی وجہ سے ان کی متذکرہ بالا پیش کش کی حد درجہ پذیرائی ہوئی اور کئی نسلیں اس سے فیض یاب ہوتی رہیں۔

عظیم صدیقی کے تخلیقی ذہن کی ایک زندہ مثال ان کی کتاب ''چھپائی کی کہانی'' بھی ہے۔ اس میں طباعت کی تکنیک کے تاریخی ارتقا کو تصویروں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ جملہ شعبوں کے مقابلے میں طباعت کی تکنیک میں زیادی تیز

رفتار ترقی ہوئی ہے۔ دستکارانہ ہنر مندی سے لے کر مشینوں کی ایجاد تک کی لمبی کہانی دلچسپ بھی ہے اور انسانی عقل و فراست کی ایک تاریخ بھی۔ عظیم صدیقی نے اس تاریخ کو مصور کر دیا ہے۔ انہوں نے طباعتی پروسس کے ارتقا کی مکمل تفصیل پیش کر دی ہے۔ طباعت کے بنیادی اصول بتاتے ہوئے انہوں نے ماضی و حال کا سلسلہ وار اتصال کی منزلیں روشن کی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے تصویری، طباعت، طباعتی کیمرہ، بلاک سازی، فلکسو گرافک طباعت، آفسیٹ اور کمپیوٹر وغیرہ کے بارے میں اتنے مواد فراہم کر دیئے ہیں اور تصویروں کے ذریعہ ان فنون کی ایسی تشریح و تفسیر پیش کی ہے، جو دوسری جگہ نہیں ملتی۔

عظیم صدیقی کی مطبوعات کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ وہ غیر معمولی تخلیقی قوت کے حامل تھے۔ اپنے موضوع کے سلسلے میں ان کا ذہنی ارتکاز، تلاش و تجسس تازہ ترین علم (Up-to-date Knowledge) اور اس کی ماہرانہ وضاحت و صراحت ان کی شخصیت کی قابل رشک تخلیقیت (Creativity) کی دلیل ہے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر کی صحبت نہیں رہی

(انتخاب۔۳۳ صفحہ ۸۷ سن اشاعت ۲۰۱۶ء)

ڈاکٹر خالدہ خاتون

عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ خواتین اہل قلم تحقیق وتنقید کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوتیں۔انہیں تخلیق سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔افسانہ نگاری،ناول یا پھر شاعری کی اصناف سے،ان کی اولین دلچسپی کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا رہا ہے کہ طبقہ نسواں بالعموم تخیل،تصوراور جذبات وکیفیات سے فطری طور پر سرشار ہوتا ہے،ان سے انسانی اقدار،روحانی تقدیس اور لطیف محسوسات کی جوتہذیبی فضا متشکل ہوتی ہے وہ اس طبقے کے سرشت کے عین مطابق ہے۔اس بات کو بہت حد تک تسلیم کر لینے کے باوجود اسے ایک مسلمہ حقیقت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

علم ودانش کے فروغ اور فکر کی وسعت کے عہد بعہد شعروادب کی حدود میں خوب و زشت کے لئے جو میزان ومعیار بنائے ہیں اس نے طبقہ نسواں کو بھی اقدار فن کی آگہی بخشی ہے چنانچہ خواتین کی انتقادی ادب سے دلچسپی کی مضبوط روایت ممتاز شیریں نے قائم کی وہ رفتہ رفتہ برومند ہوتی ہوئی عہد حاضر میں داخل ہوتی ہے اور آج کا منظر نامہ یہ ہے کہ خواتین اہل قلم مردوں کے شانہ بشانہ چل رہی ہیں۔اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں جامعیات سے وابستہ خواتین نصابی اور درسی ضرورت کے تحت بھی کامیاب تحقیقی وتنقیدی مقالات لکھ کر اسناد حاصل کر رہی ہیں۔گویا تیزی کے ساتھ رجحان بدل رہا ہے اور ایں وآں کا فرق ختم ہوتا جارہا ہے۔

تنقید وتحقیق کی کدوکاوش اور تخلیقی سرمائے کی جانچ پڑتال کے باب میں بہار کی خواتین قلم کاروں کی پیش رفت بھی قابل توجہ ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ کم ازکم ریاستی سطح پر تحقیق وتنقید سے وابستہ خواتین کے کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اوران کی تحریروں

سے ان کے روبہ کمال انتقادی انہاک کی درجہ بندی کی جائے۔ پیش نظر مسودے، ذکر رفتگاں، کی مولفہ ڈاکٹر خالدہ خاتون اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے کم سے کم بہار میں محتاج تعارف نہیں رہیں۔ تحقیق وتنقید سے ان کی والہانہ وابستگی کی نوعیت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی اس بات پر اکتفانہیں کیا ہے کہ انہیں محض قلم کاروں کے فہرست میں شمار کیا جائے بلکہ ایک بلند نگاہ اور صاحب فکرونظر جائزہ کار کی طرح اصیل تخلیقی وتنقیدی نگارشات کی درجہ بندی کی کوشش کرتی ہیں۔

انہیں جاننا چاہئے (اور بہت حد تک وہ سمجھتی ہیں) کہ تنقید محض اطلاعات کی فراہمی تک محدود نہیں رہتی بلکہ انتقادی تحریر کا معیار اس وقت قائم ہوتا ہے جب ادبی متن کو مقابل اور ہم عصر معیار پر رکھا جائے اور زیر بحث فن کار یا اس کی تحریروں کی معنویت کی کھوج لگائی جائے۔

ڈاکٹر خالدہ خاتون کی کتاب ''ذکر رفتگاں'' عام تنقیدی جائزے کے مقابلے میں ذرا مخالف نوعیت کی حامل ہے یعنی یہ کہ اس میں ان کے ارباب کی خدمت کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ یہاں بے باک انتقادی فیصلوں کی گنجائش نہیں رہتی بلکہ مرحومین کے سلسلے میں جو ایک نرم رویہ اور ہمدردانہ تاثر ہونا چاہئے وہ بہر حال خالدہ خاتون کی تحریروں سے ہویدا ہے۔ ان مضامین میں اطلاعات کی فراہمی کے ساتھ مرحومین کے ادبی خدمات کو تحسین آمیز جذبے سے سامنے لایا گیا ہے۔ عقیدت، محبت، اور ایک خوشگوار تاثر کے ساتھ ''رفتگاں'' کی ادبی خدمات کے اعتراف نے ڈاکٹر خالدہ خاتون کی اس کتاب کو جو منفرد رنگ عطا کیا ہے وہ قارئین ادب کے لئے وجہ کشش ہو سکتی ہے۔

(انتخاب۔۳۳ صفحہ ۸۹ سن اشاعت ۲۰۱۶)
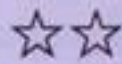
معراج احمد معراجؔ

اُردو شاعری بالخصوص اُردو غزل کے موجودہ منظر نامے میں کئی ممتاز شعرا کے ساتھ معراج احمد معراجؔ کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ انہوں نے اگرچہ شاعری اور ادب کی مختلف صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے اور منظومات، نعتیہ شاعری اور دوہا کی صنفوں میں بھی اپنی تخلیقی انفرادیت کا ثبوت فراہم کیا ہے، لیکن غزل ان کی خاص میدانِ عمل ہے۔ ''دفینہ پہاڑ کا'' ان کی غزلیات کا تیسرا کامیاب مجموعہ ہے۔ معراجؔ کے پاس مشق و تجربے کی ایک لمبی مدت ہے۔ ان کی شاعری کے سلسلے میں عنوان چشتی، علقمہ شبلی، مظفر حنفی، طالب رام پوری، م ناگ، سلام بن رزاق، وقار قادری، رونق نعیم اور نذیر فتح پوری نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ معراجؔ نے عہدِ حاضر کے صاحبان معیار کو اپنی شاعری سے متاثر کیا ہے۔ ابھی نقد و نظر کے میدان میں جن افراد کا اوپر ذکر آیا ہے وہ عصری اعتبار سے اور شعری مزاج و معیار کے لحاظ سے مختلف طبقات میں منقسم ہیں۔ ان سارے لوگوں کا معراج احمد معراجؔ کی شاعری سے متاثر ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی شاعری میں وہ قوت اور توانائی موجود ہے جو مختلف عہد، نسل اور مزاج رکھنے والے ادب شناسوں کو متاثر کر سکتی ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ کچھ تخلیقی اثاثہ کسی خاص عہد میں مقبول ہوتا ہے یا معیار و مزاج کے حامل کسی خاص قبیلے کے ذریعے خراجِ تحسین حاصل کرتا ہے۔ ایسی شاعری ہر طبقے اور ہر دور میں مقبول ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ معراج احمد معراجؔ اس لحاظ سے بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ وہ مختلف انداز و معیار کے لوگوں میں مقبول ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

شاعری کے خوشگوار اثرات کی ہمہ گیریت معراج کو ایک خاص مقام عطا کرتی ہے۔معراج کی غزلیہ شاعری میں سب سے اہم اور قابل ذکر عنصر ان کا سادہ اور بے ریا لہجہ ہے۔وہ روایتی انداز و اسلوب سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ انہوں نے شعری آرائش کی کبھی فکر نہیں کی۔ان کا بے تکلف انداز ایک نئے لہجے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔وہ موضوعاتی سطح پر اپنے عہد کی عیاری کو بے نقاب کرتے ہیں۔تکلف، صناعی اور اہتمام کے بغیر ان کی شاعری عام حساس انسانوں کے ذہنوں کی ترجمانی کرتی ہے۔صناعی کے بغیر سادہ اظہار میں تخلیقی حسن کا اہتمام ایک خاص ہنر مندی سے منسوب ہے۔معراج کی شاعری میں اس نوع کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔مندرجہ ذیل اشعار اس تصویر کی تائید کرتے ہیں:

قندیل کی مانند ضیا بار ہوں میں بھی
اس واسطے جلتا ہے میرے نام سے سورج

اسی خنجر نے کئی زخم دیئے ہیں مجھ کو
تیرے لب پہ جو تبسم سا نظر آتا ہے

اپنے بچے کی فکر میں ہرنی
چل پڑی تھی سبکتگیں کے پاس

اس شہر میں موجود ہیں مٹی کے مکاں بھی
بادل تیری سوغات سے تکلیف نہ پہنچے

ایک پتھر کا تکبر نہیں بھایا مجھ کو
اپنے ہاتھوں سے تراشا جو صنم توڑ دیا

ایک جگنو ہی سہی دیکھ میری جرأت بھی
میں نے قسطوں میں اندھیروں کا بھرم توڑ دیا

معراج نے شاعری کو نہ صرف لفظوں کا کھیل سمجھا ہے نہ اسے محض عشقیہ جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔بلکہ سماجی، سیاسی، تہذیبی اور اخلاقی موضوعات و مسائل کی پیش کش کر کے اس فن شریف کی اصل مقصدیت پر زور دیا ہے اور خوبی یہ ہے کہ ان موضوعات

کے اظہار میں معراج نے ہر جگہ شعری جمالیات کا خیال رکھا ہے۔

کبھی ملنے نہیں دیتا ندی کے دو کناروں کو
مجھے پانی کا یہ بہتا ہوا دھارا نہیں بھاتا
نظر آتا ہے ہر انسان بونا سا بلندی سے
کہ یہ منزل قد و قامت کی لمبائی چھپاتی ہے
دریا کو کبھی اتنا تکبر نہیں ہوتا
دریا سے اگر شہر کے نالے نہیں ملتے

اُردو کی غزلیہ شاعری میں ہر جگہ منور رانا کے لہجے کے اثرات نظر آتے ہیں۔معراج احمد معراج کی شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

معراج احمد معراج کے تازہ مجموعے ''دفینہ پہاڑ کا'' میں اس نوع کے متعدد اشعار موجود ہیں۔ان سے لہجے کی تازگی اور فکر کی شگفتگی نیز غیر معمولی تخلیقی جودت کا اندازہ ہوتا ہے۔امید ہے کہ ان کا تخلیقی ہدف مستقبل میں بھی بلند سے بلند تر رہے گا۔تازہ مجموعے کا نام ''دفینہ پہاڑ کا'' بہر حال ذوق سلیم پر گراں گزرے گا۔

(انتخاب۔۳۳ صفحہ ۹۰ سن اشاعت ۲۰۱۶)
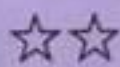
کہکشاں توحید

کہکشاں توحید کے سلسلے میں، میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں، مجھے یاد آتا ہے کہ ان کی سابقہ دو تصنیفات کے بارے میں، میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اب اس کے بعد اس کی ضرورت تو نہیں تھی کہ ان کے پیش نظر افسانوی مجموعے ''ریت کے گھروندے'' کے بارے میں بھی اپنے خیالات پیش کروں، لیکن کہکشاں توحید کے پُرخلوص اصرار کے آگے میں مجبور ہوں اور بہر حال ان کی پیش نظر تصنیف کے بارے میں مجھے اپنی رائے دینی ہی ہے۔

جو بات کہکشاں توحید کے امتیاز کے لئے اہمیت کی حامل ہے، وہ یہ ہے کہ تخلیقی سطح پر کہکشاں توحید نہایت برق رفتار ہیں، لکھنا، لکھنا، مدام لکھنا ان کا شیوہ ہے، اپنے معاصرین میں بلاشبہ وہ پہلی خاتون ہیں، جو مسلسل لکھتی جا رہی ہیں اور اکثر و بیشتر یہ بھی نہیں دیکھتیں کہ خلق خدا کے تأثرات کیا ہیں، اس خصوصیت کے کچھ منفی اور کچھ مثبت پہلو سامنے آتے ہیں، کہکشاں توحید نے تحریر و تصنیف کو اپنا مقصدِ حیات بنالیا ہے، چلتے پھرتے جو مشاہدہ اور تجربہ انہیں حاصل ہوتا ہے، وہ اسے کہانی کے روپ میں پیش کر دیتی ہیں، اگر فنکار کے پاس چشم بینا ہو تو قصے، کہانیاں ہر طرف بکھرے ہوئے رہتے ہیں، کہکشاں انہیں سمیٹنے کی کوشش کرتی ہیں، راستے چلتے جو واقعہ ان کے سامنے آتا ہے، وہ اسے بعینہ پیش کر دیتی ہیں، چنانچہ کہکشاں کے یہاں طبقۂ اشراف کے کردار بھی ملتے ہیں اور غیر مہذب ناتراشیدہ اور معاشرتی اعتبار سے ناپسندیدہ افراد بھی نظر آجاتے ہیں۔

اس طرح دیکھا جائے تو کہکشاں توحید کے یہاں ہر طرح کے کردار سچے رنگ و

روپ کے ساتھ نظر آجاتے ہیں، لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ فنکار کی ایک ذمہ داری واقعات وواردات، کردار اور قصے کی پیش کش کے دوران انتخاب کی بھی ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ ہر تحریر اور تخلیق کو بامقصد ہونا چاہئے، واقعات وافراد کے ہجوم سے اچھا فنکار عام واقعات اور کرداروں کو منتخب کر کے اپنے تخلیقی تصور کے ساتھ اسے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، تاکہ زندگی کی عکاسی کے ساتھ ساتھ خیر وشر کے امتیاز کی قدریں بھی متعین ہو سکیں۔

کہکشاں توحید ابھی جس منزل میں ہیں، وہاں کسی سنجیدہ فکر ونظر کی توقع کے بجائے ہمیں صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ تحریر وتخلیق کے جذبۂ بے اختیار شوق کے تحت جو افسانے پیش کر رہی ہیں، وہ کہاں تک متنوع معاشرے کی عکاسی کرنے میں کامیاب ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھا جائے تو کہکشاں توحید کے سلسلے میں قارئین کو مایوسی نہیں ہوگی۔

(انتخاب۔۳۳ صفحہ ۹۳ سن اشاعت ۲۰۱۶)
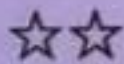
ڈاکٹر احسان اللہ دانشؔ

محمود ایاز ایک شعلۂ مستعجل کی طرح اُردو ادب کے اُفق پر نمودار ہوئے اور ادب کے شیدائیوں کو متحیر کر گئے۔ ''سوغات'' ان کی ایک ایسا کارنامہ ثابت ہوا جس نے جہاں دوسرے بہت سے اہل قلم کو شہرت و عزت بخشی وہاں یہ خود محمود ایاز کی پوری ادبی شخصیت کا آئینہ بن گیا۔ جریدہ سے محمود ایاز کے وسیع تر مطالعہ کی تنویریں بھی سامنے آئیں۔ اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ خود محمود ایاز کی تخلیقی حیثیت ایسی تھی کہ انہیں ان کے ہم عصر بڑے تخلیق کاروں کے مقابلے میں رکھا جائے، لیکن ان کے وسیع مطالعے اور انتقادی تجزیات نے تخلیقی ادب کی پیمائش اور معیار بندی کے جو اصول و نظریات حاصل کر لئے تھے وہ بلاشبہ ہم عصر عہد کے لئے قابل رشک ہیں۔

محمود ایاز اور ''سوغات'' ایک دوسرے کی پہچان تھے۔ رسالے میں شائع ہونے والے خصوصی گوشے آج بھی اہل قلم کے معیاری تنقیدی محاکمے سمجھے جاتے ہیں۔ عزیز احمد، ضمیر الدین، چودھری محمد علی ردودلوی، رفیق حسین، بلونت سنگھ، خالد اختر اور ممتاز شیریں وغیرہ کے سلسلے میں ''سوغات'' کے شماروں میں جس معیار کے مواد حاصل ہو جاتے ہیں وہ کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے۔

''سوغات'' کی افادیت سے اس کی ادبی مباحث سے بھی متعین ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ محمود ایاز نے علمی و ادبی مسائل پر مباحث کے ذریعہ متعدد علمائے ادب کے تصورات و خیالات ادب کے قارئین کے سامنے اس طرح پیش کر دیئے کہ باقاعدہ ملاقات

کے ذریعہ بھی یہ کام نہیں ہوسکتا تھا۔ ان مباحث میں ہم عصر شعری ونثری تخلیقات پر جو بھرپور رائیں ملتی ہیں ان سے نئی دانشوری کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔

محمود ایاز اپنی خودنگر شخصیت اور اپنے عرفان ذات جیسی خوبیوں کی وجہ سے علمی وادبی حلقے کہ بہت سے لوگوں سے مختلف تھے۔ انہیں غالباً خود بھی اپنے مطالعے کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہو پاتا تھا، لیکن مباحث کے دوران اپنی آراء پیش کرتے ہوئے یا کسی موضوع پر اداریہ رقم کرتے ہوئے ان کی یہ خصوصیت ظاہر ہوجاتی تھی۔ ایک ایسی منفرد شخصیت کا تفصیلی مطالعہ بھی آسان نہیں ہوتا۔ چنانچہ آج تک محمود ایاز کے بارے میں باوقار تحریریں کم ہی سامنے آسکی ہیں۔

ڈاکٹر احسان اللہ دانش نے محمود ایاز ان کی شخصیت اور ان کی علمی وادبی امتیازات پر جس نوع کا کام کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج موجودہ علمی انحطاط کے دور میں بھی کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو ادبی وعلمی فریضے کی انجام دہی میں تن دہی اور اخلاص سے کام لیتے ہیں اور معیار واقدار کا خیال رکھتے ہیں۔ اس کتاب کا ایک مشکل اور اہم حصہ وہ ہے جہاں مولف نے محمود ایاز کی شخصیت کے نقوش کی وضاحت ہے۔ محمود ایاز کی اصابت رائے، خود شناسی اور محاکمات میں ان کی قطعیت کی وجہ بہت سے لوگوں کو شخصیت کی تفہیم میں دشواری ہوتی رہی ہے۔ احسان اللہ دانش کی کتاب کے اس حصے میں کئی افراد کا ذکر کیا ہے جو محمود ایاز سے قریب رہ چکے ہیں۔ خاص طور پر شائستہ یوسف کے خیالات اس باب میں نہایت ضروری اور قیمتی سمجھے جاسکتے ہیں۔

احسان اللہ دانش نے ابواب سازی میں بھی اس امر کا خیال رکھا ہے کہ محمود ایاز کے میلان طبع اور ان کے میدانِ کار کے امتیازات سامنے آجائیں۔ ''سوغات'' چونکہ محمود ایاز کا ایک رسالہ تھا، جس کے جملہ شماروں سے ان کے کاموں کا تخمینہ لگایا جا سکتا ہے اس لئے احسان اللہ دانش نے اسی رسالے کو مرکز ومحور بنایا ہے۔ اس طرح اس کے مباحث، اداریوں اور اس میں مشمولہ محمود ایاز کے شذرات کے مطالعات اور تجزیات سے احسان اللہ دانش نے اپنے پروجکٹ میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مولف کی یہ کاوش ادبی حلقے میں ضرور سراہی جائے گی۔ (انتخاب۔ ۳۳ صفحہ ۹۴ سن اشاعت ۲۰۱۶)

طارق متین

طارق متین عہد حاضر کے ان چند شعرا میں ہیں جنہوں نے اپنے منفرد لہجے کے ذریعہ اپنی شناخت مستحکم کی ہے۔ ان کے اظہار و بیان کی سادگی بسا اوقات ہمیں دھوکا دے جاتی ہے اور بادی النظر میں اس سادگی پر عمومیت کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ لیکن فی الواقعی طارق متین کے یہاں اظہار کی سادگی میں وہ کاٹ ہے جس سے میرؔ کی یاد تازہ ہونے لگتی ہے۔

طارق متین کی نیم گفتنی ذہین قاری کی شرکت کی متمنی ہوتی ہے۔ سماعت اور قرأت ان کے اشعار میں معنوی جہتوں کے در وا کرتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ ساری ان کہی سرحدِ ادراک میں سمٹنے لگتی ہے۔ طارق متین تخلیقِ شعر کی محویت میں ان امور سے غافل بھی نہیں ہو جاتے جن سے ہم عصر اجتماعی زندگی کے وقوعے ایک حساس انسان میں ناگواری کے خطوط پیدا کرتے ہیں۔ مسائل و موضوعات ان کے یہاں احساسات و کیفیات کے وسیلے سے بیان ہوتے ہیں اس لئے یہ سارا کچھ ایک لطیف تر (Thinner) انداز میں قاری کے اندرون میں جگہ پانے لگتا ہے۔

''غزالِ درد'' طارق متین کا تازہ ترین مجموعہ ہے اس میں تخلیق کار اپنے فن کی بلندی پر نظر آرہا ہے۔ فنی چابک دستی، جذبوں کی تہہ نشینی اور اسلوب و الفاظ کی اثر انگیزی کے لحاظ سے ''غزالِ درد'' کی غزلیں نئی غزل کے مرتبے کی غماز ہیں۔

(انتخاب۔ ۳۳ صفحہ ۹۶ سن اشاعت ۲۰۱۶ء)
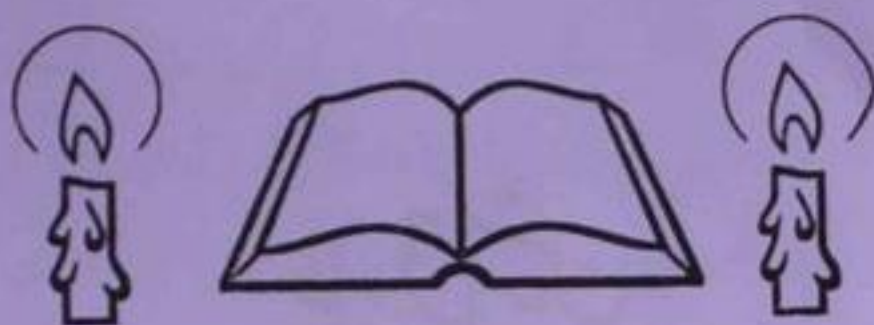
لکھو !

اور
اپنے علم کو اپنے دوستوں کے درمیان پھیلاؤ
اور
جب وقتِ مرگ آئے تو اپنے
بچوں کو
بطورِ میراث سُپرد کرو
کیونکہ
جب فتنہ و آشوب کا زمانہ آتا ہے
تو بجز کتاب
کوئی اور مُونس و دَمساز نہیں ہوتا۔

امام جعفر صادق رضؓ

☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆

☆ عِلم اور عَمل ☆

یاد رکھو
عِلم کے ساتھ عَمل ضروری ہے
نہ عَمل کے بغیر علم نافع ہے اور نہ عِلم کے بغیر
عمل نفع بخش ہے۔
جِس عِلم کی پُشت پر عَمل موجود نہ ہو
وہ عِلم جہل ہی کے زُمرے میں شامِل ہے

حضرت داتا گنج بخشؒ
کشفُ المحَجُوب سے

☆☆☆

BAYAN APNA

Prof. Alimullah Hali

Compiled by

Dr.Abdul Mannan & Dr.Md Ashique Khan

9504276736

ڈاکٹر عبدالمنان کی دیگر کتاب

ا۔ جھارکھنڈ میں اُردو شعروادب کا ارتقا

9931133356

ڈاکٹر محمد عاشق خان کی دیگر کتابیں

ا۔ اُردو تنقید کے فروغ میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی خدمات

۲۔ حریمِ ادب

۳۔ مطالعۂ ادب

۴۔ شعورِ ادب

CATIONAL
SHING HOUSE
phbooks.com